وہ غلبہ جس نے دنیا کو مغلوب کر دیا ہے ہمارا ایمان ہے۔

This is the victory that has overcome the world, even our faith.

CHRISTIANITY

Is The Universal Religion

Allama Barakat Ullah (M.A)

مسیحیت کی عالمگیری

علامہ برکت اللہ

1938

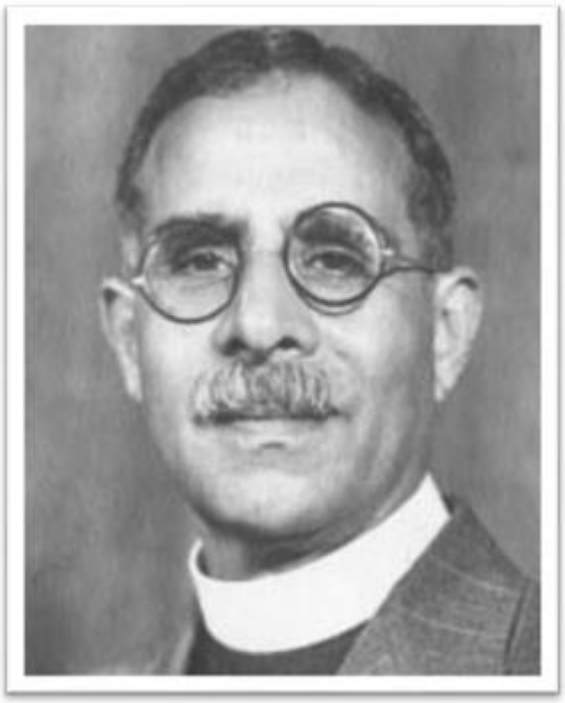

1891-1972

ALLAMA BARAKAT ULLAH, M.A.F.R.A.S

Fellow of the Royal Asiatic Socieity London

تہدیہ

میں اس کتاب کو

علامہ جان عبدالسبحان صاحب بی۔اے۔بی۔ڈی

پروفیسر مدرسہ اسلامیات

کی خدمت میں پیش کرتا ہوں

1938

دعا کا محتاج

برکت اللہ

فہرستِ مضامین

دیباچہ مصنف (پہلا اور دوسرا ایڈیشن)			
(باب اوّل) عالم گیر مذہب کی خصوصیات			
	۱	عالم گیر مذہب کے اُصول اعلیٰ اور ارفع ہوں۔	
	۲	عالم گیر مذہب کے اُصول عالم گیر ہوں۔	
	۳	عالم گیر مذہب کے اُصول جامع ہوں۔	
	۴	عالم گیر مذہب کے اُصول کامل ہوں۔	
	۵	عالم گیر مذہب کے اُصول اقوام عالم کی نشوونما میں مدد ومعاون ہوں۔	
	۶	عالم گیر مذہب کا بانی ایک کامل نمونہ ہو۔	
	۷	عالم گیر مذہب گناہ گار کو گناہ پر غالب آنے کی توفیق دے۔	
	۸	عالم گیر مذہب اور مسیحیت ۔	
(باب دوم) مسیح کلمۃ اللہ			
فصل اوّل۔ مسیحیت کی تعلیم عالم گیر ہے۔			
	۱	خدا محبت ہے۔	
	۲	اہل یہود اور خدا کا تصور۔	
	۳	خدا بنی نوع انسان کا باپ ہے۔	
	۴	انسانی اُخوت ومساوات کے اُصول۔	
	۵	انسانی مساوات کا اُصول۔	
	۶	نفس انسانی کی وقعت واحترام۔	
	۷	بچّوں کی وقعت واحترام۔	
	۸	طبقہ نسواں اور مسیحیت۔	
	۹	ذات پات اور درجہ بندی۔	
	۱۰	مسیحیت اور نئی پیدائش۔	
	۱۱	بیرونی افعال اور مسیحیت۔	
	۱۲	نجات اور ابدی زندگی کا مفہوم۔	
	۱۳	مسیحیت کی تعلیم قابل عمل ہے۔	

	۱۴	مسیحی تعلیم کی جِدّت۔	
	۱۵	مسیحی تعلیم کی ہمہ گیری۔	
	۱۶	مسیحیت اور ادیان عالم کی اصلاح۔	
	۱۷	مسیحیت اور اقوامِ عالم کی ترقی۔	
	۱۸	مسیحی اصول اور فروعات۔	
	۱۹	بائبل مقدس کی عالم گیری۔	
	۲۰	حاصل کلام۔	
فصل دوم۔ مسیحیت جامع مذہب ہے۔			
	۱	مسیحیت اور دیگر مذاہب۔	
	۲	کل مذاہب کے اعلیٰ اصول مسیحیت میں شامل ہیں۔	
	۳	ہندو دھرم کی اصل اور مسیحیت۔	
	۴	اسلام کے اُصول اور مسیحیت۔	
	۵	مسیحیت کی جامعیت۔	
	۶	مسیحیت واحد جہانگیر مذہب ہے۔	
(باب سوم) مسیح ابن اللہ			
فصل اول۔ کلمۃ اللہ بنی نوع انسان کے لئے کامل نمونہ ہیں۔			
	۱	کامل نمونہ کی ضرورت۔	
	۲	مسیحیت کے اُصول سے مسیح کی شخصیت کا تعلق۔	
	۳	مسیح کی انجیلی تصویر صحیح اور تواریخی تصویر ہے۔	
	۴	اسلامی فلسفہ اور انسان کامل کا تصوّر۔	
	۵	کلمۃ اللہ کامل انسان ہے۔	
	۶	خداوند مسیح کی آزمائشیں۔	
	۷	چند غلط فہمیوں کا ازالہ۔	
	۸	ابن اللہ کی عصمت۔	
	۹	مسیح کی عالم گیر اور ہمہ گیر شخصیت۔	
فصل دوم۔ خصوصیات مسیح۔			
	۱	مقام مریم وابن مریم۔	
	۲	مسیح کی خارق عادت پیدائش۔	

	"مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل اٰدم" کا مطلب۔	۳	
	تکلم فی المہد اور مادر زاد نبوت۔	۴	
	کلمۃ اللہ اور روح اللہ کا مفہوم۔	۵	
	وجیہا الدنیا والاخرۃ کی انجیلی تفسیر۔	۶	
	مسیح ابن اللہ۔	۷	
	کلمۃ اللہ خدا کی قدرت اور حکمت۔	۸	
	مسیح ابن آدم۔	۹	
	مسیح خالق باذن اللہ۔	۱۰	
	مسیح مردوں کو زندہ کرنے والا۔	۱۱	
	ابن اللہ مردہ روحوں کو زندہ کرنے والا۔	۱۲	
	حوارئین مسیح صاحب وحی تھے۔	۱۳	
	فصل دوم۔ معجزات مسیح۔		
	مسیح کی صلیبی موت۔	۱	
	ابن اللہ کی ظفریاب قیامت۔	۲	
	مسیح کا رفع آسمانی۔	۳	
	مسیح منصف عادل۔	۴	
	فصل سوم۔ ادعائے مسیح۔		
	مسیح اور انبیا کی قطار۔	۱	
	مسیح اور علم غیب۔	۲	
	انبیا کی رسالت کا مقصد۔	۳	
	معجزات مسیح۔	۴	
	ادعائے مسیح اور اناجیل اربعہ۔	۵	
	ادعائے مسیح اور حوارئین کی تحریرات۔	۶	
	مسیح نوع انسانی کا درمیانی۔	۷	
	مسیح مظہر خدا۔	۸	
	کلام مجسم ہوا۔	۹	
	(باب چہارم) مسیح منجی جہاں۔		
	اُصول اور احکام نجات نہیں دے سکتے۔	۱	

	۲	گناہ کے عمل اور گناہ گار عامل میں امتیاز۔	
	۳	خدا کی محبت اور گناہوں کی مغفرت۔	
	۴	مسیحی تجربہ کی حقیقت۔	

پہلے ایڈیشن کا دیباچہ

آفتاب آمد دلیل آفتاب

گرو لیلت باید ازروے رو مہتاب

مسیحیت کی قطعیت[1] اور عالم گیری ایک ایسی روشن حقیقت ہے کہ کوئی شخص جس نے تعصب کی پٹی عقل کی آنکھ پر نہیں باندھ لی، اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ایک تواریخی واقعہ ہے کہ گزشتہ دو ہزار سال سے روئے زمین کے ممالک واقوام کے کروڑوں افراد مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں اور مسیحیت نے ان کو قعرِ ضلالت (قعر: گہرائی۔ بڑا گڑھا) سے نکال کر روحانیت کے اَوج (عروج) پر پہنچا دیا ہے۔ ہم کو یہ ماننے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بعض اصحاب ایسے ہیں جو خلوصِ دل سے یہ خیال کرتے ہیں کہ مسیحیت میں چند ایک باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ عالم گیر مذہب نہیں ہو سکتا۔ پس

اگر بینم کہ نابینا وچاہ است

وگر خاموش نبشینم گناہ است

ایسے اصحاب اور ان کے اعتراضات کو مدِ نظر رکھ کر ہم نے مسیحیت کی قطعیت، جامعیت اور عالم گیری کے موضوع پر کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔

(۱) ہم نے اپنے رسالہ[2] ''نور الہدیٰ'' میں تاریخی نقطۂ نگاہ سے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ علم تاریخ، زمانہ ماضی کے واقعات اور ملل و اسباب (ملل: ملت کی جمع۔ اقوام۔ مذاہب) کا ذکر کر کے یہ بتانا ہے کہ گزشتہ زمانہ سے موجودہ دَور کس طرح صفحہ ہستی پر آیا اور مسیحی اصول نے اس کی کایا پلٹ میں کیا کردار ادا کیا۔ ہم نے اس کتاب میں اس مقصد کو ثابت کیا ہے کہ ابتدا ہی سے مسیحیت اپنے اُصول اور کلمۃ اللہ کی شخصیت اور نجات کے تصور کی وجہ سے تمام مروجہ ادیان پر غالب آئی اور اس نے اپنے عالم گیر ہونے کا ثبوت دیا۔ اس کتاب میں مرحوم خواجہ کمال الدین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

(۲) ہم نے اپنی کتاب[3] ''دین فطرت اسلام یا مسیحیت'' میں اس موضوع پر علم نفسیات کے نقطہ نظر سے ثابت کیا ہے کہ صرف مسیحیت میں ہی اس بات کی صلاحیت ہے کہ انسانی فطرت کے میلانات کی تمام اقتضاؤں کو بوجہ احسن پورا کر کے عالم گیر مذہب ہونے کا ثبوت دے۔

(۳) ہم نے اپنی کتاب ''کلمۃ اللہ کی تعلیم'' میں ان اصولوں پر مفصل بحث کی ہے جو انجیل جلیل کی بنیاد ہیں اور ثابت کیا ہے کہ خداوند عیسیٰ مسیح کی تعلیم اور شخصیت جامع اور عالم گیر ہے اور آپ کی قدوس ذات نے دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔

---

[1] ۔ ''قطعیات'' عربی اسم مونث ہے۔ یہ قطعیت کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں ''وہ امور جن میں شک وشبہ نہ ہو''۔

[2] ۔ یہ کتاب پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور سے مل سکتی ہے۔

[3] ۔ یہ کتاب پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور سے مل سکتی ہے۔

(۴)ہم نے اپنی کتب ''قدامت واصلیت اناجیل اربعہ''اور ''صحت کتب مقدسہ''میں تاریخی اور لسانی نقطہ نظر سے ثابت کیا ہے کہ جہاں تک انجیل جلیل کے یونانی متن کی صحت کا تعلق ہے، روئے زمین کی کوئی قدیم کتاب انجیل کی صحت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

(۵)ہم نے اپنی کتاب ''اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی''میں معترضین کے ایک اعتراض پر غور کیا ہے جو وہ خداوند مسیح کے اس قول کی بناپر کرتے ہیں کہ ''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوااَور کسی طرف نہیں بھیجا گیا''(متی ۱۵:۲۴)اور ثابت کر دیا ہے کہ جو تاویل معترض اس آیہ شریف کی کرتا ہے، وہ صحیح اصول تفسیر تاویل الکلام ''بمالا یرضی بہ قائلہ باطل''کے خلاف ہے۔ پس وہ باطل ہے، کیونکہ وہ خداوند عیسیٰ مسیح کے خیالات وجذبات، لائحہ عمل اور احکام کے کلیۃً خلاف ہے اور خداوند عیسیٰ مسیح کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ اقوامِ عالم آپ کے وسیلہ نجات حاصل کریں۔ اس کتاب میں جو ناظرین کے سامنے ہے، مسیحیت کی عالم گیری پر علم اخلاقیات اور فلسفہ کے نقطہ نگاہ سے نظر کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کلمۃ اللہ کی تعلیم ارفع اور جامع اصول پر مشتمل ہے۔ خداوند عیسیٰ مسیح کا نمونہ کامل اور اکمل ہے اور آپ کی نجات کل دنیا کی اقوام کے لیے ہے۔ اس کتاب میں ہم نے باب سوم میں دیدہ ودانستہ ان اعتراضات کو نظر انداز کر دیا ہے جو عموماً انجیل شریف کی آیات کی بناپر عصمتِ مسیح پر کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ مسیحی متکلمین نے عموماً اور امام المناظرین مسٹر اکبر مسیح صاحب مرحوم نے خصوصاً اپنی کتاب ''ضربتِ عیسوی''میں ان اعتراضات کے دنداں شکن جواب دیئے ہیں جن کا جواب الجواب تاحال نہیں دیا گیا۔ پس ان اعتراضات کو رد کرنا، درحقیقت تحصیل حاصل ہے۔ لہٰذا ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

پس ہم نے مسیحیت کی عالم گیری پر اپنی مختلف کتابوں میں تاریخی، مذہبی، نفسیاتی اور اخلاقی پہلوؤں سے بحث کی ہے اور ان معترضین پر اتمام حجت کر دی ہے جو نیک نیتی سے مسیحیت کی قطعیت اور عالم گیری نہیں مانتے تھے۔ ہمیں واثق اُمید ہے کہ ایسے معترضین خالی الذہن ہو کر اس کتاب کا غور سے مطالعہ کریں گے اور مصنف کی طرح خداوند مسیح کے قدموں میں آکر ابدی نجات حاصل کریں گے۔

سپاس وسنت وعزت خدائے راکہ نمود

رہ نجات و شدم از حیات بر خوردار

ہولی ٹرنٹی چرچ لاہور احقر

علامہ برکت اللہ (مرحوم)

۱۶ اگست ۱۹۴۸ء

باب اوّل

عالم گیر مذہب کی خصوصیات

ا۔عالم گیر مذہب کے اصول اعلیٰ ترین پایہ کے ہیں

انگلستان کا مشہور فلاسفر اور اخلاقیات کا استاد مرحوم ڈاکٹر ریشڈال(Rashdall) کہتا ہے کہ :

''عالم گیر مذہب کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ اس میں خدا کا تصور اعلیٰ ترین ہو، جس کو سب لوگوں کی ضمیریں مان سکیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا اخلاقی نصب العین اعلیٰ ترین ہو''1۔

پس عالم گیر مذہب کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے اُصول بلند، عالی وارفع اور اعلیٰ ترین ہوں۔ان اصولوں میں یہ صفت ہو کہ دنیا کے'' سب لوگوں کی ضمیریں''ان کو مان سکیں۔ بالفاظ دیگر یہ اصول ایسے اعلیٰ اور ارفع ہوں کہ تمام دنیا کے لوگ بلا لحاظ رنگ و نسل وغیرہ ان کو قبول کر سکیں۔اگر کسی مذہب کی تعلیم ایسی ہے کہ صرف کسی خاص قوم یا زمانہ یا قبیلہ کے لوگوں کی نظروں میں ہی مقبول ہو سکتی ہے، لیکن دیگر اقوام یا دیگر زمانہ کے افراد اس کے اصولوں کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کر سکتے تو وہ مذہب ہر گز عالم گیر مذہب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو خدا کی نسبت ایسی تعلیم دے جو نوع انسانی کی ترقی کی ابتدائی منازل سے ہی متعلق ہو اور نوع انسانی تہذیب یافتہ ہو کر اس منزل سے آگے بڑھ گئی ہو ایسا کہ وہ اس کے پیش کردہ تصور الٰہی کی نکتہ چینی کر سکے تو وہ مذہب عالم گیر نہیں ہو سکتا۔۔ مثلاً اگر کسی مذہب کا معبود چوری یا زناکاری کا مرتکب ہوا ہو تو ایسا معبود دور حاضرہ میں ہر گز قابل پرستش نہیں ہو سکتا۔ایسے معبود کی تنظیم نوع انسانی کی ترقی کی ابتدائی منازل سے ہی متعلق تھی، لیکن اب جو نسل انسانی نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ وہ ایسے معبود کی تعظیم و تکریم تو درکنار اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے تو ایسا مذہب عالم گیری نہیں ہو سکتا۔ علیٰ ہذاالقیاس اگر کسی مذہب کی تعلیم میں اس کا اخلاقی نصب العین ادنیٰ پایہ کا ہے تو وہ مذہب اپنے اندر یہ اہلیت نہیں رکھ سکتا کہ عالم گیر ہو سکے۔ چونکہ نوع انسانی اس کے ادنیٰ نصب العین سے بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ لہٰذا وہ ادنیٰ اصولوں کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو انسانوں میں درجہ بندی اور اچھوت کا سبق سکھاتا ہے یا زناکاری، غلامی، لوٹ مار کو درست اور جائز قرار دیتا ہے تو وہ مذہب اپنے اندر یہ اہلیت ہی نہیں رکھتا کہ عالم گیر ہو۔ایسا مذہب صرف ایک خاص زمانہ یا قوم یا قبیلہ ہی کا مذہب ہو سکتا ہے۔اس دائرہ کے باہر کے لوگ اس کی تعلیم کو ناقص قرار دیں گے اور اگر وہ مذہب عالم گیر ہونے کا مدعی ہو تو ارباب دانش کے نزدیک بجا طور پر وہ تحقیر اور مضحکہ کا نشانہ بن جائے گا۔ پس لازم ہے کہ عالم گیر مذہب کے اصول نہایت اعلیٰ ارفع اور بلند پایہ کے ہوں۔ یہ لازم ہے کہ عالم گیر مذہب خدا کی نسبت ایسی تعلیم دے جس کے سامنے ہر زمانہ، ملک اور قوم کی گردنیں جُھک جائیں۔عالم گیر مذہب کا تصور خدا ایسا ہونا چاہیئے کہ نوع انسانی اپنی ترقی کی انتہائی منازل میں بھی اس سے بالا تر تصور خیال میں نہ لا سکے۔انسانی قوت متخیلہ اس سے زیادہ بلند پروازی نہ کر سکے، بلکہ اس تصور کو کماحقہ'(کما۔حَق۔قُ۔ہُو۔بخوبی) فہم میں لانے سے قاصر رہے اور چارو ناچار اپنے عجز اور ناطاقتی کا اقرار کرے۔

---

1 . Theory of Good and Evil, Vol.2 p.29.

اے ز خیال ماوروں۔ در تو خیال کے رَسد
باصفتِ تو عقل را لافِ کمال کے رَسد
کنگرِ کبریائے تو ہست فراز لا مکاں
طائر ماور آں ہوا بے پَروبال کے رسد

(خسرو)

صرف ایسا ہی مذہب انسان کے سامنے بلند ترین اخلاقی نصب العین رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کوئی قوم اپنے معبود کے اوصاف سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جس مذہب میں خدا کا تصور اعلیٰ ترین پایہ کا ہوگا اس مذہب میں انسان کے متعلق بھی اعلیٰ ترین قسم کی تعلیم ہوگی۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں نہایت گہرا رشتہ ہے۔ حقوق العباد کا انحصار خدا کے تصور پر موقوف ہے۔ چنانچہ اگر کسی مذہب میں خدا کا تصور ادنی قسم کا ہے تو اس مذہب میں انسانوں کے باہمی سلوک کی نسبت جو تعلیم ہوگی وہ بھی نہایت ادنی پایہ کی ہوگی۔ اگر کسی قوم کا معبود شرابی، چور یا زناکار ہوگا تو یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ اس مذہب کا اخلاقی نصب العین اعلیٰ قسم کا ہو۔ اس مذہب کی تعلیم میں شراب، چوری، زناکاری وغیرہ اعمال حسنہ شمار کئے جائیں گے۔ لیکن اگر کسی مذہب میں خدا کا تصور اعلیٰ ترین پایہ کا ہوگا تو اس کا اخلاقی نصب العین بھی اعلیٰ پایہ کا ہوگا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اگر کوئی مذہب ایسی باتوں کی تعلیم دیتا ہے جو اخلاق کو سدھارنے کی بجائے ان کو بگاڑتی ہیں یا وہ ایسے اصول سکھاتا ہے جس سے ایسا نتیجہ اخذ ہو سکے جو مخرب اخلاق ہو تو ایسا مذہب دورِ حاضرہ میں مذہب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وہ عالم گیر مذہب ہو۔ مثلاً اگر کوئی مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند کی موجودگی میں کسی اور مرد کے ساتھ جنسی تعلقات رکھ سکتی ہے یا کوئی مرد اپنی زوجہ کی موجودگی میں کسی اور عورت کے ساتھ جنسی تعلقات رکھ سکتا ہے تو ایسا مذہب ہر گز عالم گیر نہیں ہو سکتا۔

عالم گیر مذہب کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف اس میں خدا کا تصور ہی ایسا ہو جس کے سامنے ہر زمانہ، قوم اور ملک کے افراد کی گردنیں جھک جائیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا اخلاقی نصب العین بھی ایسا ہو کہ نوع انسانی اپنی ترقی کی دوڑ میں اس سے آگے نہ گزر سکے۔ بلکہ جوں جوں انسان ترقی کرتا جائے، یہ نصب العین اُفق کی طرح اس کی نظر کے آگے آگے چلتا جائے۔ یا جس طرح کوئی شخص جب ایک پہاڑی کی بلندی پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے آگے بلندی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ ایک اَور پہاڑی کی بلندی اس کو نظر آتی ہے۔ اسی طرح جب نوع انسانی اخلاقی ترقی کے زینہ کی ایک بلندی کو حاصل کر لے تو وہاں بھی اس کو اخلاقی نصب العین کی بلندی نظر آئے جو اس کے لئے راہ نما کا فرض ادا کرے۔ عالم گیر مذہب کا اخلاقی نصب العین ایسا بلند اور ارفع ہونا چاہیے کہ نوع انسانی اپنی ترقی کی مختلف منازل میں جس اَوج پر بھی پہنچے اس کی رفعت اور بلندی کو ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھ سکے۔ پس عالم گیر مذہب کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں ذات الٰہی کی نسبت ایسی تعلیم ہو جس کے سامنے ہر ملک، قوم، نسل اور ہر زمانہ کے سر تسلیم خم ہو جائیں اور اس مذہب کا اخلاقی نصب العین ایسا اعلیٰ اور بلند پایہ کا ہو کہ نوع انسانی اپنی ترقی کے اعلیٰ ترین زینہ پر بھی اس کو پیش نظر رکھ سکے ایسا کہ وہ اس کا دائمی راہ نما ہو۔

۲۔عالم گیر مذہب کے اصول عالم گیر ہوتے ہیں

(۱)

اس پہلی شرط کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عالم گیر مذہب کے اصول عالم گیر ہوں۔ کوئی مذہب عالم گیر کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا جس کے اصول عالم گیر نہ ہوں۔ جس مذہب کے اصولوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ ہر ملک، قوم، زمانہ اور نسل کے لوگوں پر حاوی ہو سکیں، وہ مذہب صرف ایک قوم یا ملک یا زمانہ یا پشت کے لوگوں کے لیے ہی مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے اصول کا اطلاق کسی دوسری قوم یا پشت کے لوگوں پر نہیں ہو سکے گا، کیونکہ قوموں اور پشتوں اور زمانہ کے حالات یکساں نہیں ہوتے۔ معاشرتی حالات، ضروریات زندگی، طریق حکومت وغیرہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ تغیر پذیر ہو جاتے ہیں۔ متعدد قوانین ناقابل عمل ہو کر منسوخ ہو جاتے ہیں۔ پس جو مذہب صرف ایک قسم کے حالات کے لیے مفید ہے، وہ دوسری قسم کے حالات کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ بعض مذاہب ایسے ہیں جو گزشتہ زمانہ میں خاص حالات کے ماتحت نہایت کامیاب ثابت ہوئے، لیکن جب وہ حالات بدل گئے اور زمانہ نے پلٹا کھایا تو وہ مذاہب جامد اور ٹھوس نئے حالات اور خیالات کے سامنے قائم نہ رہ سکے۔ پس مابعد کے زمانہ اور پشت کے لئے وہ مذاہب کسی کام کے نہ رہے۔ جس طرح پرانے سالوں کی جنتریاں بے کار ہو جاتی ہیں۔

بقول شخصے: ع کہ تقویم پارینہ نیاید بکار

اسی طرح یہ مذاہب بھی بے سود ہو جاتے ہیں اور پرانے زمانہ کی داستانوں سے زیادہ قدر و قعت نہیں رکھتے۔ دورِ حاضرہ کے لیے ان کا وجود اگر ضرر رساں نہیں ہوتا تو کم از کم عدم وجود کے برابر ہو جاتا ہے۔ پس لازم ہے کہ عالم گیر مذہب کے اصول ایسے ہوں جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ ہر ملک، قوم، نسل اور زمانہ پر حاوی ہو سکیں اور کسی ملک یا قوم یا زمانہ کے لئے اس مذہب کے اصول دقیانوسی، بوسیدہ یا فرسودہ خیال نہ کئے جائیں۔ مثلاً اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو درجہ بندی یا ذات پات یا مناقشات (مناقشہ کی جمع۔ جھگڑے)، جنگ و جدل، عداوت وغیرہ کی تعلیم دیتا ہے تو یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایک ملک یا قوم کے خاص حالات کے اندر کسی خاص زمانہ میں کامیاب ثابت ہوا ہو۔ لیکن ایسا مذہب دنیا کی دیگر قوموں، نسلوں اور زمانوں کے لئے ہر گز راہ نما کا کام نہیں دے سکتا۔ یا اگر کوئی مذہب ایسا ہے جس میں بچوں، عورتوں، غلاموں، مظلوموں وغیرہ سے بد سلوکی روا رکھی گئی ہے تو ایسے مذہب کے اصول کسی خاص پشت یا زمانہ یا ملک پر ہی حاوی ہو سکتے ہیں۔ ان میں یہ اہلیت ہر گز نہیں کہ اقوام عالم اور کل دنیا کے ممالک و ازمنہ پر حاوی ہوں۔ کوئی مذہب عالم گیر نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ اس کے اصول اپنے اندر اقوام و ممالک پر حاوی ہونے کی صلاحیت نہ رکھیں اور ہر زمانہ میں راست اور ناقابل تنسیخ و ترمیم اور لاتبدیل ہوں اور بنی نوع انسان کے تقاضائے روح اور تمنائے دل کو پورا اور ساکت کر سکیں۔

(۲)

پس لازم ہے کہ عالم گیر مذہب کے اصول نہ صرف زمانہ ماضی کے لئے کسی خاص قوم یا پشت یا ملک یا زمانہ کے صحیح راہ بر رہ چکے ہوں، بلکہ یہ بھی ضروری امر ہے کہ ان اصول کا اطلاق دورِ حاضرہ کے تمام ممالک و قبائل و اقوام پر ہو سکے۔ موجودہ صدی میں اور گزشتہ صدی میں جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ہیں، وہ سب پر عیاں ہیں اور اربابِ دانش سے یہ مخفی نہیں کہ موجودہ پشت مذہب کے اصول کو اس نکتہ نظر سے نہیں دیکھتی جس سے اس کے آباؤاجداد مذہب کو دیکھتے تھے۔ عالم گیر مذہب کے لئے لازم ہے کہ اس کے اصول دورِ حاضرہ کے لوگوں کی اسی طرح کامیابی کے ساتھ راہ نمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جس طرح کسی گزشتہ پشت کے لوگوں کی راہ نمائی کرنے میں وہ کامیاب ہوئے تھے۔ اگر

ان اصولوں میں یہ اہلیت موجود نہیں تو وہ اصول عالم گیر نہیں ہو سکتے اور نہ وہ مذہب عالم گیر کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ پس اگر کوئی مذہب عالم گیر ہونے کا دعویٰ اس بنا پر کرے کہ کسی گزشتہ زمانہ میں وہ کسی ملک یا قوم کے مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کامیاب رہا ہے، لیکن دورِ حاضرہ پر اپنے اصول کا اطلاق نہ کر سکے تو اس مذہب کا دعویٰ "پدرم سلطان بود" (میرا باپ بادشاہ تھا) سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا کوئی مذہب محض اپنی قدامت کی وجہ سے یا کوئی دھرم محض سناتنی (سناتن: قدیم) ہونے کی بنا پر عالم گیر نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ وہ یہ ثابت نہ کر سکے کہ اس کے قدیم یا سناتنی اصول دورِ حاضرہ کے تمام ممالک واقوام کے مختلف مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

(۳)

عالم گیر مذہب کے لئے یہ لازم ہے کہ نہ صرف اس کے اصول زمانہ گزشتہ اور دور حاضرہ کے ممالک واقوام کے راہ نما ہو سکیں، بلکہ مستقبل زمانہ کے تمام ممالک واقوام وازمنہ کے لئے بھی مشعلِ ہدایت ہو سکیں۔ یہ اشد ضروری امر ہے کہ عالم گیر مذہب کے اصول نہ صرف نوع انسانی کی گزشتہ دوڑ میں کام آئے ہوں یا موجودہ ترقی کی منزلوں میں کام آ سکتے ہوں، بلکہ یہ زیادہ ضروری ہے کہ آیندہ زمانہ میں بھی جوں جوں نسل انسانی ترقی کرتی جائے یہ اصول اس کی ترقی کی راہ کو اپنے نور سے روشن کرتے جائیں تاکہ نسل انسانی روز بروز ترقی پذیر ہو کر کامل ہوتی جائے اور خالق کے اس ارادہ کو پورا کر سکے جس کے واسطے خدا نے انسان کو پیدا ہے۔ انسان کا خلق ہونا اور نوع انسانی کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ ازل سے خدا نے کسی خاص مقصد کو مد نظر رکھ کر انسان کو پیدا کیا تھا۔ عالم گیر مذہب کا یہ کام ہے کہ اس منشائے الٰہی کو پورا کرے اور نوع انسانی کو اس کی ترقی کی مختلف منازل میں ایسی شاہراہ پر چلائے جس پر چل کر وہ خدا کے خاص ازلی مقصد کو پورا کرے۔ پس لازم ہے کہ عالم گیر مذہب نہ صرف نوع انسانی کے ابتدائی مرحلوں میں اس کا ساتھ دے اور زمانہ گزشتہ میں اس کا صحیح راہ نما رہا ہو، بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ دورِ حاضرہ میں اور آیندہ زمانوں میں بھی کل انسان اس مذہب کے ذریعہ اپنی نوع کی ترقی کی آخری منزلوں کو طے کر کے خدا کے ازلی ارادہ کو پورا کر سکیں۔ اگر کوئی مذہب نوع انسانی کی مستقل منزلوں میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تو وہ مذہب یقیناً عالم گیر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بالفاظِ دیگر جو مذہب زمانہ ماضی میں ہی نوع انسانی کے کام آیا ہو یا صرف دورِ حاضرہ کے سیاسی یا معاشرتی مسائل کو عارضی طور پر ہی حل کر سکے، لیکن زمانہ مستقبل میں نوع انسانی کی آخری منزلوں میں اس کا ہادی اور راہ نما نہ ہو سکے، وہ مذہب کسی صورت میں عالم گیر مذہب نہیں ہو سکتا۔ ایسا مذہب تاریخ کے صفحوں میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لے گا۔ کیونکہ نوع انسانی کی گزشتہ تواریخ میں وہ کسی زمانہ میں انسان کے کام آیا تھا، لیکن چونکہ وہ آیندہ زمانہ میں انسان کا ساتھ نہیں دے سکتا، کوئی زمانہ ایسا آئے گا جب وہ زندہ مذہب نہیں رہے گا بلکہ مردِ زمانہ کے ساتھ ہی وہ مذہب بھی مردہ ہو جائے گا۔ عالم گیر مذہب صرف وہی مذہب ہو سکتا ہے جس پر نوع انسانی کی بقا کا انحصار ہو اور آیندہ زمانہ میں بھی اس پر بنی نوع انسان کی حیات کا دار و مدار ہو تاکہ کل ممالک واقوام کی آیندہ نسلیں اس کی راہ نمائی کے ماتحت اپنی ہستی کے تمام مراحل کو طے کر کے منشائے الٰہی کو پورا کر سکیں۔

(۴)

اس میں کچھ شک نہیں کہ عالم گیر مذہب کی شناخت کرنے میں نوع انسانی کی گزشتہ تاریخ ہماری مدد اور راہ نمائی کر سکتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی مذہب کا یہ دعویٰ کہ میں عالم گیر ہوں، فی نفسہٖ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ یہ ضروری امر ہے کہ اس کا دعویٰ دلائل و براہین پر مبنی ہو اور اس کی پشت پر زبردست تاریخی شہادت ہو۔ عالم گیر مذہب کے پہچاننے میں قدرتاً یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ مذہب زمانہ گزشتہ میں کسی ملک یا قوم یا قبیلہ کا چراغ ہدایت رہا ہے؟ کیا اس نے کسی خاص زمانہ میں کسی خاص ملک یا قوم کی ایسی کامیابی کے ساتھ راہ بری کی ہے کہ وہ ملک یا قوم چاہِ ضلالت سے نکل کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو گئی؟ کیا اس خاص زمانہ کے بعد بھی وہ مذہب اس ملک یا قوم کی دورِ حاضرہ تک کامیابی سے راہ بری کرتا رہا ہے۔ کیا

اس قوم یاملک کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی آیاجب وہ مذہب اس کی راہ بری نہ کر سکا؟اور اگر کسی زمانہ میں وہ ناکام رہاتواپنے اصول کے سبب سے ناکام رہاہے یاخارجی حالات ہی ایسے پیدا ہوگئے جن کی وجہ سے اس مذہب کاچراغ ٹمٹمانے لگااور اس کی روشنی مدھم پڑ گئی ؟کیادنیا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس مذہب کے اصول اس خاص ملک یاقوم کے علاوہ دیگر ممالک واقوام عالم کے راہ نمارہ چکے ہیں اور دیگراز منہ اور اقوام کے لوگوں پر کامیابی سے حاوی ہو چکے ہیں یانہیں ؟اگرتاریخ یہ بتائے کہ اس کے اصول کااطلاق دیگر اقوام واز منہ اور ممالک پر نہیں ہو سکاتو ظاہر ہے کہ وہ مذہب عالم گیر نہیں ہے۔ لیکن اگرتاریخ یہ بتائے کہ اس کے اصول کااطلاق کسی خاص ملک کے علاوہ دیگر اقوام، ممالک اوراز منہ پر کامیابی سے ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تاریخی شہادت اس کے عالم گیر ہونے کے حق میں ایک نہایت زبردست دلیل ہو گی۔ کیونکہ دنیا کے مختلف ملکوں اور جہان کی مختلف قوموں اور نوع انسانی کی مختلف نسلوں کے لاکھوں اختلافات میں صرف ایک واحد امر یعنی وہ مذہب ہی ایسا ہو گا جو سب میں عام ہے۔ پس ازروئے اصول منطق وہی ایک شے ان مختلف ملکوں، قوموں، گروہوں اور نسلوں کی کامیابی کا سبب متصور ہو گی۔ اگر کوئی مذہب ایسا ہے جس نے زمانہ ماضی میں صدیوں تک دنیا کے بیسیوں ملکوں اور ہزاروں قوموں اور لاکھوں نسلوں کے کروڑوں افراد کی کامیابی کے ساتھ راہ نمائی کی ہے اور اس کے اصول ان پر حاوی رہے ہیں تو یقیناً یہ ثابت ہو جائے گا کہ اس مذہب میں عالم گیر ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ عقل اور قیاس یہی چاہتا ہے کہ جو مذہب زمانہ ماضی میں ایسی شاندار کامیابی حاصل کر چکا ہے اور دورِ حاضرہ میں اقوام عالم کی راہ بری کر رہا ہے، وہ زمانہ مستقبل میں بھی نوع انسانی کی آیندہ نسلوں کو خدا کے ازلی ارادہ کے مطابق ڈھال کر منشائے الٰہی کو پورا کر سکتا ہے۔

۳۔ عالم گیر مذہب کے اصول جامع ہوتے ہیں

چونکہ عالم گیر مذہب کا تعلق کل اقوامِ عالم کے ساتھ ہے اور وہ زمانہ ماضی، دورِ حاضرہ اور زمانہ مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے اصول اعلیٰ ترین اور بلند ترین پایہ کے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری امر ہے کہ عالم گیر مذہب کے اصول مذاہبِ عالم کے اعلیٰ اصول کے جامع ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا کے مذاہب میں صداقت کے عناصر موجود ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا مذہب پیدا نہیں ہوا جو سراسر باطل ہو اور جس میں الف سے لے کری تک کذب ودجل (جھوٹ اور فریب) ہی ہو اور جس میں ذرہ بھر صداقت کا وجود بھی نہ ہو۔ ہر مذہب کسی ایک زمانہ میں کسی ایک قوم یاملک یاپشت کے لوگوں کی کسی حد تک راہ نمائی کرتا رہا ہے۔ جس حد تک وہ کسی قوم کے افراد کی راہ بری کرنے میں کامیاب رہا ہے، اس حد تک وہ اپنے اصول کی وجہ سے کامیاب رہا ہے اور جس حد تک اس کے اصول نے اس کو کامیاب کیا ہے اس حد تک اس کے اصول میں صداقت کا عنصر موجود ہے اور جس حد تک وہ ناکام رہا ہے، اس حد تک اس کے اصول باطل ثابت ہوئے۔ پس ناتمام مذاہبِ عالم میں حتیٰ کہ ان کے مذاہب میں بھی جن کو ہم ''مذاہب باطلہ'' اور ''مشرکانہ مذاہب'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، صداقت کا کوئی نہ کوئی عنصر موجود ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے زمانہ میں کسی حد تک اپنے مقلدوں کی راہ نمائی کر سکے اور کرتے بھی رہے۔ لیکن جس حد تک وہ نہ کر سکے، وہ ناکامل اور غیر مکمل ثابت ہوئے۔ ان میں سے بعض میں بطالت کے عناصر اس قدر زیادہ تھے کہ ان میں حق کی روشنی نہایت مدھم اور خفیف طور سے ہم کو اپنی جھلک کبھی کبھی دکھاتی ہے۔ جو شخص تاریخ مذہب کو تعصب کے بغیر بنظرِ غور مطالعہ کرتا ہے، اس کو یہ مدھم سے مدھم جھلک ضرور نظر آجاتی ہے۔ ان مذاہب کے غیر مکمل اور ناکامل ہونے میں کسی صاحبِ ہوش کو شک نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے یہ کافی دلیل ہے کہ وہ مذاہب نوع انسانی کی ترقی کے بوجھ کے حامل نہ ہو سکے۔ ان میں صداقت کے عناصر اس قدر کمزور تھے کہ ان کے نازک کندھے اس بار گراں کو اٹھا نہ سکے۔

نوعِ انسانی ترقی کر کے بہت آگے نکل گئی اور ان مذاہب کو دقیانوسی، فرسودہ اور بوسیدہ سمجھ کر اپنی ترقی کی خاطر ان سے زیادہ کامل مذاہب کی تلاش کرنے میں سرگرداں رہی، جن میں صداقت کے زیادہ عناصر موجود تھے۔ یہ مذاہب بھی کچھ زمانہ تک نوع انسانی کے کام آئے،

لیکن پھر ایک وقت آیا جب نوع انسانی شاہراہِ ترقی کی ایسی منزل پر پہنچی جہاں یہ مذاہب بھی اس کو غیر مکمل اور دقیانوسی نظر آنے لگے اور وہ ان سے بھی زیادہ کامل مذہب کی جستجو اور تلاش میں مشغول ہو گئی۔ یوں ہر مذہب صداقت کے ان عناصر کی وجہ سے جو وہ اپنے اندر رکھتا تھا، نوع انسانی کی ترقی کی مختلف منازل میں اس کے کام آتا رہا۔

عالم گیر مذہب کے لئے لازم ہے کہ وہ ان غیر مکمل مذاہب کی صداقتوں کے عناصر کا جامع ہو اور جو صداقتیں کسی ادنی سے ادنی مذہب میں موجود ہوں (اور جنہوں نے انسانی ترقی میں مدد دی ہے۔ وہ سب کی سب اعلیٰ ترین حالت میں عالم گیر مذہب میں موجود ہوں)۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف ممالک کے مذاہب مختلف صداقتوں پر زور دیتے رہے ہیں۔ ہر مذہب اپنی قوم اور ملک کی ضروریات کے مطابق احکام جاری کرتا رہا ہے۔ مثلاً جاپان میں شنتومت مذہب ایک قسم کی صداقت کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے۔ چین کا مذہب دوسری قسم کے عناصر پر زور دیتا ہے۔ اگر ہندو مذہب کے اندر دوسری قسم کے عناصر صداقت موجود ہیں۔ عرب کے مذہب کے اندر دوسری قسم کے عناصر صداقت موجود ہیں جو زرتشت مذہب کے عناصرِ صداقت سے مختلف ہیں۔ پس لازم ہے کہ عالم گیر مذہب ان تمام صداقتوں کا مجموعہ ہو اور دنیا کے کسی مذہب کی کوئی صداقت بھی اس مذہب سے خارج نہ ہو، بلکہ ہر مذہب کی صداقت کے عناصر صرف اپنی اعلیٰ ترین شکل میں اس عالم گیر مذہب میں موجود ہوں۔ مثلاً چین کا مذہب خاندان کی پاکیزگی کی صداقت پر زور دیتا ہے۔ لازم ہے کہ عالم گیر مذہب نہ صرف خاندانی پاکیزگی کی تعلیم دے، بلکہ یہ صداقت اس میں بدرجہ احسن پائی جائے۔ عرب کا مذہب اللہ کی وحدانیت، عظمت اور برتری پر زور دیتا ہے۔ پس لازم ہے کہ عالم گیر مذہب نہ صرف خدا کی عظمت و وحدانیت کی تعلیم دے، بلکہ اس میں یہ صداقت اپنی اعلیٰ ترین حالت میں پائی جائے۔ ہندو مذہب کے ہمہ اوستی نظریہ میں یہ صداقت پائی جاتی ہے کہ پرماتما ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ لہٰذا ضرور ہے کہ عالم گیر مذہب میں خدا کے ہر جا حاضر و ناظر ہونے کی تعلیم اس کی پاک ترین شکل میں پائی جائے۔ پس یہ واحد عالم گیر مذہب، مذاہبِ عالم کی صداقتوں کا جامع ہونا چاہئے اور یہ صداقتیں جو مختلف مذاہب میں ٹمٹماتی روشنی کی طرح موجود ہیں، عالم گیر مذہب میں بدرجہ احسن پائی جائیں اور آفتاب نصف النہار کی طرح چمکیں تاکہ نوع انسانی ان کی روشنی میں از ابتدا تا انتہا ترقی کی تمام منازل کو طے کر سکے۔

۴۔ عالم گیر مذہب کے اصول کامل ہوتے ہیں

ہم نے سطور بالا میں یہ ذکر کیا ہے کہ دنیا کے مذاہبِ باطلہ میں بھی صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی روشنی ان کے باطل عناصر کی وجہ سے امتداد (طوالت۔ مدت) زمانہ کے ساتھ نہایت دھیمی اور مدھم پڑ جاتی ہے۔ پس جہاں یہ ضروری امر ہے کہ عالم گیر مذہب میں تمام صداقت کے عناصر پائے جائیں، وہاں یہ بھی اشد ضروری ہے کہ وہ ان مذاہبِ باطلہ کے باطل عناصر سے بالکل پاک ہو۔ ہم سطور بالا میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ مذاہب باطلہ اپنے باطل عناصر کی وجہ ہی سے نوعِ انسانی کو ترقی کی شاہراہ پر چلانے میں ناکام رہے ہیں۔ جب نوع انسانی نے ایک مرحلہ طے کر لیا تو اس کو ان مذاہب کے غیر مکمل اور کج اخلاق باطل پہلو نظر آنے لگے، جن کی وجہ سے وہ آگے ترقی کرنے سے رک گئی۔ پس وہ ایسے مذاہب کی تلاش کرنے لگی جن میں صداقت کے عناصر زیادہ اور غیر مکمل عناصر کم ہوں، جن کی روشنی میں وہ اگلی منزل طے کر سکے۔ کسی مذہب کی ناکامی اس کے باطل اور غیر مکمل عناصر کی وجہ سے ہے۔ پس جس مذہب میں باطل اور نامکمل عناصر ہوں گے، وہ مذہب عالم گیر نہیں ہو سکتا۔ اس کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آئے گا جب نوع انسانی اس مذہب کی اخلاقیات کے نصب العین سے کہیں زیادہ ترقی کر جائے گی اور اس کی نکتہ چینی کر کے اس میں باطل عناصر کو تشت از بام (ظاہر۔ رسوا) کر دے گی اور اس مذہب کو غیر مکمل قرار دے دے گی اور ایک ایسے مذہب کی تلاش اور جستجو کرے گی جس کی کامل اخلاقیات اور اخلاق فاضلہ کو وہ اپنا نصب العین بنا سکے۔ مثلاً اگر کسی مذہب میں اوہام اور باطل پرستی کے عناصر

موجود ہیں تو اس کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب لوگ علم کی روشنی کی وجہ سے ان اوہام سے نجات حاصل کر کے اس مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور اس سے بہتر مذہب کی جستجو کرنے لگ جاتے ہیں۔ جوں جوں علم ترقی کرتا جاتا ہے اور لوگوں کی عقل اس کے نور سے منور ہو جاتی ہے، ان پر مذہب کے غیر مکمل پہلو روشن ہوتے جاتے ہیں اور وہ ایک ایسے مذہب کو تلاش کرتے ہیں جس میں تاریکی کا سایہ تک نہ ہو۔ عالم گیر مذہب کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اخلاقیات غیر مکمل نہ ہوں، بلکہ ایسی کامل، بلند اور اعلیٰ ہوں کہ انسانی فہم اور ادراک کسی مستقبل زمانہ میں بھی ان کو غیر مکمل قرار نہ دے سکے۔ بلکہ اس کے برعکس نوعِ انسانی اپنی ترقی کی ہر منزل پر اس کامل اور اکمل مذہب کے نصب العین کو برابر پیش نظر رکھ کر اپنے وجود کی علتِ غائی کو پورا کر سکے۔

۵۔ عالم گیر مذہب کے اصول اقوام کی نشو و نما میں مدد و معاون ہوتے ہیں

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ہر قوم کی طرزِ رہائش اور معاشرت دوسری قوم سے الگ ہے۔ ان کے خیالات، جذبات، اعتقادات، رسمیات وغیرہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہر قوم اپنے وجود کا اظہار اپنے خصوصی طرز سے کرتی ہے ۔ مثلاً افریقہ کے وحشی اور نیم مہذب قبائل کی زندگی اور عرب کے تمدن اور جاپان کے طرزِ معاشرت اور ہندوستان کے باشندوں کی طرزِ زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ عرب کے باشندے اپنے وجود کا اظہار ایسے طریقہ سے کرتے ہیں جو انہی سے نمایاں مخصوص ہے اور یہ وہ طریقہ نہیں ہے جس سے جرمنی کی قوم اپنے وجود کا اظہار کرتی ہے۔ اس لحاظ سے قوم قوم میں فرقِ عظیم ہے اور یہ خالق کے منشا کے عین مطابق بھی ہے۔ خدا نے نظام عالم کو اس طور پر قائم کیا ہے کہ اس کے ہر ایک حصہ کا کام دوسرے حصے کے کام سے جداگانہ ہے۔ جس طرح جسم کے مختلف اعضا میں ہر ایک عضو کے سپرد جداگانہ کام ہے اور جس طرح ایک ہی سوسائٹی میں مختلف افراد ہیں اور خدا نے ہر ایک فرد کے سپرد جداگانہ کام ہے۔ بقول شخصے:

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

اسی طرح نوع انسانی میں مختلف اقوام شامل ہیں اور ہر قوم اپنی ہستی کا اظہار جداگانہ طور پر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح ہمارے جسم کے اعضا ان کاموں کو جو ان کے سپرد ہیں سرانجام دے کر بدن کو مضبوط اور طاقت ور بناتے ہیں اور جس طرح ایک سوسائٹی کے افراد اپنے اپنے فرائض منصبی کو سرانجام دے کر اس سوسائٹی کی طاقت کا باعث ہوتے ہیں، اسی طرح کل دنیا کی قومیں اپنے اپنے جداگانہ خصوصی طرز کے مطابق اپنے اپنے وجود کا اظہار کر کے نوع انسانی کو تقویت دیتی ہیں اور اس کی ترقی کا باعث ہوتی ہیں کیونکہ:

ع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

عالم گیر مذہب کا یہ کام ہے کہ وہ ہر ایک قوم کی نشو و نما میں ایسے طور سے مدد کرے کہ اس قوم کی خصوصیات زائل نہ ہوں، بلکہ اس کے برعکس ہر قوم اس عالم گیر مذہب کے ذریعہ ترقی کر کے اپنے خاص طریقہ معاشرت و تمدن وغیرہ کا یوں اظہار کر سکے کہ نوع انسانی ترقی اور تقویت حاصل کرے۔ جس طرح ہمارے جسم کے قوانین ایسے ہیں کہ وہ ہمارے ایک ایک عضو کو اس کا جداگانہ فرض پورا کرنے میں مدد و معاون ہوتے ہیں تاکہ ہمارا تمام جسم طاقت پکڑے اور اسی طرح سوسائٹی کے قوانین ایسے ہونے چاہیں کہ وہ ایک ایک فرد کی ترقی اور شخصیت کے اظہار میں مدد و معاون ہوں۔ اسی طرح عالم گیر مذہب کے اصول ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ دنیا کی ایک ایک قوم کی ترقی اور اس کی ہستی کے اظہار میں مدد و معاون ہوں۔ اگر ہم اپنے جسم کے اعضا پر ایسا جبر کر سکیں کہ ہر ایک عضو صرف ایک ہی قسم کا کام کرے تو یہ ایک ناممکن بات ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی سوسائٹی اپنے افراد پر جبر روا رکھ کر ہر ایک فرد کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا چاہے تو یہ ایک غیر فطرتی حرکت ہو گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر

کوئی مذہب اقوام عالم کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے تو یہ ایک غیر فطرتی بات ہو گی۔ کیونکہ خدا نے جس طرح ہر ایک فرد کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، اسی طرح اس نے ہر ایک قوم کو مختلف نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ چنانچہ حضرت ذوق فرماتے ہیں:

ع اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

جو مذہب دنیا کی مختلف قوموں کی قابلیتوں اور نعمتوں کے اختلافات کو مٹا کر ان کی طرزِ رہائش و معاشرت، ان کی اقتصادی، مجلسی، تمدنی، سیاسی زندگی کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے یا ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ وہ مذہب منشائے الٰہی کے خلاف چلتا ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا پورا نہیں کرتا۔ وہ ہر گز اس لائق نہیں ہو سکتا کہ عالم گیر مذہب کہلانے کا مستحق ہو۔ اس کے برعکس عالم گیر مذہب کی یہ کوشش ہو گی کہ ہر ایک قوم اپنی جداگانہ طرزِ رہائش، طریق معاشرت اور مختلف آداب تمدن کے ذریعہ اپنی ہستی کا اظہار خالق کے اس ازلی ارادہ کے مطابق کرے جس کے لئے رب العالمین نے اس قوم کو پیدا کیا ہے۔ عالم گیر مذہب ہر ایک قوم کی قومی نشو و نما میں خلل انداز ہونے کی بجائے اس کو خصوصی قابلیتوں کو ترقی دیتا ہے، تاکہ اقوامِ عالم اپنی اپنی جداگانہ قومی نشو و نما کے ذریعہ نوع انسانی کی قوت اور تقویت کا باعث ہوں اور نوع انسانی شاہراہِ ترقی کی تمام منزلوں کو طے کر کے اس نصب العین کو حاصل کر سکے جس کے واسطے خدا نے نوع انسانی کو پیدا کیا ہے۔

۶۔ عالم گیر مذہب کا بانی ایک کامل نمونہ ہونا چاہیے

سطور بالا میں ہم نے عالم گیر مذہب کے صرف اصول کا ہی ذکر کیا ہے کہ وہ کس قسم کے ہونے چاہئیں۔ لیکن مجرد اصول خواہ وہ کیسے ہی ارفع و اعلیٰ اور افضل کیوں نہ ہوں۔ اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتے کہ کسی شخص یا جماعت یا قوم میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ پس عالم گیر مذہب کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ اس کے اصول اعلیٰ وارفع، جامع اور کامل ہوں، بلکہ یہ بھی اشد ضروری ہے کہ اس میں ایک کامل نمونہ بھی موجود ہو، جس کی شخصیت اور زندگی میں وہ اعلیٰ اور افضل اصول پائے جائیں۔ والدین اور استاد اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اصول کی تلقین سے نیک نمونہ دکھانا بہتر اور زیادہ موثر ہوتا ہے۔ اگر بچوں کو نیک اصول کی جانب راغب کرنا ہو تو ہم ان کو صرف نیک اصول رٹانے سے ہی راغب نہیں کر سکتے، بلکہ نیک اصول کو خود اپنی عملی زندگی میں دکھا کر ان کو متاثر کر سکتے ہیں۔ قابل والدین اور لائق استاد وہی ہوتے ہیں جو خود اپنے خیالات و جذبات اور اعمال و افعال کے ذریعہ اپنے بچوں کو نیک اصول پر چلنے کی ترغیب اور نمونہ دونوں دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگیوں کو ہمیشہ کے لئے متاثر کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے نمونہ سے ان کو نیک اصول کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر والدین یا استاد اپنے بچوں کو صرف نیک اصول رٹانے پر ہی قناعت کریں، لیکن ان کے سامنے اپنی زندگی کے ذریعہ ان نیک اصول کا نمونہ بن کر نہ دکھائیں تو بچوں کی زندگیوں پر رتی بھر بھی اثر نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات ان پر الٹا اثر پڑتا ہے۔ والدین اور استاد تجربہ سے جانتے ہیں کہ بچے طبعاً نقال ہوتے ہیں اور وہی کام کرتے ہیں جو وہ دوسروں کو کرتے دیکھتے ہیں۔ پس ان کو مکمل نمونہ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کہ اعلیٰ اور افضل اصول رٹنے کی۔ اگر والدین یا استاد ان کو صرف نیک اصول کی تلقین کریں۔ مثلاً شراب خوری اور چوری سے منع کریں، لیکن خود مے خور ہوں تو بچے مے خواری سے کبھی پرہیز نہ کریں گے، بلکہ ان کی وہی عادتیں ہوں گی جن کا نمونہ ان کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر والدین نہ صرف ان کو نیک اصول کی تلقین کریں بلکہ اپنے افعال کے ذریعہ ان نیک اصولوں کا نمونہ بھی اپنے بچوں کے سامنے پیش کریں تو بچے ان نیک اصولوں کی جانب راغب ہوں گے اور ان کی زندگی نیک اصولوں اور نیک نمونہ دونوں کے ذریعہ متاثر بھی ہو گی۔ اسی لئے قرآن مجید میں آیا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ "یعنی اے ایمان والو وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم خود نہیں کرتے (سورۂ صف آیت ۲)۔

پس نہایت ضروری ہے کہ عالم گیر مذہب بنی نوع انسان کے سامنے نہ صرف اعلیٰ اور ارفع اصول پیش کرے، بلکہ ایک کامل اور اکمل نمونہ بھی پیش کرے۔ جہاں یہ لازم ہے کہ عالم گیر مذہب کے اعلیٰ ترین اور افضل ترین اصول ہوں جو اقوام عالم پر حاوی ہو سکتے ہوں، وہاں یہ بھی لازم ہے کہ عالم گیر مذہب بنی نوع انسان کے سامنے ایک ایسا عالم گیر نمونہ بھی پیش کرے۔ جس کی شخصیت میں وہ اعلیٰ اور ارفع اصول مجسم اور موجود ہوں اور جس کی دل آویز ذات وصفات تمام اقوامِ عالم کا نصب العین اور مطمع نظر ہو سکے، جس طرح عالم گیر مذہب کے اصول ہونے چاہئیں کے سب لوگوں کی ضمیریں ان کو مان سکیں۔ اسی طرح اس میں ایک ایسا عالم گیر نمونہ بھی ہونا چاہئے جس کے سامنے تمام دنیا بلا لحاظ رنگ، نسل، قوم اور ملک سر تسلیم خم کر دے۔ عالم گیر مذہب میں نہ صرف عالم گیر اصول ہونے چاہئے بلکہ اس میں ایک ایسا عالم گیر نمونہ بھی ہونا چاہیئے جس نے زمانہ ماضی میں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو تبدیل کر دیا ہو اور دورِ حاضرہ میں وہ اقوام عالم کو کمالیت کے اوج کی طرف لے جاتا ہو اور زمانہ مستقبل میں اپنے کامل نمونہ کے نور سے نوع انسانی کی راہ کو روشن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۷۔ گناہ پر غالب آنے کی توفیق

عالم گیر مذہب کے لئے سب سے بڑی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کو گناہ اور بدی پر غالب آنے کی توفیق دے۔ عالم گیر مذہب کے لئے نہ صرف یہ لازم ہے کہ وہ اعلیٰ اور افضل اصول اور اخلاق حسنہ کی تعلیم دے اور ایک کامل نمونہ نوع انسانی کے پیش نظر رکھے، بلکہ یہ بھی اشد ضروری ہے کہ وہ انسان کو یہ توفیق عطا کرے کہ وہ گناہ اور بدی کو مغلوب کر سکے۔ خواہ وہ اس کے اندر ہو یا اس کے ماحول میں ہو۔ ہم نے سطور بالا میں یہ ذکر کیا ہے کہ مجرد اصول خواہ وہ کتنے ہی بلند پایہ کے ہوں، اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتے کہ انسان میں ان پر چلنے کی ترغیب پیدا ہو۔ لازم ہے کہ ایک کامل اور نمونہ بھی ہو جو ان نیک اور اعلیٰ اصولوں پر خود چل کر دوسروں کو تحریص و ترغیب دے سکے کہ وہ اس کے نقش قدم پر چلیں۔ لیکن جو لوگ گناہ کے غلام ہو کر بدی کے ہاتھوں بک چکے ہیں، وہ اعلیٰ اصول اور کامل نمونہ کی تعریف و توصیف میں رطب للسان تو ضرور ہوں گے، لیکن وہ خود گناہوں کی زنجیر میں ایسے جکڑے ہوتے ہیں اور ان کی قوتِ ارادی اس قدرت سلب ہو جاتی ہے کہ نہ تو مجرد اصول اور نہ کامل نمونہ ان کو اس بات پر آمادہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنے نفس امارہ کا مقابلہ کریں اور اپنی بدعادتوں کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکیں۔ بقول شخصے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد
پر طبعیت اِدھر نہیں آتی

مقدس پولس رسول کی طرح ان کی رات دن چیخ و پکار یہی ہوتی ہے کہ ہائے میں گناہ کے ہاتھ بکا ہوا ہوں جس نیک اصول پر عمل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں وہ میں نہیں کرتا، لیکن جس بدی سے مجھے نفرت ہے میں وہی کرتا ہوں۔ مجھ میں کوئی نیکی موجود نہیں۔ البتہ نیکی کرنے کی خواہش مجھ میں موجود ہے، مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتا۔ چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اسے خود بخود بغیر شعوری ارادہ اور کوشش کے کر لیتا ہوں اور جب نیکی کا ارادہ کرتا ہوں بدی میرے پاس آموجود ہوتی ہے۔ ہائے میں کیسا کم بخت آدمی ہوں، اس گناہ کی قید سے مجھے کون چھڑائے گا؟ (رومیوں ۷: ۱۴۔ ۲۴)۔

عالم گیر مذہب کا کام ہے کہ ایسے شخص کو گناہ پر غالب آنے کی توفیق عطا کر کے اس کو بدی کی قید سے چھڑائے۔ اس کی قوتِ ارادی میں جو سلب ہو گئی ہے، دوبارہ جان ڈالے اور اپنے مسیحائی دم سے اس مردہ کو از سرِ نو زندہ کر دے۔ عالم گیر مذہب کا یہ کام ہے کہ گناہ گار شخص کے لئے ایسے مرغبات (مرغوبات: پسندیدہ چیزیں) اور محرکات مہیا اور پیدا کرے کہ اس کی مردہ قوتِ ارادی تقویت حاصل کر کے از سرِ نو مضبوط اور طاقت ور ہو کر آزمائش کے وقت ان مرغبات اور محرکات سے مدد پا کر کامل نمونہ کی طرف نظر کر کے گناہ اور بدی سے مردانہ وار مقابلہ کر سکے اور ان پر

غالب آکر اعلیٰ اور افضل اصول پر عمل کر سکے۔ اگر کسی مذہب میں یہ طاقت نہیں کہ وہ گناہ گار کو گناہ پر غالب آنے کی توفیق دے سکے تو ایسا مذہب ہر گز عالم گیر نہیں ہو سکتا۔ جس مذہب میں صرف اعلیٰ اصول ہی ہیں، وہ صرف اخلاقیات کا مجموعہ ہی ہوتا ہے اور وہ ایسے لوگوں کے لئے ہی موزوں ہو سکتا ہے جن کی قوتِ ارادی ایسی زبردست ہوتی ہے کہ شیطان کا مقابلہ کر کے اس کو پچھاڑ لیں۔ وہ تندرست آدمیوں کی مانند ہیں، جن کو طبیب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس دنیا میں چراغ لے کر ڈھونڈو آپ کو ایک کروڑ انسانوں میں بصد مشکل ایک ایسا شخص ملے گا جس کی قوتِ ارادی ایسی زبردست ہو کہ وہ ہر موقع پر آزمائش پر غالب آجائے۔ باقی ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے اشخاص ایسے ہوں گے جو گناہ کی بیماری سے نحیف، لاغر اور کمزور ہو گئے ہیں اور اپنی قوتِ ارادی کو کھو کر لاچار اور بیزار بیٹھے ہیں۔ عالم گیر مذہب کا یہ کام ہے کہ ان لاکھوں اشخاص کی قوتِ ارادی میں از سرِ نو جان ڈال دے اور ان کو یہ توفیق عطا کرے کہ وہ اپنے گناہوں پر غالب آسکیں۔

۸۔ عالم گیر مذہب اور مسیحیت

ہم انشااللہ اس رسالہ میں یہ ثابت کر دیں گے کہ دنیا میں صرف مسیحیت ہی ایک ایسا واحد مذہب ہے جس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو عالم گیر مذہب میں ہونی چاہئیں۔ مسیحی مذہب اکیلا واحد مذہب ہے جو ان تمام شرائط کو جن کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے، بدرجہ احسن پورا کرتا ہے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم تمام اعلیٰ ترین اور بلند ترین اصولوں پر مشتمل ہے۔ مسیحیت خدا اور انسان کی نسبت ایسی تعلیم دیتی ہے جس سے دیگر تمام مذاہب یکسر خالی ہیں۔ کلمۃ اللہ نے خدا کی ذات کی نسبت جو تعلیم دی ہے، وہ بے نظیر، لاثانی اور ابدی ہے۔ چونکہ حق اور صداقت ابدی حقیقتیں ہیں اور کلمۃ اللہ کی تعلیم حق ہے، لہٰذا وہ عالم گیر اور ابدی ہے۔ وہ نوع انسانی کے لئے تا قیامت قائم رہے گی، کیونکہ وہ حق پر قائم ہے (متی ۲۴: ۲۵)۔ چنانچہ فرانس کا نام وَر عقل پرست رینان (Renan) کہتا ہے کہ:

> ”سقراط نے فلسفہ اور ارسطو نے سائنس کی بنیاد رکھی، لیکن مسیح نے بنی آدم کو ایسا مذہب دیا ہے کہ کسی کو تاحال یہ جرأت نہیں ہوئی کہ اس کے اصول میں کچھ کمی یا بیشی کرے اور مستقبل زمانہ میں بھی کوئی شخص ان میں کتر بیونت (جوڑ توڑ) نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اس کا مذہب ہر پہلو سے کامل اور ہمہ گیر ہے۔ خداوند مسیح کا پہاڑی وعظ تمام زمانوں کے واسطے ہے۔ ایسا کہ خواہ دنیا میں کیسے ہی عظیم انقلابات برپا ہوں، دنیا کے انسان اس کے افضل، عقلی اور اخلاقی نصب العین سے منحرف اور رو گردان نہیں ہو سکتے۔ ربنا مسیح کی ذات پاک انسانیت کی عظمت و برتری کی بلند ترین اونچائی پر ہے اور اس کی تعلیم زندگی اور نمونہ سے نوع انسانی کی ہمیشہ اصلاح اور تجدید ہوتی رہے گی“۔

کلمۃ اللہ کی شخصیت، نمونہ اور تعلیم ہمارے ملک کے ہمالیہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ کی طرح ہے جس کی اونچائی تمام انسانی مساعی پر خندہ زن ہے۔ یہ تعلیم نوع انسانی کی زندگی کی تمام منازل و مراحل میں ایسی راہ نما ہے جو ماورائے علم و تفکر اور منزہ عن الخطا (جو خطا نہ کرے) ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق جو تعلیم انجیل شریف میں پائی جاتی ہے، وہ لاثانی اور لاجواب ہے۔ اس کے اصول اقوام عالم پر حاوی ہیں اور ان کا اطلاق کل ممالک و اقوام و ازمنہ پر ہوتا رہا ہے۔ پس مسیحیت کے اصول عالم گیر ہیں۔ مسیحیت زمانہ ماضی میں تمام ممالک و اقوام کے مذاہب پر فاتح رہی ہے۔ دورِ حاضرہ میں تمام مذاہب اس کے جلالی اصول کی روشنی میں اپنی اصلاح میں مشغول رہتے ہیں۔ تاریخ عالم سے عیاں ہے کہ مسیحیت کے سوا کسی دوسرے مذہب کا مستقبل ہے ہی نہیں۔ اقوام عالم کے کل ادیان کی صداقتوں کے عناصر اس میں بدرجہ احسن موجود ہیں اور ادیان عالم کے باطل عناصر سے وہ سراسر پاک اور مبرا اور منزہ ہے۔ پس وہ اس لحاظ سے ایک جامع اور کامل مذہب ہے، جس کی نظیر صفحہ

تاریخ میں نہیں ملتی۔ مسیحیت اقوام عالم کی قومی اور ملی نشوونما اور ترقی میں ممد و معاون رہی ہے اور اس نے ہر زمانہ اور ہر قوم و ملک کی ضروریات کو بطرزِ احسن پورا کیا ہے۔ ابن اللہ کا کامل اور اکمل نمونہ صدیوں سے نوع انسانی کے پیش نظر رہا ہے اور اس نے کروڑہا انسانوں کو "خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا" ہے۔ بقول عمر خیام:

آنہا کہ خلاصۂ جہاں انسان اند
ہر اوج ملک براق ہمت رانند
در معرفت ذات تو مانند فلک
سر گشتہ سر نگوں و سر گردانند

دورِ حاضرہ میں یہی کامل شخصیت دنیا کی راہ بر ہے اور مستقبل میں بھی ابن اللہ ہی روحانیت کی دنیا کا واحد تاج دار اور حکمران نظر آتا ہے۔ کلیسیائے جامع کے کروڑوں افراد کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ خداوند مسیح ان کو گناہوں سے نجات دے کر ان کو ایسا فضل عطا کرتے ہیں کہ وہ گناہ اور شیطان پر غالب آتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "کیونکہ اِبنِ آدم کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے اور نجات دینے آیا ہے" (متی ۱۸:۱۱)۔ "اَے مِحنت اُٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دُوں گا" (متی ۱۱:۲۸)۔

دنیا کے تمام ممالک اور اقوام کے لوگ جو مختلف زمانوں میں آپ کے قدموں میں آئے بیک زبان اقرار کرتے ہیں کہ "کیونکہ اُس کی معموری میں سے ہم سب نے پایا یعنی فضل پر فضل" (یوحنا ۱:۱۶)۔ "مگر خُدا کا شکر ہے جو ہمارے جنابِ مسیح کے وسیلہ سے ہم کو فتح بخشتا ہے" (۱۔کرنتھیوں ۱۵:۵۷)۔ "جو کوئی خُدا سے پَیدا ہُوا ہے وہ دُنیا پر غالِب آتا ہے اور وہ غلبہ جِس سے دُنیا مغلوب ہُوئی ہے ہمارا اِیمان ہے" (۱۔یوحنا ۵:۴)۔ انشااللہ ہم اس کتاب کے آئندہ ابواب میں اس حقیقت کو آشکارا کر دیں گے کہ تمام شرائط جن کا بیان اس باب میں کیا گیا ہے، بطرزِ احسن مسیحیت میں پوری ہوتی ہیں اور مسیحیت اکیلا واحد اور فاتح حکمران اور عالم گیر مذہب ہے۔

باب دوم

مسیح کلمۃ اللہ

گوئی بغیر واسطہ درگوش خاکئے

رازے کزاں خبر بنود جبرئیل را

(فصل اول)

مسیحیت کی تعلیم عالم گیر ہے

اس فصل میں ہم انشااللہ یہ ثابت کردیں گے کہ مسیحیت کی تعلیم میں وہ کل خصوصیات بدرجہ احسن موجود ہیں جو عالم گیر مذہب میں ہونی چاہیئں۔اس رسالہ کے باب اول کے شروع میں ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ لازم ہے کہ عالم گیر مذہب میں خدا کا تصور اعلیٰ ترین قسم کا ہو، جس کو تمام دنیا کے ممالک اور کل عالم کی اقوام قبول کرسکیں۔علاوہ ازیں عالم گیر مذہب میں حقوق العباد کا اخلاقی نصب العین ایسا ہونا چاہیئے جو جامع اور مانع ہو اور جس کے اصولوں کا اطلاق تمام نوع انسانی پر بغیر امتیاز، نسل، قوم، رنگ، ملک، قبیلہ وغیرہ ہوسکے۔بالفاظ دیگر عالم گیر مذہب کے اخلاقیت کا نصب زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہونا چاہیئے تاکہ اس کے اصولوں کا اطلاق تمام زمانوں، ملکوں اور قوموں پر ہو اور اس کے اصول سب عالم و عالمیان پر حاوی ہوں۔

ہم نے اس موضوع پر ایک مبسوط رسالہ کلمۃ اللہ کی تعلیم [1] لکھا ہے۔لہٰذا اس جگہ ہم نہایت مختصر طور پر فقط ان مسیحی اصولوں کا ذکر کرتے ہیں جو مسیحی تعلیم کی اساس ہیں۔ان کا سطحی مطالعہ بھی ناظرین پر ظاہر کردیتا ہے کہ مسیحی تعلیم کے اصول جامع ہیں اور چونکہ وہ از سرتا پا اور از ابتدا تا انتہا روحانی ہیں۔لہٰذا وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد، عالم گیر اور کل اقوام و ممالک پر حاوی ہیں۔

۱۔خدا محبت ہے

کلمۃ اللہ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ ’’خدا محبت ہے‘‘(۱۔یوحنا۴: ۸؛ ۴: ۱۶)۔خدائے واحد ایک ایسی ہستی ہے جس کی ذات ہی قدوس محبت ہے۔آپ کی تعلیم کا تانا بانا صرف اس ایک اصول سے بُنا ہے۔اس تعلیم کے رگ وریشہ میں خدا کی اس پاکیزہ قدوس محبت کا تصور موجود ہے (۱۔یوحنا۴: ۱۶؛ ۱۔کرنتھیوں ۳: ۱۱؛ یوحنا۳: ۱۶؛ ۱۴: ۲۳۔ ۲۔تھسلنیکیوں ۲: ۱۶)۔خدا کی تمام صفات (جو درحقیقت اس کی جوہر ذات ہیں) فقط اس ایک اصول کے مختلف اور کامل ظہور ہیں۔مسیحیت کے مطابق ان تمام صفات کا صحیح مفہوم صرف محبت کے اصول کی روشنی میں ہی معلوم ہوسکتا ہے۔مثلاً خدا قادر مطلق، ازلی، لامحدود اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔خدا کے حاضر و ناظر ہونے سے یہ مراد نہیں کہ خدا کسی مکان میں اس طور پر حاضر ہے جس طرح کوئی مادی اور دیدنی شے ہمارے مکان میں پڑی ہوتی ہے۔باری تعالیٰ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد، بالا، برتر اور رفیع

---

[1] ۔یہ کتاب پنجاب رلیجس بک سوسائٹی لاہور سے مل سکتی ہے۔

ہے۔اس کی حضوری زمان و مکاں میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن زمان و مکاں سے محدود نہیں ہوتی۔ چونکہ خدا کی ذات محبت ہے اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ وہ حاضر و ناظر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی محبت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں حاضر و ناظر ہے، جو زمان و مکاں سے محدود نہیں ہے۔ خدا ایک واجب الوجود، ہمہ داں روح ہے۔ جس کی محبت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں لا محدود طور پر موجود ہے، یعنی اس کی محبت کی قدرت کی کوئی حد نہیں۔ اس کی ازلی محبت ایسی قادر مطلق ہے کہ وہ ہر گناہ کو اسفل السافلین (دوزخ کا سب سے نیچا یعنی ساتواں طبقہ) سے بچانے پر قادر ہے (زبور ۱۸: ۱۶)۔ اس کی محبت ہر جگہ اور ہر زمانہ میں حاضر و ناظر ہے اور بدترین گناہ گار کو دیکھ کر جوش میں آتی ہے اور بدترین خلائق کو روحانیت کے اوج بریں پر اپنی قدرت کاملہ سے پہنچا دیتی ہے۔ اس ازلی محبت کی قدوسیت تمام نیک اخلاقیات کی سرچشمہ، مرکز اور جلال ہے اور اخلاق کی ہستی کی بنا ہے جس طرح آفتاب عالم تاب تمام سیاروں کی نقل و حرکت کا مرکز ہے۔

خدا کی محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خدا اپنی صفات حسنہ سے کل بنی نوع انسان کو متصف (موصوف۔ وصف کیا گیا) کر دے، تاکہ نوع انسانی کے سب کے سب افراد اس کی محبت میں قائم رہ کر اس کے ساتھ روحانی رفاقت اور قرب حاصل کریں۔ جس طرح ماں باپ کی محبت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے فرزندوں کی فلاح و بہبودی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیں اور بچے ان کی محبت میں قائم رہیں۔ خدا کا جوہر ذات محبت ہے جو خدا اور نوع انسانی کے باہمی تعلقات کی بنا پر ہے۔ خدا کی یہ محبت قدوس محبت ہے۔ اگر خدا محبت نہ ہوتا تو وہ قدوس بھی نہ ہوتا اور اگر وہ قدوس بھی نہ ہوتا تو وہ محبت ہی نہ ہوتا۔ خدا کا جوہر ذات محبت ہے جو قدوس ہے۔ قدوسیت اس کی محبت کا مرکز ہے۔ پس خدا کی محبت اس بات کی خواہاں ہے کہ کل انسان پاک ہوں۔ پس انجیل جلیل خدا کی قدوس اور پاک محبت کو تمام انسانی اخلاقیات کا معیار قرار دیتی ہے۔

خدا کی ذات ہر قسم کے تناقض (ایک دوسرے کے مخالف ہونا) اور تضاد سے پاک ہے۔ پس اس کی صفات کاملہ میں کسی باہمی تضاد و تناقض کا وجود ایک ناممکن امر ہے۔ بعض کم فہم لوگ اس کے رحم، قدوسیت اور عدل کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس مفروضہ تقابل سے بعض مسیحی مسائل کی تاویل کرتے ہیں۔ لیکن یہ تاویلات از سر تا پا باطل ہیں، کیونکہ خدا ذات و صفات میں باہمی تضاد و تناقض کے وجود کا امکان سرے سے ہی نہیں۔ خدا کی قدوس محبت الٰہی صفت کو اپنے اندر جمع رکھتی ہے۔ پس جہاں تک مخلوق کائنات کا تعلق ہے خالق کی محبت سے کوئی ایسی شے صادر نہیں ہو سکتی جو قدوس کے خلاف ہو اور اس کی قدوسیت کسی ایسی شے سے مطابقت نہیں رکھ سکتی جو محبت کے خلاف ہو۔ خدا قدوسیت اور محبت دو الگ الگ صفت نہیں بلکہ ایک واحد جوہر ذات کے دو نام ہیں۔ خدا اپنی حکمت و قدرت سے تمام کائنات کا انتظام اپنی قدوس پر محبت ذات کے مطابق سرانجام دیتا ہے۔ اس کی حکمت و دانش کی صفت انتظام کائنات کی اصل ہے جو خلقت کی ترتیب میں موجود ہے اور خالق کا پتا دیتی ہے۔ اس کی محبت ہر جگہ حاضر و ناظر ہے جو کسی خاص قوم، ملت یا نسل یا فرد تک محدود نہیں، بلکہ وہ تمام بنی نوع انسان اور اقوام عالم پر بلا امتیاز حاوی ہے۔ خدا اقوام عالم کے ہر فرد کے ساتھ "ازلی اور ابدی محنت" رکھتا ہے (متی ۷: ۱۱؛ لوقا ۱۱: ۱۳؛ یرمیاہ ۳۱: ۳)۔ خدا بلند و بالا ہے کیونکہ اس کی محبت انسانی قیاس سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ ہر فرد بشر کے سر کے بال بھی سب گنے ہوئے ہیں (متی ۱۰: ۳۱)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا ہر واقعہ خواہ وہ اہم ہو یا معمولی ہو خدا کی بے زوال محبت کے دائرہ کے باہر نہیں ہے۔

خدا کی قدوس "ابدی محبت" کے اصل الاصول سے منجئ عالمین کی تعلیم کے تمام دیگر اصول کا استخراج ہوتا ہے۔ مسیحیت کے دیگر تمام اصول اسی ایک کلیہ قضیہ کے قدرتی اور منطقی نتائج ہیں۔ پس ایسے تمام تصورات جو خدا کی محبت کے نقیض ہیں، انجیل جلیل کی اساسی تعلیم کے خلاف ہیں۔ مثلاً محبت کے کلیہ قضیہ سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا نیکی کا سرچشمہ ہے۔ پس وہ بدی اور برائی کا سرچشمہ نہیں ہو سکتا، جیسا بعض مذاہب مانتے ہیں۔ جس طرح نور اور تاریکی میں کوئی نسبت نہیں ہو سکتی، اسی طرح ذات الٰہی جو قدوس ہے ایسے تمام تصورات سے پاک، منزہ، اعلیٰ اور بالا ہے جو اصول محبت کے خلاف ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس انجیلی تعلیم کے مطابق الٰہی صفت "قادر مطلق" سے مراد یہ نہیں کہ وہ سب کچھ کر سکتا

ہے، بلکہ اس کا یہ مطلب کہ وہ ان تمام امور کو اپنی قدرت کاملہ سے ظہور میں لا سکتا ہے جو اس کی ذات یعنی محبت کے خلاف نہیں، بلکہ عین اس کے مطابق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انجیل کے مطابق خدا کوئی جابر، مطلق العنان، قہار ہستی نہیں۔ کیونکہ یہ اور اسی قسم کی دیگر صفات خدا کی محبت کے عین منافی ہیں۔ اگر ہم نے کسی مسیحی عقیدہ کے اصول کی صحیح واقفیت حاصل کرنی ہو تو فقط اس ایک اصول کی روشنی میں اس کو کماحقہ ' سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس بنیادی اصول کو جو در حقیقت ایک کلید ہے، نظر انداز کر دیں گے تو کلمۃ اللہ کی تعلیم کو کسی صورت میں بھی نہیں سمجھ سکیں گے۔

۲۔ اہل یہود اور خدا کا تصور

خدا نے حضرت موسیٰ کو کوہ سینا پر یہ مکاشفہ عطا کیا تھا کہ جس خدا کی وہ عبادت کرتا ہے، اس کا خاص نام ''یہوواہ'' ہے۔ اہل یہود خدا کا یہ خاص نام زبان پر لانے کے خیال ہی سے کانپ اٹھتے تھے۔ پس وہ اس خاص اسم اعظم کی بجائے خدا کے لئے دوسرے نام استعمال کرتے تھے۔ مثلاً ''ادونائی''، بمعنی ''آقا''۔ یہ نام بھی شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات خدا کے لئے لفظ ''ایل'' یا ''ایلوہیم'' (جو توریت شریف کی پہلی کتاب پیدائش میں وارد ہوئے ہیں) استعمال کئے جاتے تھے۔ ایک ربی نے تو یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ جو شخص اپنی زبان پر خدا کا اسم اعظم یہوہ لائے وہ مستوجب قتل ہے۔ وہ خدا کے حکم (خروج ۲۰:۷) کو توڑتا ہے۔ خدا کا یہ اسم اعظم ایسا مقدس سمجھا جاتا تھا کہ سردار کاہن تک اس کو زبان پر لانے سے خائف و ہراساں تھے۔ یہاں تک کہ یوم کفارہ کے روز بھی وہ دعا کے وقت دہشت کے مارے ''یہوہ'' کی بجائے کہتا تھا ''اے نام'' میں نے تیرے حضور گناہ کیا ہے''۔

دیگر اوقات میں خدا کے لئے لفظ ''آسمان اور قدوس'' (یسعیاہ ۲۹:۲۳)، ''حق تعالیٰ (زبور ۱۸:۱۳)، ''قدرت''، ''قادر مطلق'' (پیدائش ۳۵:۱۱)، ''ستودہ'' (مرقس ۱۴:۶۱)، ''رحمان و رحیم'' (نحمیاہ ۹:۱۷) استعمال کئے جاتے تھے۔ جہاں قوم یہود کی ہمسایہ مشرک بت پرست اقوام اپنے معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کا نام جھجکے بغیر ''جوپیٹر''، ''متھرا'' وغیرہ عموماً زبان پر لاتی تھیں۔ وہاں بنی اسرائیل کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ فرد جھجکے بغیر خدا کا خاص نام زبان پر نہیں لاتا تھا۔ حقیقی اسرائیلی وہ تھا جو خدا سے ڈرتا تھا[1]۔

خدا نے اپنے رحم و کرم سے اقوام عالم میں سے قوم یہود کو چن کر برگزیدہ کر لیا تھا۔ پس یہ قوم اپنے آپ کو خدا کی خاص منظور نظر خیال کرتی تھی۔ حالانکہ خدا نے توریت شریف میں ان کو نہایت صاف اور واضح الفاظ میں یہ جتا دیا تھا کہ اے میری خاص اور برگزیدہ قوم خداوند نے جو تجھ کو روئے زمین کی اور سب قوموں میں سے چن لیا ہے تاکہ تو اس کی خاص امت ٹھہرے۔ خداوند نے جو تم سے محبت کی ہے اور تم کو چن لیا ہے، اس کا سبب یہ نہ تھا کہ تم شمار میں اور قوموں سے زیادہ تھے، بلکہ چونکہ تم سے خداوند کو محبت ہے۔ تو اپنے دل میں ہرگز یہ نہ سوچنا کہ تیری نیکی کے سبب میں نے یہ کیا، کیونکہ تو ایک گردن کش قوم ہے اور خداوند سے بغاوت کرتی ہے (استثنا ۷:۷؛ ۹:۴-۷)۔ خداند خدا نے اہل یہود کی بار بار کی بغاوت کے باوجود اس برگزیدگی کے تعلق کو قائم اور استوار رکھا۔ پس اس خاص قومی تعلق کی بنا پر اہل یہود کے بعض نبیوں اور زبور نویسوں نے بلند پروازی سے کام لے کر خدا کے کرم و فضل کو باپ کے کرم و فضل سے تشبیہ دی ہے (گنتی ۱۱:۱۲؛ زبور ۶۸:۵؛ امثال ۳:۱۲)۔ اس لحاظ سے خدا قوم اسرائیل کا صرف من حیث القوم ''باپ'' تھا (یرمیاہ ۳۱:۹)۔ لیکن قوم اسرائیل کی تمام تاریخ میں کسی ایک فرد نے بھی یہ جرأت نہیں کی تھی کہ وہ کہے کہ خدا بطور ایک فرد کے میرا باپ ہے۔ بنی اسرائیل کی تمام تاریخ میں خدا کے لئے یہ خطاب نہ کبھی بولا گیا تھا اور نہ سنا گیا تھا۔

[1] H.O. Rops, Daily life in the time of Jesus (The New American Library ,1962.

۳۔ خدا بنی نوع انسان کا باپ ہے

بنی اسرائیل کی قوم کی تمام تاریخ میں حضرت کلمۃ اللہ اولین معلم تھے جنہوں نے پہلے پہل خدا کو ''ابا'' یا ''اے میرے باپ'' کے کلمہ سے مخاطب کیا (مرقس ۱۴:۳۶)۔ آپ نے ہمیشہ خدا کے لئے لفظ ''باپ'' استعمال کیا (لوقا ۲۲:۴۲؛ ۲۳:۴۶) اور اپنے متبعین (پیروی کرنے والے) کو یہ خوشی کی خبر دی کہ خدا ان میں سے ہر فرد کا باپ ہے جو کل بنی نوع انسان سے ازلی اور ابدی محبت کرتا ہے اور فرمایا کہ جب تم دعا کرو تو کہو ''اے باپ'' (لوقا ۱۱:۲؛ متی ۱۱:۲۵۔۲۷)، ''اے ہمارے باپ'' (متی ۶:۹)۔ پس کلمۃ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ خدا اپنی ''ابدی محبت'' کی وجہ سے بنی نوع انسان کا باپ[1] ہے۔ ''سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے'' (افسیوں ۴:۶)۔

''ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے یعنی باپ جس کی طرف سے ساری چیزیں ہیں'' (۱۔ کرنتھیوں ۸:۶)۔ اسی میں ہم جیتے چلتے پھرتے اور موجود ہیں (اعمال ۱۷:۲۸)۔ ''کیونکہ تم کو غُلامی کی رُوح نہیں ملی جِس سے پھر ڈر پَیدا ہو بلکہ لے پالک ہونے کی رُوح ملی جِس سے ہم ابّا یعنی اَے باپ کہہ کر پُکارتے ہیں'' (رومیوں ۸:۱۵؛ گلتیوں ۴:۴)۔ کلمۃ اللہ نے ہم کو سکھایا ہے کہ دعا کے وقت خدا کو ''باپ'' کہہ کر پکاریں (متی ۶:۹)۔ کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اے بنی آدم ''میں تمہارا باپ ہوں گا اور تم میرے بیٹے بیٹیاں ہوگے'' (۲۔ کرنتھیوں ۶:۱۸)۔ ''ایک ہی روح میں باپ کے پاس ہماری رسائی ہوتی ہے'' (افسیوں ۲:۱۸)۔ ''باپ نے ہم سے کیسی محبت کی کہ ہم خدا کے فرزند کہلائے اور ہم فرزند ہیں بھی'' (۱۔ یوحنا ۳:۱؛ رومیوں ۸:۱۵)۔ خدا ہر شخص سے محبت کرتا ہے خواہ وہ کیسا ہی نالائق ہو۔ چنانچہ کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ ''خدا اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے'' (متی ۵:۴۵)۔ ''وہ ناشکروں اور بدوں پر بھی مہربان ہے'' (لوقا ۶:۳۵)۔ غرضیکہ ''خدا نے دنیا سے ایسی محبت کی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے (یوحنا ۳:۱۶)۔ اس ابوت کی تہ تک ہم نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ وہ لامحدود ہے (ملاکی ۲:۱۰)۔

خدا کی محبت اور ابوت الٰہی کے دونوں تصور سند اور خبر ہیں۔ ''خدا محبت ہے'' کی خبر سے ہم کو یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ خدا اپنے مظہر سے بلند و بالا ہے اور اپنے مظہر کے اندر بھی موجود ہے۔ خدا کی ابوت کی خبر سے ہم کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ خدا اور انسان میں غیریت نہیں ہے، بلکہ انسان خدا کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے (پیدائش ۱:۲۷)۔ لفظ ''ابا، باپ'' ہم کو اس اعلیٰ وارفع اور بالاترین ہستی سے ملا دیتا ہے جس کی زندگی میں تمام کائنات کی زندگی ہے اور جس کی ذات سے محبت صادر ہو کر انسان تک پہنچتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ لفظ ''باپ'' ایک انسانی محاورہ ہے۔ پس اس لفظ سے خدا کی ذات میں تذکیر و تانیث کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مراد یہ ہے کہ خدا کی نوع انسان کے لئے وہی درجہ رکھتا ہے جو انسانی تعلقات میں باپ یا ماں کو حاصل ہے اور کہ خدا ہر فرد بشر سے لامحدود ازلی محبت رکھتا ہے جس کا عکس دنیا میں ماں باپ کی محبت ہے۔

---

[1] ۔ اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب ''ابوت الٰہی کا مفہوم'' میں مفصل بحث کی ہے (برکت اللہ)۔

۴۔انسانی اخوت و مساوات کے اصول

جب کلمتہ اللہ اس دنیا میں آئے تو نوع انسانی کی مختلف اقوام میں طرح طرح کی درجہ بندیاں موجود تھیں۔یونانی اپنی تہذیب پر فخر کر کے غیر یونانیوں کو"وحشی" کے خطاب سے موسوم کر کے کہتے تھے کہ وہ یونانیوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔رومی اپنی سلطنت، حشمت، قوت اور سطوت کی وجہ سے مغرور تھے اور یہود کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔یہود اس بات پر نازاں تھے کہ وہ خدا کی برگزیدہ قوم ہیں۔لہٰذا وہ تمام غیر یہود کو جہنمی اور گمراہ شمار کر کے ان سے اس قدر پرہیز کرتے تھے کہ ان کی چھت تلے جانا بھی ناپاکی کا موجب سمجھتے تھے۔یہود سامریوں سے ایسا کینہ اور عداوت رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ میل جول رکھنا بھی خنزیر کے گوشت کی طرح حرام خیال کرتے تھے (عزرا۴: ۳، ۱۰؛یوحنا۴: ۹؛ ۸: ۴۸؛ ۹: ۵۳)۔

حضرت کلمتہ اللہ اس دنیا کے پہلے اور آخری معلم ہیں جنہوں نے دنیا کی تمام اقوام کو خدا کی ابوت کا سبق سکھا کر انسانی اخوت و مساوات کے اصول کو چٹان کی طرح ایسا مضبوط قائم کیا کہ وہ تاابد غیر متزلزل رہے گا۔جو شخص خداوند کی دعا(متی ۶: ۹۔۱۳) کے ابتدائی الفاظ "اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے" زبان پر لاتا ہے، اس کا ذہن خود بخود جملہ "ہمارے برادر جو زمین پر ہیں" کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔چنانچہ مقدس یوحنا فرماتا ہے"اگر کوئی کہے کہ میں خُدا سے محبّت رکھتا ہُوں اور وہ اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو جُھوٹا ہے کیونکہ جو اپنے بھائی سے جسے اُس نے دیکھا ہے محبّت نہیں رکھتا وہ خُدا سے بھی جِسے اُس نے نہیں دیکھا محبّت نہیں رکھ سکتا۔اور ہم کو اُس کی طرف سے یہ حکم مِلا ہے کہ جو کوئی خُدا سے محبّت رکھتا ہے وہ اپنے بھائی سے بھی محبّت رکھے"(۱۔یوحنا۴: ۲۰۔۲۱)۔ہم اخوت انسانی کے اصول پر عمل کرنے ہی سے ابوت الٰہی کے تصور کو کماحقہ' سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہم خدا کی ابوت کے اصول کو قبول کر سکتے ہیں۔تاوقتیکہ ہم اخوت انسانی کے اصول کو قبول نہ کریں۔دونوں اصول لازم و ملزوم اور اقلیم خیال میں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

چونکہ خدا کل بنی نوع انسان کا باپ ہے اور سب سے برابر اور مساوی طور پر محبت کرتا ہے۔لہٰذا کل بنی نوع انسان اور اقوام عالم پر واجب ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ایسی محبت کریں جیسی وہ اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں (متی ۵: ۴۳۔۴۷؛ ۲۲: ۳۹؛ ۷: ۱۲؛ لوقا۱۰: ۲۵۔۳۷؛ یوحنا۱۳: ۳۴؛ ۱۵: ۱۷؛رومیوں۱۳: ۸؛افسیوں۵: ۲؛ا۔پطرس ۱: ۲۲؛ا۔یوحنا۲: ۱۰؛ ۳: ۱۱۔۲۳؛ ۴: ۷۔۱۲؛ ۴: ۲۰)۔

اس زریں جہاں گیری اصول اخوت و مساوات کو حضرت کلمتہ اللہ نے ایک لطیف تمثیل سے سمجھایا۔چنانچہ انجیل مقدس میں وارد ہوا ہے کہ ایک دفعہ عالم شرع نے خداوند مسیح سے پوچھا کہ "سب حکموں میں مقدم حکم کون سا ہے؟" آپ نے فرمایا کہ مقدم حکم یہ ہے کہ "اَے اِسرائیل سُن۔خُداوند ہمارا خُدا ایک ہی خُداوند ہے۔اور تُو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دِل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اپنی ساری طاقت سے محبّت رکھ۔دُوسرا یہ ہے کہ تُو اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبّت رکھ۔اِن سے بڑا اَور کوئی حکم نہیں۔"(مرقس۱۲: ۲۹۔۳۱)۔ "اِنہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیا کے صحیفوں کا مدار ہے"(متی۲۲: ۳۶۔۴۰)۔اس پر اس نے آپ سے دریافت کیا کہ میرا پڑوسی کون ہے؟ منجی عالمین نے اس سوال کا جواب ایک تمثیل کے ذریعہ دیا اور فرمایا:

> "ایک آدمی یرُوشلیم سے یریحُو کی طرف جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں میں گھِر گیا۔اُنہوں نے اُس کے کپڑے اُتار لئے اور مارا بھی اور ادھمُوا چھوڑ کر چلے گئے۔اِتفاقاً ایک کاہِن اُسی راہ سے جا رہا تھا اور اُسے دیکھ کر کترا کر چلا گیا۔اِسی طرح ایک لاوی اُس جگہ آیا۔وہ بھی اُسے دیکھ کر کترا کر چلا گیا۔لیکن ایک سامری سفر کرتے کرتے وہاں آنِکلا اور اُسے دیکھ کر اُس نے ترس کھایا۔اور اُس کے پاس آکر اُس کے زخموں کو تیل اور مَے لگا کر باندھا اور اپنے

جانور پر سوار کر کے سرای میں لے گیا اور اُس کی خبر گیری کی۔ دُوسرے دِن دو دِینار نِکال کر بھٹیارے کو دِیئے اور کہا اِس کی خبر گیری کرنا اور جو کچھ اِس سے زیادہ خرچ ہو گا میں پھِر آکر تجھے ادا کر دُوں گا۔ اِن تینوں میں سے اُس شخص کا جو ڈاکُوؤں میں گھِر گیا تھا تیری دانِست میں کَون پڑوسی ٹھہرا۔ اُس نے کہا وہ جِس نے اُس پر رحم کیا۔ یِسُوع نے اُس سے کہا۔ جا تُو بھی اَیسا ہی کر" (لوقا ۱۰: ۳۰۔۳۷)۔

اس تمثیل سے خداوند نے ایک سامری کو (جس سے یہود نفرت رکھتے تھے) حقیقی پڑوسی کا نمونہ دے کر اخوتِ انسانی کی اس وقعت کو واضح کر دیا کہ بنی نوع انسان کا ہر فرد دوسرے کا بھائی ہے اور اس نوع کے سب افراد پر لازم ہے کہ وہ بلا امتیاز رنگ، نسل، ذات، درجہ، ملت، قوم وغیرہ ایک دوسرے سے اپنے برابر محبت کریں۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو تاکہ تم اپنے پروردگار کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔ اگر تم اپنے بھائیوں ہی کو فقط سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو۔ چاہیئے کہ تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے (متی ۵: ۴۷؛ رومیوں ۱۵: ۲؛ خروج ۲۳: ۴؛ احبار ۱۹: ۱۷)۔

ع پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

۵۔ انسانی مساوات کا اصول

مرحوم حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رقم طراز ہیں:

"حضرت مسیح کا ظہور ایسے عہد میں ہوا تھا جب یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش ہی دین داری اور خداپرستی سمجھی جاتی تھی۔ یہودیوں کے علاوہ بھی جس قدر تمدن قومیں ان کے قرب وجوار میں تھیں۔ مثلاً رومی، مصری، اسوری (آشوری) وغیرہ۔ وہ بھی انسانی رحم و محبت کی رو سے یکسر ناآشنا تھیں۔ لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہیئں، لیکن وہ اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم، محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی روک تھام کرنی چاہیے۔ انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں (مثلاً صلیب) سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلاوجہ جلا کر خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی فسادات، بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اخلاق اور مصری اور اسوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔ پس اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لئے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو سرتاپا رحمت و محبت کا پیام ہو اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کر کے صرف اس کی قلبی اور معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کر دے۔ چنانچہ حضرت مسیح کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہو گئی۔ آپ نے جسم کی جگہ روح پر، زبان کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوع انسانی کی توجہ منعطف (مڑنے والا۔ متوجہ ہونے والا) کی اور اعلیٰ انسانیت کا فراموش شدہ سبق از سر نو تازہ کر دیا"

(ترجمان القرآن ملخص)۔

منجی عالمین نے ہم کو یہ تعلیم دی کہ ''جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ سلوک کریں تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو۔''(لوقا۶:۳۱)۔آپ نے فرمایا''میرا حکم یہ ہے کہ جیسے میں نے تم سے محبت کی تم بھی ایک دوسرے سے محبت کرو''(یوحنا۱۵:۱۲)۔''جو پیغام تم نے شروع سے سناوہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرو جو محبت نہیں رکھتاوہ موت کی حالت میں رہتاہے''(۱۔یوحنا۳:۱۱)۔''اے عزیزو آؤ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں کیونکہ محبت خدا کی طرف سے ہے''(۱۔یوحنا۴:۷)۔''آپس کی محبت کے سوا کسی چیز میں کسی شخص کے قرض دار نہ ہو، کیونکہ جو دوسرے سے محبت کرتاہے اس نے تمام شریعت پر پورا عمل کیا۔کیونکہ یہ باتیں کہ زنانہ کر، خون نہ کر، چوری نہ کر، لالچ نہ کر اور ان کے سوااور جو کوئی حکم ہو ان سب کا خلاصہ اس بات میں پایا جاتاہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت کرو۔محبت اپنے پڑوسی سے بدی نہیں کرتی۔اس واسطے محبت شریعت کی تکمیل ہے''(رومیوں ۱۳:۸)۔''محبت کو جو کمال کا پٹکا ہے باندھ لو''(کلسیوں ۳:۱۴)۔''تمہاری محبت آپس میں اور سب آدمیوں کے ساتھ زیادہ ہو اور بڑھے''(۱۔تھسلنیکیوں ۳:۱۲؛۴:۹؛عبرانیوں ۱۳:۱)۔''جو کوئی اپنے بھائی سے محبت کرتاہے وہ نور میں رہتاہے''(۱۔یوحنا۲:۱۰؛۳:۱۴)۔

سطور بالا میں ہم نے جو تمثیل انجیل لوقا(۱۰:۲۵۔۳۷) سے نقل کی ہے اس کے الفاظ قابل غور ہیں۔عالم شرع سے سوال ''سب حکموں میں مقدم حکم کون سا ہے'' کے جواب میں کلمۃ اللہ نے ''(کلمہ)شماہ'' کے الفاظ(استثنا۶:۴۔۵) کے ساتھ احبار کے الفاظ کو بھی یکجا کر کے شریعت کا خلاصہ شریعت کے الفاظ میں بتادیااور فرمایا کہ ان دو حکموں پر شریعت انبیا کا دار و مدار ہے(مرقس ۱۲:۲۸۔۳۴؛متی ۲۲:۳۴۔۴۰)۔ ان دونوں حکموں کو جو توریت شریف کی مختصر کتابوں میں منتشر تھے کلمۃ اللہ سے پہلے کسی ربی یا استاد نے یکجانہ کیا۔آپ اس دنیا میں پہلے معلم تھے جنہوں نے خدا کی محبت اور انسانی اخوت و محبت و مساوات کے اصول کو یکجا کر کے دو حکموں کو ایک حکم کی لڑی میں منسلک کر کے اس کو شریعت اور صحائف انبیا کا نچوڑ قرار دے دیا۔مشہور یہودی عالم اور اناجیل کے مفسر مرحوم ڈاکٹر مانٹی فیوری نے تمام یہودی لٹریچر کو چھان مارا، لیکن اس نے کبھی یہ کہیں نہ پایا کہ ان دو احکام کو آں خداوند سے پہلے کسی نے یکجا کیا ہو۔کلمۃ اللہ نے ان دو احکام کو ایسے محکم طور پر پیوستہ کر دیا کہ آپ کے وقت سے اب تک دنیائے اخلاق نے ان کو کبھی جدا نہ کیا۔ابوت الٰہی اور اخوت و مساوات کے اصول نہ صرف ایک دوسرے سے منطقی طور پر وابستہ ہو گئے ہیں ،بلکہ دونوں احکام ایک دوسرے کی جان ہو کر اور ہر ایک واحد اصول ہو کر علم الاخلاق کی بنیاد ہو گئے ہیں۔

خدا کی ازلی محبت کے اصول اور خدا سے محبت رکھنے کے اصول میں علت و معلول کا رشتہ ہے۔خدا کی محبت کا قدرتی اور منطقی نتیجہ انسان کا پیار ہے۔خدا کی محبت مقدم ہے اور انسان کی خدا سے محبت موخر ہے۔چنانچہ مقدس یوحنا لکھتاہے ''محبت اس میں نہیں کہ ہم نے خدا سے محبت کی، بلکہ اس میں ہے کہ خدا نے پہلے ہم سے محبت کی۔۔۔پس جب خدا نے ہم سے ایسی محبت کی تو ہم پر بھی ایک دوسرے سے محبت رکھنا فرض ہے''(۱۔یوحنا۴:۱۰۔۱۱)۔پس کلمۃ اللہ کی تعلیم کی اساس محبت کے اصول کے ہر سہ ظہور پر قائم ہے۔

اول، خدا کی محبت انسان کے لئے جو مقدم ظہور ہے۔

دوم، انسان کی محبت خدا سے۔

سوم، انسان کی محبت انسان سے۔

جس طرح خدائے قدوس کی محبت پاک ہے، اسی طرح انسانی محبت پاک ہے جس میں جنسی تصور کا سایہ بھی نہیں۔انجیل جلیل کے اردو ترجمہ میں جس یونانی لفظ کا ترجمہ ''محبت'' کیا گیا ہے، وہ ''اگاپے''(Agape) ہے جو یونانی زبان کے ادبی لٹریچر میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔اس لفظ ''اگاپے'' کے معنی ''پاکیزہ محبت'' ہیں۔ یہ لفظ یونانی بائبل کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔یونانی ادبی کتب میں ''محبت'' کے لیے لفظ ''ایروس''(Eros) استعمال کیا جاتا تھا، جس کے معنی ''ناپاک عشق'' ہے۔لیکن یونانی انجیل میں لفظ ''ایروس'' کہیں بھی مستعمل نہیں ہے،

کیونکہ اس لفظ کے ساتھ جنسی ناپاک جذبات کا تلازم تھا جو کلمۃ اللہ کی تعلیم، زندگی اور نمونہ کے کلی طور پر منافی تھا۔ انجیل جلیل کا ایک ایک ورق اخوت و مساوات کے سنہری جہاں گیری اصول سے مزین ہے (متی ۱۰:۱۸؛ یوحنا ۳۴:۱۳؛ رومیوں ۵:۱۲؛ ۸:۱۳؛ ۱۔کرنتھیوں باب ۱۳؛ گلتیوں ۱۳:۵؛ ۱۔یوحنا ۲۰:۴؛ مرقس ۲۹:۱۲؛ متی ۴۰:۲۲؛ لوقا باب؛ متی باب ۱۸؛ باب ۲۵ وغیرہ وغیرہ)۔ خدا کی ابوت اور انسانی اخوت کا تصور منجی عالمین کی تعلیم کی اساس ہے۔ مرحوم مولانا حالی کا یہ شعر انجیل شریف اور صرف انجیل شریف پر ہی صادق آتا ہے کہ:

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا

کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

اس عالم گیر محبت کے جہاں گیری اصول سے کوئی شخص یا طبقہ مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس ایک اصول نے طرح طرح کی تفریق اور درجہ بندی کو مٹا دیا۔ غلام اور آزاد، غریب اور دولت مند، اعلیٰ اور ادنی، عالم اور جاہل، مرد اور عورت کا امتیاز، غرضیکہ کلمۃ اللہ کے اس ایک اصول کے سبب ہر قسم کے امتیازات اس دنیا سے رخصت ہو گئے (رومیوں ۲:۱۰؛ ۵:۸؛ ۶:۲۳؛ ۱۔کرنتھیوں ۱:۲۸؛ ۲۔کرنتھیوں ۵:۱۷؛ ۱۔یوحنا ۲:۱۲۔۱۵ وغیرہ)۔ ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ منجی عالمین کی تعلیم تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے جس میں یہود اور غیر یہود سب شامل ہیں۔ آپ نوع انسانی کے نجات دہندہ تھے۔ پس آپ نے اپنے رسولوں کو الوداعی حکم دیتے وقت بھی نوع انسانی میں تفریق و تمیز نہ کی اور رسولوں کو فرمایا" پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور اُن کو باپ اور بیٹے رُوح اُلقدس کے نام سے بپتسمادو" (متی ۱۹:۲۸)۔ آپ کے رسول دیگر یہود کی طرح غیر یہود سے نفرت رکھنے کی فضا میں بچپن سے پلے تھے۔ پس ان کے لئے یہ حکم سخت گراں تھا۔ خدا نے مقدس پطرس کو مکاشفہ کے ذریعہ انسانی اخوت و مساوات کا یہ سبق سکھایا کہ "۔۔۔ خُدا کسی کا طرف دار نہیں۔ بلکہ ہر قَوم میں جو اُس سے ڈرتا اور راستبازی کرتا ہے وہ اُس کو پسند آتا ہے" (اعمال ۳۴:۱۰، ۳۵)۔ یہ حقیقت بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ کلمۃ اللہ نے بھی اسی نفرت کی فضا میں پرورش پائی تھی (استثنا ۲۳:۶؛ عزرا ۹:۱۲) جس میں آپ کے رسولوں اور ہم عصر یہود نے پرورش پائی تھی۔ لیکن اناجیل اربعہ کا سطحی مطالعہ بھی ظاہر کر دیتا ہے کہ آپ نے کبھی یہود و غیر یہود، سامریوں، رومیوں اور یونانیوں غرضیکہ کسی قوم کے افراد میں کبھی تمیز نہ کی۔ آپ خدا کی سب مخلوق سے آزادانہ نڈر ہو کر میل جول رکھتے تھے۔ سب کو بلا امتیاز نسل و قوم شفا بخشتے تھے اور خدا کی محبت کا پیغام سناتے تھے۔ خواہ وہ یہودی ہو یا غیر یہودی، بڑا ہو یا چھوٹا، اعلیٰ ہو یا ادنی، دولت مند ہو یا مفلس، عالم ہو یا جاہل، حاکم ہو یا محکوم، ربی ہو یا سامری، مرد ہو یا عورت، فقیہ ہو یا فریسی، راستباز ہو یا گناہ گار، مقتدر ہستی ہو یا محصول لینے والا اور مچھوا (ماہی گیر)۔ کلمۃ اللہ کی نظر ان ظاہری پردوں کو خاک کر کے ہمیشہ ہر فرد کے دل اور باطن پر پڑی اور آپ فوراً بھانپ جاتے کہ خدا کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔

۶۔ نفس انسانی کی وقعت اور احترام

جنابِ مسیح نے نہ صرف نفس انسانی کے احترام کا ہی حکم دیا، بلکہ آپ نے اپنے نمونہ اور کردار سے یہ حقیقت دنیا پر روشن کر دی کہ خداوند کی نگاہ تمام ظاہری درجہ بندی سے پار ہو کر دل کی اندرونی حالت کو جان لیتی ہے اور ہر ذی روح شخص کی قدر اس کی روح کی وجہ سے کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ سامریہ گئے (یوحنا ۴:۱۔۴۲)۔ آپ تھکے ماندے اور بھوکے تھے۔ آپ کے حواریوں نے درخواست کی کہ "اے ربی کچھ کھا لیجئے"۔ آپ نے جواب دیا "میرے پاس کھانے کے لئے ایسا کھانا ہے جسے تم نہیں جانتے" اور وہ کھانا کیا تھا؟ ایک بدچلن سامری عورت کی روح کو بچانا آپ کا کھانا تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "میرا کھانا یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں اور اس کا کام پورا کروں"۔ یوں آپ نے ایک سامری کسبی کی روح کی قدر اور وقعت بھی دنیا پر ظاہر کر دی۔ ایک اَور دفعہ آپ نے طوفان میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان کو خطرے

میں ڈال کر جھیل کو پار کیا تاکہ ایک دیوانہ کی روح کو بچائیں۔ آپ کی نظر میں سب سے بیوقوف وہ کاروباری شخص تھا جو اپنے مال کی فکر کرتا تھا، لیکن اپنی روح کی فکر نہیں کرتا تھا اور آپ نے فرمایا "اگر آدمی ساری دنیا کو حاصل کرلے اور اپنی روح کو ضائع کردے تو اسے کیا فائدہ" (مرقس ۸:۳۶)۔

جنابِ مسیح کے لئے کوئی شخص عام اور معمولی نہیں تھا۔ بھیک مانگنے والوں کی مالی اور سماجی حالت، کوڑھیوں کا کوڑھ، دیوانوں کی دیوانگی، بوڑھوں کا ضعف اور بیماری، گناہ گار آدمیوں اور بدکار عورتوں کا سوسائٹی سے اخراج (لوقا ۷:۳۳۔۳۵؛ متی ۱۱:۱۹؛ مرقس ۲:۷)، غرضیکہ کوئی بیرونی اور ظاہری شے کلمۃ اللہ کی نظر میں کسی انسان کی بیش قیمت روح کی قدر، وقعت اور نجات اخروی عطا کرنے کی راہ میں رکاوٹ کا باعث نہ ہوئی۔ آپ نے علیٰ الاعلان فرمایا کہ ہر انسان کی روح خدا کی نظر میں ایسی بیش قیمت ہے کہ "اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر (مسیح) ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے" (یوحنا ۳:۱۶)۔ آپ نے کہا کہ بدترین انسان وہ ہے جو دوسرے انسانوں کو اچھوت، ادنیٰ اور ہیچ سمجھتا ہے (لوقا ۱۸:۱۱۔۱۴) اور فرمایا "خبردار ان چھوٹوں میں سے کسی کو حقیر نہ جاننا" (متی باب ۱۸)۔ آپ نے لوگوں کو متنبہ کرکے فرمایا کہ عدالت کے روز جب آپ منصفِ حقیقی ہوں گے تو سب قومیں آپ کے سامنے جمع کی جائیں گی اور وہ اپنی دہنی طرف والوں کو کہے گا کہ آؤ میرے باپ کے مبارک لوگو جو بادشاہت بنائے عالم سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے، اس کو میراث میں لو۔ کیونکہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا، میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا، میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اتارا، ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا، بیمار تھا تم نے میری خبر لی، قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔ تب راستباز جواب میں کہیں گے اے خداوند ہم نے کب آپ کو بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا۔ ہم نے کب آپ کو پردیسی دیکھ کر گھر میں اتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟ ہم کب آپ کو بیمار یا قید میں دیکھ کر آپ کے پاس آئے؟ بادشاہ ان سے جواب میں کہے گا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ چونکہ تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ سلوک کیا، اس لیے میرے ہی ساتھ کیا۔ پھر آپ بائیں طرف والوں سے کہیں گے کہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا، میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہ پلایا، میں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں نہ اتارا، ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا، بیمار اور قید میں تھا تم نے میری خبر نہ لی۔ تب ناراست جواب میں کہیں گے اے خداوند ہم نے کب آپ کو بھوکا دیکھ کر کھانا نہ کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی نہ پلایا۔ ہم نے کب آپ کو پردیسی دیکھ کر گھر میں نہ اتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا نہ پہنایا؟ ہم نے کب آپ کو بیمار یا قید میں دیکھ کر آپ کی خدمت نہ کی۔ اس وقت خداوند ان سے جواب میں کہیں گے کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں چونکہ تم نے ان سب سے چھوٹوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ نہ کیا، اس لیے میرے ساتھ نہ کیا (متی ۲۵:۳۱۔۴۶)۔

ع ہر کہ بینی بداں کہ مظہر اوست

کہاں جنابِ مسیح کی تعلیم اور نمونہ اور کہاں مذاہب باطلہ اور یونانی فلاسفر افلاطون کا قول کہ بوڑھے مردوں اور بڑھیا عورتوں کو مار ڈالنا چاہیئے، کیونکہ وہ ملک کے لئے بار گراں ثابت ہوتے ہیں۔

ع بہ ہیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

۷۔ بچوں کی وقعت واحترام

برٹرنڈرسل جیسا مخالف مسیحیت اقبال کرتا[1] ہے کہ مسیح کی آمد سے پہلے طفل کشی دنیا کے قریباً ہر کونے میں عمل میں آئی تھی۔ حتیٰ کہ فلاسفر افلاطون بھی اس قبیح رواج کی حمایت کرتا ہے، لیکن منجی عالمین نے دنیا جہاں کو بچوں کی وقعت واحترام کا سبق سکھایا اور فرمایا ''خبردار اِن چھوٹوں میں سے کسی کو نا چیز نہ جاننا کیونکہ میں تم سے کہتا ہُوں کہ آسمان پر اُن کے فرشتے میرے آسمانی باپ کا مُنہ ہر وقت دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اِبنِ آدم کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈنے اور نجات دینے آیا ہے۔۔۔ تمہارا آسمانی باپ یہ نہیں چاہتا کہ اِن چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو'' (متی ۱۸: ۱۰۔۱۴)۔

ایک دفعہ آپ کے شاگردوں نے بچوں کو آپ کے پاس آنے سے منع کیا۔ آپ یہ دیکھ کر خفا ہوئے اور فرمایا'' بچّوں کو میرے پاس آنے دو اور اُنہیں منع نہ کرو کیونکہ خُدا کی بادشاہی ایسوں ہی کی ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ جو کوئی خُدا کی بادشاہی کو بچّے کی طرح قبول نہ کرے وہ اُس میں ہرگز داخِل نہ ہو گا'' (لوقا ۱۸: ۱۶۔۱۷)۔ آپ نے بچوں کو اپنی گود میں لیا اور ان پر ہاتھ رکھ کر برکت دی (مرقس ۱۰: ۱۶) اور فرمایا'' جو کوئی میرے نام پر ایسے بچوں میں سے ایک کو قبُول کرتا ہے وہ مجھے قبُول کرتا ہے اور جو کوئی مجھے قبُول کرتا ہے وہ مجھے نہیں بلکہ اُسے جِس نے مجھے بھیجا ہے قبُول کرتا ہے'' (مرقس ۹: ۳۷)۔ پھر آپ نے فرمایا ''جو کوئی اِن چھوٹوں میں سے جو مُجھ پر اِیمان لائے ہیں کسی کو ٹھوکر کھلاتا ہے اُس کے لئے یہ بہتر ہے کہ بڑی چکی کا پاٹ اُس کے گلے میں لٹکایا جائے اور وہ گہرے سُمندر میں ڈبودِیا جائے (متی ۱۸: ۶؛ مرقس ۹: ۴۲؛ لوقا ۱۷: ۲)۔ ان الفاظ کی تہہ میں نہایت لطیف اور عمیق معانی ہیں جو ہر شخص کے حرزِ جان (بہت عزیز سمجھنا) ہونے چاہیئں۔

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ آں خداوند نے اپنے عالم گیر اصول محبت کا اطلاق بچوں پر کیا۔ ان کی قدر و منزلت کو بنی نوع انسان پر ظاہر کر دیا، حتیٰ کہ فرمایا کہ جب تک ہم بچوں کی سی خو اور خصلت کو اختیار نہ کریں خدا کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے۔ مسیحیت کے طفیل اب دنیا کی حالت کلتیہً بدل گئی ہے اور روز بروز تبدیل ہو رہی ہے۔ ایسا کہ گزشتہ ربع صدی میں اس کی کایا پلٹ گئی ہے۔ چنانچہ شہرہ آفاق مورخ آرنلڈ ٹوئن بی (Toynbea) کہتا ہے کہ دور حاضرہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں انسانی سماج کل بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی کی تدابیر و تجاویز میں کوشاں ہے۔ مجلس اقوام متحدہ نے تو اس بار گراں کو عملی جامہ پہنانے کا ذمہ لے لیا ہے۔ اس بیسویں صدی میں اس مجلس کی بین الاقوامی جماعت یونی سف (UNICEF) نے گزشتہ اٹھارہ سال میں بین الاقوامی بچوں کا فنڈ نہایت عظیم پیمانہ پر قائم کر دیا ہے تاکہ مختلف ممالک کے چھوٹے بچے جو عسرت اور افلاس کی وجہ سے زندگی کے لوازمات سے محروم ہیں، وہ ان کی دیکھ بھال میں خرچ کیا جائے۔ اس جماعت کی شاخیں دنیا کے ممالک میں موجود ہیں جو ۴۸۵ منصوبوں اور پلانوں کے ذریعہ ان بچوں کی نگہداشت میں مصروف ہیں اور ان مختلف ممالک کے اسی کروڑ بچوں کو تنگی، بیماری، افلاس اور جہالت سے نکال کر ان کی خوراک، صحت، رہائش، تعلیم وغیرہ کا انتظام کرنے میں مصروف ہیں[2]۔

---

[1] . The Basic Writings of Bertrend Russell Denawn, England,1961.

[2] . Times of India, Dec 11,1963.

۸۔ طبقہ نسواں اور مسیحیت

(۱)

جنابِ مسیح نے اپنے عالم گیر اصول محبت، اخوت اور مساوات کا اطلاق طبقہ نسواں پر بھی کیا۔ آپ نے دنیا جہاں کو سکھایا کہ اس بدنصیب طبقہ کے ساتھ محبت و مساوات کا سلوک جائز رکھیں۔ کتاب مقدس کی یہ تعلیم ہے کہ خدا نے مرد و عورت دونوں کو اپنی صورت پر بنایا اور کلمۃ اللہ نے اپنے نمونہ سے اپنی تعلیم پر عمل کر کے دکھا دیا کہ اس طبقہ کی واجبی عزت و تکریم اور قدر کرنی چاہیئے (یوحنا۴: ۱۔۲۷)۔ جس طرح گناہ گار مردوں کو آپ خدا کی محبت اور مغفرت کی خوشخبری کا پیغام دیتے تھے، اسی طرح آپ نے گناہ گار عورتوں کو خدا کی ابدی محبت کا جاں فزا پیغام دیا اور وہ آں خداوند کے قدموں میں آکر ابدی نجات حاصل کرتی تھیں (لوقا۷: ۳۷۔۳۹؛۸: ۲، ۳)۔ یہ طبقہ آپ کے احسانات کا اس قدر شکر گزار تھا کہ عورتیں اپنی دولت خداوند کے قدموں میں نثار کر دیتیں (لوقا۸: ۲، ۳) حتیٰ کہ آپ کے آخری لمحوں میں آپ کے لئے ماتم کرتی نکلیں اور صلیب کے موقع پر کھڑی گریہ وزاری کرتی رہی تھیں (لوقا۲۳: ۲۷)۔

(۲)

کلمۃ اللہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات الٰہی انتظام اور منشا کے مطابق ہیں (متی۱۹: ۴۔۶) اور فرمایا کہ ابتدا سے خدا کی منشا یہی تھی کہ مرد ایک عورت سے ہی بیاہ کرے (مرقس۱۰: ۲۔۹)۔ آپ نے شادی کی محفل میں جا کر بیاہ کو ایک قابل قدر اور معزز شے بنا دیا (یوحنا باب ۲)۔ آپ نے کثرت ازدواج اور طلاق کو جو ایک دوسرے کے ہم دوش (برابر) ہیں، قطعی ممنوع قرار دے دیا۔ کیونکہ یہ دونوں آپ کے اصول محبت اور مساوات کے خلاف ہیں (متی۱۹: ۵، ۶) اور یوں آپ نے نفسانی خواہشات کا سد باب کر دیا (متی۱۹: ۴؛ مرقس۱۰: ۲)۔ منجی کونین کے رسولوں نے اپنے خداوند کے اصول کی روشنی میں شوہر اور زوجہ کے تعلقات کے حقوق کی مزید توضیح کی اور فرمایا اے شوہروں اپنی بیویوں سے محبت رکھو (افسیوں۵: ۲۵)۔ شوہروں کو لازم ہے کہ اپنی بیویوں سے محبت رکھیں اور ان سے تلخ مزاجی نہ کریں (کلسیوں۳: ۱۹)۔ شوہر اپنی بیوی کا حق ادا کرے اور ویسا ہی بیوی شوہر کا۔ بیوی اپنے بدن کی مختار نہیں بلکہ شوہر مختار ہے۔ اسی طرح شوہر بھی اپنے بدن کا مختار نہیں بلکہ بیوی مختار ہے (۱۔کرنتھیوں۷: ۲۔۴)۔ اگر کوئی اپنے گھرانے کی خبر گیری نہ کرے تو وہ ایمان کا منکر اور بے ایمان سے بدتر ہے (۱۔تیم۵: ۸)۔

> "اَے بِیویو! تم بھی اپنے اپنے شوہر کے تابع رہو۔ اِس لئے کہ اگر بعض اُن میں سے کلام کو نہ مانتے ہوں تَو بھی تمہارے پاکیزہ چال چلن اور خَوف کو دیکھ کر بغَیر کلام کے اپنی اپنی بِیوی کے چال چلن سے خُدا کی طرف کھِنچ جائیں۔ اور تمہارا سنگار ظاہِری نہ ہو یعنی سر گوندھنا اور سونے کے زیور اور طرح طرح کے کپڑے پہننا۔ بلکہ تمہاری باطنی اور پوشیدہ اِنسانِیّت حِلم مزاج کی غُربت کی غَیر فانی آرایش سے آراستہ رہے کیونکہ خُدا کے نزدِیک اِس کی بڑی قدر ہے۔۔۔ اَے شَوہرو! تم بھی بِیویوں کے ساتھ عقل مندی سے بسر کرو اور عَور ت کو نازک ظرف جان کر اُس کی عزت کرو اور یُوں سمجھو کہ ہم دونوں زِندگی کی نِعمت کے وارِث ہیں تاکہ تمہاری دُعائیں رُک نہ جائیں" (۱۔پطرس۳: ۱۔۷؛ کلسیوں۳: ۱۸، ۱۹)۔

(۳)

کہاں یہ انجیلی تعلیم اور کہاں دیگر مذاہب کی تعلیم کہ خالق نے سرشت سے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے۔اس کا وجود صرف نسل کی افزائش کے لئے ہے اور بذات خود وہ کوئی خود مختار ہستی نہیں رکھتی۔ وہ بچپن میں اپنے باپ کی، جوانی میں اپنے خاوند اور خسر کی اور بڑھاپے میں اپنے بیٹوں کی محکوم ہو کر زندگی گزارے۔ اگر کسی کی عورت بدخو ہو، خاوند مار پیٹ سے کام لے۔ منو (ہندوؤں کے مذہبی قانون دھرم شاستر کا مصنف) تنبیہ کر کے مردوں کو کہتے ہیں کہ جو شخص اپنا فرض ادا نہیں کرتا، وہ نئے جنم میں غلام یا حیوان یا عورت کا جنم لے گا۔انسانی معاشرت کی ابتدائی منازل میں مرد ایک عورت سے زیادہ عورتوں کو بیاہ لیتے تھے، کیونکہ دشمنوں کے مقابلہ کے لئے بھیڑ بکریاں چرانے اور کھیتی باڑی کے کام کے لئے مردوں کو زیادہ بچوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ان کا مقولہ تھا"جوانی کے فرزند ایسے ہیں جیسے زبردست کے ہاتھ میں تیر۔ خوش نصیب ہے وہ آدمی جس کا ترکش ان سے بھرا ہے (زبور ۱۲۷: ۴۔۵)۔ لیکن ذرائع معاش اور سیاسی و اقتصادی حالات کے بدلنے سے بیوی بچوں کی تعداد پر حد لگانے کی ضرورت لاحق ہو جاتی تھی۔ علاوہ ازیں زیادہ لونڈیوں اور بیویوں کی کفالت، ان کی باہمی رقابت، حسد اور سوکن کا جلاپا، آئے دن گھریلو جھگڑے، خانہ جنگیاں، وراثت کے مسئلے، مقدمے، کثرت اخراجات اور اسی قسم کی بیسیوں دقتوں سے مجبور ہو کر مرد زیادہ نکاحوں سے پرہیز کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ کثرت ازدواجی اور طلاق کی رسم کم اور ایک ہی بیوی سے عمر بھر نباہنے کی رسم ترقی کرنے لگی۔ مہذب ممالک کے قوانین اور سماج اس کی رسم کے معاون ہو گئے اور تعدد ازدواجی صرف افسوس ناک عیش پسندوں کے لئے رہ گئی۔

اہل یہود کی تاریخ میں عورتیں حکمران تھیں (قضاۃ ۴: ۴)، شاعرہ تھیں (خروج ۱۵: ۲۱)۔ حتیٰ کہ ان میں سے بعض نبیہ بھی تھیں (خروج ۱۵: ۲۰؛ میکاہ ۶: ۴؛ ۲۔سلاطین ۲۲: ۱۴؛ ۲۔تواریخ ۳۴: ۲۲؛ نحمیاہ ۶: ۱۴)۔ لیکن بایں ہمہ عورتوں کی حیثیت عام سماجی زندگی میں مردوں سے کم پایہ کی تھی۔ نکاح کا مقصد نسل کی افزائش تصور کی جاتی تھی اور اس حقیقت کو بھلا دیا گیا کہ خدا نے حوا کو اس غرض سے پیدا کیا تھا کہ وہ ہر بات میں اس کا ساتھ دے اور خدا نے دونوں کو "یک تن" قرار دیا تھا (پیدائش ۲: ۱۸، ۲۴)۔

آں خداوند کے ایام میں عورت کے باپ کو واحد اختیار حاصل تھا کہ وہ اس کے لئے خاوند کو تجویز کرے۔اس انتظام میں بیٹی کو چوں وچرا کرنے کا مطلق مجاز نہ تھا۔ کسی کاہن کے وسیلہ فریقین کا نکاح نہیں پڑھا جاتا تھا، بلکہ جب طرفین بیاہ کا انتظام کر لیتے تو دولہا اپنی دلہن کا ہاتھ پکڑ کر کہتا تھا کہ تو موسوی شریعت اور قوم اسرائیل کے رواج کے مطابق میری بیوی ہو گئی۔ منگنی اور بیاہ میں کوئی تمیز نہ تھی، بلکہ دونوں ایک ہی تھے (متی ۱: ۱۸)۔اس رسم کے بعد دولہن دولہا کے گھر چلی جاتی تھی جہاں وہ حسب توفیق ضیافت کرتا تھا (یوحنا ۲: ۱۔۲)۔اس ضیافت میں کم از کم دس مہمانوں کی موجودگی بطور گواہ لازم تھی۔آں خداوند کے زمانہ میں اہل یہود کے ربیوں نے چار بیویوں سے نکاح کرنے کی حد لگا دی تھی۔

(۴)

موسوی شریعت میں زناکاری کی ممانعت ہے (خروج ۲۰: ۱۴) اور منکوحہ زانیہ کی سزا سنگساری ہے، کیونکہ ایسی سزا خاندان کے وجود اور بقا کا تحفظ کرتی ہے۔ پس منکوحہ زانیہ کی سزا زناکار مرد سے زیادہ سخت ہے۔ زناکار منکوحہ نہ صرف اپنے خاوند سے بے وفائی کرتی ہے، بلکہ خاندان اور قوم میں ایسا بچہ لے آتی ہے جو اس کے خاوند کا نہیں ہوتا۔ایسے بچہ کی پیدائش سے خاندانی تعلقات بگڑ جاتے ہیں اور وراثت اور جائیداد پر اثر پڑتا ہے، لیکن خاوند کی بے وفائی سے یہ حالات پیدا نہیں ہوتے۔ اگر خاوند کسی کی منگیتر اور منکوحہ عورت سے زنا کرے تو وہ مستوجب سزا ہو جاتا ہے۔ ان سزاؤں کا ذکر گنتی باب ۵ اور استثنا باب ۲۲ میں مفصل طور پر پایا جاتا ہے۔ زنا بالجبر کی حالت میں صرف مرد کو سزا ملتی ہے۔ اگر کوئی مرد کسی کنواری سے زنا کرنے کے بعد اس سے نکاح کرے تو اس کا نکاح فسخ (توڑنا، منسوخ کرنا) نہیں ہو سکتا تھا۔

مرد عورت کو مختلف وجوہ کے باعث طلاق دے سکتا تھا، کیونکہ وہ اس کا مال تصور کی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ شوہر بیوی کا مال نہ تھا، پس عورت مرد کو طلاق نہیں دے سکتی تھی۔ طلاق کے قوانین و قواعد استثنا ۲۴: ۱؛ یسعیاہ ۵۰: ۱؛ یرمیاہ ۳: ۸؛ متی ۵: ۳۱ میں درج ہیں۔ مطلقہ عورت کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی تھی۔ طلاق کے بعد عموماً وہ اپنے والدین کے گھر چلی جاتی تھی۔ اگر طلاق کی وجہ زنا نہ ہوتی تو بچوں کی سپردگی عورت کو دی جاتی تھی۔ لڑکا ۶ سال کی عمر تک اور لڑکی جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے مطلقہ ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ طلاق کے وقت ہر خاوند کو زر مہر (کتوبہ) ادا کرنا پڑتا تھا اور یہ ہر مرد پر گراں گزرتا تھا۔ پس یہودی قانون اس بات کی اجازت بھی نہیں دیتا تھا کہ خاوند اپنی منکوحہ عورت کو ایک بار طلاق دے کر اس کو پھر اپنے نکاح میں بھی لے لے۔ حضرے کلمۃ اللہ نے سوائے زنا کی وجہ کے ہر دوسری حالت میں طلاق کو ممنوع فرما دیا (متی باب ۱۹، مرقس باب ۱۰، لوقا باب ۱۶) اور یہ حکم دیا کہ مرد صرف ایک ہی بیوی پر قناعت کرے (مرقس ۱۰: ۶۔۹)۔

(۵)

کلمۃ نے موسوی شرع کی ایک نئی تفسیر کی۔ موسوی شرع میں حکم تھا کہ "تو زنا نہ کرنا" (خروج ۲۰: ۱۴)، لیکن یہودی ربی اس حکم کی نرالی تفسیر کرتے تھے۔ ایسا کہ اس حکم میں اور آٹھویں حکم "تو چوری نہ کرنا" (خروج ۲۰: ۱۵) میں فرق نہ رہا تھا۔ وہ زنا کی ممانعت کی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ عورت کسی نہ کسی مرد کا مال ہوتی ہے (خروج ۲۰: ۱۷)۔ لہٰذا کسی عورت سے زنا کرنا پرائے مال پر ہاتھ ڈالنا اور پرائے شخص کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے برابر ہے۔

کلمۃ اللہ نے زنا کے حکم کو ناپاکی اور شہوت سے منسلک کیا اور فرمایا کہ اس حکم کا تعلق پرائے شخص کے مال سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی نے بری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ " اگر تیری آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اُسے نِکال کر اپنے پاس سے پھینک دے۔ کانا ہو کر زِندگی میں داخِل ہونا تیرے لئے اِس سے بہتر ہے کہ دو آنکھیں رکھتا ہُوا تُو آتش جہنّم میں ڈالا جائے" (متی ۱۸: ۹؛ مرقس ۹: ۴۷)۔ پس خداوند نے طبقہ نسواں کی حیثیت کلتیہً بدل دی۔ وہ کسی انسان کی جائیداد منقولہ کی بجائے بذات خود ایک مستقل ہستی بن گئی جو مردوں کی طرح (لوقا ۱۳: ۶) غیر فانی روح رکھتی تھی اور خدا کی فرزند ہونے کا حق رکھتی تھی (یوحنا ۱: ۱۲)۔

(۶)

کلمۃ اللہ کے زمانہ میں جنسی تعلقات کا فیصلہ مردوں کے ہاتھوں میں تھا۔ تمام روئے زمین کی عورتوں کی قسمت کی باگ ڈور مردوں کے ہاتھ میں تھی۔ دیگر مذاہب عالم یہ فرض کر لیتے تھے کہ عورت ذات کو کسی نہ کسی کے قبضے میں ہونا ضروری ہے۔ منو سمرتی کی طرح ان مذاہب کے مطابق عورت کا بچپن، عالم شباب غرضیکہ اس کی زندگی کی تمام منزلیں آدمیوں کے ہاتھوں میں تھیں اور یہ ضروری خیال کیا جاتا تھا کہ جس طرف مرد اُن کی باگ موڑیں، وہ چلیں۔ یہ کبھی کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ عورت کا وجود کسی مرد کے حبالۂ عقد (نکاح کا بندھن) میں آئے بغیر ممکن ہو سکتا ہے۔ دنیا کے تمام غیر مسیحی مذاہب یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس دنیا میں عورت کے وجود کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ کسی کی منکوحہ بیوی ہو کر اپنی زندگی بسر کرے۔ اس کی وقعت قوم اور ملک کے لیے بچے پیدا کرنے کی مشین سے زیادہ نہیں۔ مسیحیت ہی اکیلا واحد مذہب ہے جس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ عورت بغیر نکاح کے اور بغیر مال منقولہ کے متصور ہوئے اپنی زندگی عزت کے ساتھ بسر کر سکتی ہے۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ "مسیحیت کا بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک کنواری عورت مدت العمر کنواری رہ سکتی ہے"۔ کلمۃ اللہ کے طفیل عورت بذات خود ایک مستقل ہستی ہو گئی ہے۔ انسان کے جنسی تعلقات کو پورا کرنے اور اس کی شہوت کا آلہ کار نہیں رہی۔ بلکہ وہ مرد کی طرح خدا کی فرزند بن گئی ہے اور مرد کے ساتھ خدا کی بادشاہت کی ہم میراث ہو گئی ہے۔ وہ مسیح کے ساتھ روحانی رفاقت رکھنے والی ہو گئی ہے۔ مرد کے بدن کی طرح عورت

کا بدن بھی روح القدس کا مسکن بن گیا ہے (۱۔ کرنتھیوں ۶:۱۹) اور مرد اور عورت دونوں پر واجب ہو گیا ہے کہ وہ اپنے بدن سے خدا کا جلال ظاہر کریں تاکہ ان کی روح اور جان اور بدن خداوند مسیح کی آمد ثانی تک کامل طور پر بے عیب رہ کر محفوظ رہیں (۱۔ کرنتھیوں ۶:۲۰؛ ۱۔ تھسلنیکیوں ۵:۲۳)۔ پس کلمۃ اللہ کے زریں اصول کے مطابق عورت اور مرد کا درجہ مساوی اور برابر ہو گیا ہے۔ چونکہ منجی کونین مرد اور عورت دونوں کے یکساں طور پر نجات دہندہ ہیں۔ پس دونوں ایک ہی ایمان میں شریک اور ایک ہی وراثت کے ہم میراث ہو گئے ہیں (گلتیوں ۳:۲۸؛ ۱۔ پطرس ۳:۷)۔ مقدس لوقا کی انجیل اور کتاب اعمال الرسل سے ظاہر ہے کہ عورتیں کلیسیائی زندگی میں بڑا حصہ لیتی تھیں (اعمال ۱:۱۴)۔ کرنتھیوں کے نام پہلے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں محبت کی ضیافت میں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہوتی تھیں اور دعا اور نبوت میں برابر حصہ لیتی تھیں۔ وہ رسولوں کی خدمت کرنے میں مشغول رہتی تھیں اور کلیسیائی عہدوں پر بھی مامور ہوا کرتی تھیں (رومیوں ۱۶:۱؛ ۱۔ تیمتھیس ۲:۱۱؛ ۵:۳۔۱۶)۔ جرمن نقاد ہارنیک کہتا ہے کہ ''انجیل کی کتب میں سے ایک کتاب یعنی عبرانیوں کا خط ایک عورت پر سکلہ کا تحریر کیا ہوا ہے''۔ اگر یہ صحیح ہے تو ایک عورت کی زبردست تصنیف کو انجیلی مجموعہ میں شامل ہونے کا شرف ملا۔

ہم سطور بالا میں بتا آئے ہیں کہ اہل یہود کی تاریخ میں عورتیں حکمران ہو چکی تھیں (قضاۃ ۴:۴)۔ لیکن چونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر حکومت اور فضیلت حاصل ہے۔ لہٰذا از روئے شرع کوئی عورت کسی اسلامی مملکت کی سربراہ حکومت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں جب بی بی فاطمہ جناح کو پاکستان کی پریذیڈنٹ ہونے کے لئے نام زد کیا گیا تو دیوبند کے مفتی سید مہدی حسن صاحب نے لکھا کہ:

> ''شریعت کی کتابوں کی ورک گردانی اور مطالعہ مفاہیم و صراحت نصوص سے یہی ثابت ہے کہ اسلامی نظریہ کے ماتحت عورت صدر مملکت اور سربراہ سلطنت نہیں ہو سکتی۔ اس کا مردوں پر حاکم ہونا جائز نہیں۔ شرعاً عورت بااختیار حکمران نہیں ہو سکتی''۔
>
> (رسالہ الفرقان لکھنؤ، فروری ۶۵ء، صفحہ ۴)۔

۹۔ ذات پات اور درجہ بندی

منجی عالمین کے زریں اصول ہر قسم کی تفریق، درجہ بندی، ذات پات اور دیگر تمام انسانوں کی بنائی ہوئی جدائیوں اور مصنوعی امتیازات کے خلاف ہیں۔ آپ کے اصول محبت، اخوت اور مساوات جمع ہیں اور اس میں ہر قوم، ملت، ملک اور زمانہ کے ہر طبقہ کے تمام افراد یکساں طور پر شامل ہیں۔ وہ سب پر حاوی ہیں۔ کوئی فرد بشر ان سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ مقدس پولس فرماتا ہے کہ خداوند کے ان اصول کی وجہ سے اب'' نہ کوئی یہودی رہا نہ یُونانی۔ نہ کوئی غُلام نہ آزاد۔ نہ کوئی مرد نہ عَورت کیونکہ تم سب مسیح یِسُوع میں ایک ہو''(گلتیوں ۳:۲۸)۔ یعنی یہود کو اپنی برگزیدگی پر، یونانیوں کو اپنی حکمت اور خرد پر، آزاد انسانوں کو غلام رکھنے پر، فخر نہ رہا اور مرد کو عورت پر فوقیت نہ رہی۔ قومیت کی درجہ بندی، حشمت اور دولت کی درجہ بندی، جنسی درجہ بندی غرضیکہ ہر قسم کی جدائی اور درجہ بندی کا قلع قمع ہو گیا۔ سب مصنوعی امتیازات مٹ گئے اور خداوند مسیح کے حلقہ بگوش ہو کر سب ''مسیح یسوع میں ایک ہو گئے''۔

ایک دفعہ خداوند کے دوازدہ رسولوں میں یہ تکرار ہو گئی کہ ہم میں سے کون بڑا ہے۔ خداوند نے ان سے فرمایا کہ اقوام عالم کے بادشاہان پر حکومت چلاتے ہیں اور جو ان پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوندِ نعمت کہلاتے ہیں، لیکن تم ایسے نہ ہونا، بلکہ جو تم میں بڑا ہونا چاہے وہ تمہارا خادم بنے اور جو تم میں اول ہونا چاہے وہ تمہارا غلام بنے۔ میں تمہارے درمیان خدمت کرنے والے کی مانند ہوں۔ کیونکہ ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت

لے بلکہ اس لئے آیا کہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتوں کے لئے فدیہ میں دے (لوقا ۲۲: ۲۴۔۲۷؛ متی ۲۰: ۲۰۔۲۷)۔آپ نے اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے اس حکم پر خود عمل فرما کر اپنے رسولوں کو نمونہ دیا جو وہ کبھی نہ بھولے۔ چنانچہ آپ نے آخری کھانا کھانے سے پہلے ''دستر خوان سے اُٹھ کر کپڑے اُتارے اور رُومال لے کر اپنی کمر میں باندھا۔اِس کے بعد برتن میں پانی ڈال کر شاگردوں کے پاؤں دھونے اور جو رُومال کمر میں بندھا تھا اُس سے پونچھنے شروع کئے۔۔۔ جب وہ اُن کے پاؤں دھو چُکا اور اپنے کپڑے پہن کر پھر بیٹھ گیا تو اُن سے کہا کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ؟تم مجھے اُستاد اور خُداوند کہتے ہو اور خُوب کہتے ہو کیونکہ میں ہُوں۔ پس جب مجھ خُداوند اور اُستاد نے تمہارے پاؤں دھوئے تو تم پر بھی فرض ہے کہ ایک دُوسرے کے پاؤں دھویا کرو۔ کیونکہ میں نے تم کو ایک نمونہ دِکھایا ہے کہ جیسا میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے تم بھی کیا کرو۔ میں تم سے سچ کہتا ہُوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ بھیجا ہُوا اپنے بھیجنے والے سے۔اگر تم اِن باتوں کو جانتے ہو تو مُبارک ہو بشرطیکہ اُن پر عمل بھی کرو''(یوحنا۱۳: ۴۔۱۷)۔عربی زبان میں مثل مشہور ہے ''سیدالقوم خادم ہم''یعنی قوم کا امیر جماعت وہی بنتا ہے جو قوم کی خدمت کرے۔ کلمۃ اللہ نے یہ حکم دے کر اور اپنے حکم پر عمل کر کے ایک بے نظیر نمونہ دے دیا تا کہ آپ کے متبعین (متبع :اتباع کرنے والا۔ پیروی کرنے والا) یہ سمجھ لیں کہ غربا اور پس ماندگان کی خدمت ہی حقیقی عظمت اور امارت ہے۔

انجیل مقدس میں کلیسیائے جامع کا تصور افسیوں کے نام خط میں پایا جاتا ہے۔اس کا سطحی مطالعہ بھی یہ ثابت کر دیتا ہے کہ کلیسیائے جامع کا نصب العین یہی ہے کہ اس میں ہر قسم کے امتیازات کلیتہً بٹ جائیں اور کلیسیا تمام قسم کے افراد اور اقوام عالم کو اپنے اندر جمع کرے (افسیوں ۲: ۱۴۔۱۶) اسی واسطے مسیحی کلیسیا کو ''کیتھولک کلیسیا'' یا ''کلیسیائے جامع'' کہا جاتا ہے اور تمام دنیا کے مسیحی خواہ وہ کسی جماعت و فرقہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں اپنے عقیدہ میں اقرار کر کے کہتے ہیں ''میں ایک واحد کیتھولک (جامع) کلیسیا پر ایمان رکھتا ہوں''۔

۱۰۔ مسیحیت اور نئی پیدائش

کلمۃ اللہ کی تعلیم محض اخلاقیات پر ہی مشتمل نہیں اور نہ یہ تعلیم سچے اور اعلیٰ ترین اصول کا محض ایک مجموعہ ہے، بلکہ آپ کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ آپ کی تعلیم اور نمونہ سے نوع انسانی کے دل بدل جائیں (یوحنا باب ۳) تا کہ انسانوں کے جذبات و خیالات اور افعال ایسے تبدیل ہو جائیں کہ جن اشخاص کو وہ پہلے نفرت، حقارت یا عداوت کی نظر سے دیکھتے تھے، اب ان کو برادرانہ محبت سے پیار کریں اور عزت کی رو سے ان کو اپنے سے بہتر سمجھیں (رومیوں ۱۲: ۱۰؛ عبرانیوں ۳: ۱۔۵؛ ۱۔پطرس ۳: ۸؛ ۲۔پطرس ۱: ۷)۔یہی وجہ تھی کہ عوام الناس جن کو یہود کے ربی ان کی جہالت کی وجہ سے ملعون خیال کرتے تھے (یوحنا ۷: ۴۹) کلمۃ اللہ کی تعلیم اور دیگر لیڈروں کی تعلیم میں فرق پہچان سکتے تھے (مرقس ۲: ۲۲) اور آپ کی تعلیم کو سننے کے لئے دشت و بیابان میں کئی کئی دن ٹھہرے رہتے تھے اور بھوک اور پیاس کو بھول جاتے (مرقس ۸: ۲)۔ عوام الناس آپ کے کلمات طیبات کو سننے کے اس قدر مشتاق ہوتے کہ ہجوم میں کھوے سے کھوا چھلتا (کندھے سے کندھا رگڑ کھاتا تھا) تھا۔ایسے موقعوں پر آپ کشتی میں بیٹھ جاتے اور لوگ آپ کے پاس ساحل پر کھڑے گھنٹوں آپ کی تعلیم سے بہرہ ور ہوتے (مرقس ۳: ۲۰؛ ۴: ۱) اور کہتے کہ کسی دوسرے انسان کی تعلیم کے الفاظ نے ان کی زندگیوں کو ایسا متاثر نہ کیا (یوحنا ۷: ۴۶)۔

بیانے را کہ کس واقف نبا شد نکتہ پروازی

زمانے را کہ کس دانا نبا شد، ترجماں استی

کلمۃ اللہ کے پیغام کی یہ خصوصیت ہے کہ جو کسی دوسرے دین ومذہب میں نہیں کہ آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ آپ کی انجیل کے پیغام سے دنیا کی تاریخ میں ایک نیا باب کھل جائے گا اور دنیا کی کایا ایسی پلٹ جائے گی کہ وہ از سر نو پیدا ہو گی اور ہر قسم کے امتیازات، تفریق اور درجہ بندی کا استیصال ہو جائے گا۔ اس مبارک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جنابِ مسیح کی تعلیم انسان کے لئے نئے شرعی قوانین کو مرتب نہیں کرتی، بلکہ انسانی زندگی میں ایک نئی روح پھونکتی ہے۔ کلمۃ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم زندگی کو ایک نئے زاویہ سے دیکھیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک یہودی ربی آپ کے پاس آیا تاکہ آپ کی تعلیم میں کوئی نیا شرعی قانون دریافت کرے۔ آپ نے اس کو صاف فرمایا "جب تک کوئی نئے سرے سے پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا" (یوحنا۳:۳)۔ ہم پہاڑی وعظ کو سمجھ ہی نہیں سکتے تاوقتیکہ ہم خدا کی بادشاہت میں اس نئی رویا کو نہ دیکھیں۔ جو خداوند مسیح ہم کو دکھاتا ہے اور جس کو دیکھ کر انسان کی زندگی کلیتہً تبدیل ہو جاتی ہے۔ آپ نے خود فرمایا "اگر کوئی خدا کی مرضی پر چلنا چاہے تو وہ اس تعلیم کی بابت جان جائے گا" (یوحنا۷:۱۷)۔ مقدم بات یہ ہے کہ ہم اپنی ذہنیت اور زندگی کو تبدیل کریں اور اپنی مرضی پر چلنے کی بجائے خدا کی مرضی پر چلنے کا مصمم ارادہ کریں۔

۱۱۔ بیرونی افعال اور مسیحیت

کلمۃ اللہ (مسیح) کی اخلاقیات اور مذاہبِ عالم کی اخلاقیات میں نمایاں فرق یہ ہے کہ دیگر ادیان کی نگاہ انسانیت کے ظاہری اعمال وافعال پر ہے، لیکن مسیحیت کی نگاہ انسان کے باطن پر ہے۔ دیگر مذاہب کی یہ کوشش ہے کہ انسانی زندگی کے بیرونی افعال کی نگہداشت کریں تاکہ وہ اعمال صالح کرنے والے ہوں اور بداعمالیوں سے پرہیز کریں۔ یہ مذاہب شرعی احکام مثلاً خون نہ کر، چوری نہ کر، زنا نہ کر، وغیرہ صادر کرتے ہیں تاکہ انسان کے ظاہری اعمال کو قابو میں رکھیں۔ لیکن کلمۃ اللہ کی نگاہ انسان کے باطن پر ہے۔ آپ کی یہ تعلیم ہے کہ خدا ہمارے ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس کی نگاہ ہمارے باطن پر ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ انسان خون، چوری اور زنا کے ظاہری اعمال سے پرہیز کرتا ہے، لیکن اس پر بھی وہ خدا کی نظر میں ان گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ رضائے الٰہی کا تعلق صرف ظاہری اعمال کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ ہمارے دلوں کے جذبات کے ساتھ ہے۔ خدا کی مرضی تب پوری ہوتی ہے جب ہماری نیت صاف اور ہمارا باطن پاک ہو۔ اگر ہمارا دل صاف نہیں تو گو ہم ظاہری افعال کے ذریعہ چوری یا زنا وغیرہ کے مرتکب بھی نہ ہوئے ہوں، تاہم خدا کی نظر میں ہم نے ان گناہوں کا ارتکاب کر لیا۔

رضائے الٰہی کا اصلی تعلق ہمارے اندرونی خیالات، احساسات اور جذبات کے ساتھ ہے۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا "تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خُون نہ کرنا اور جو کوئی خُون کرے گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصّے ہو گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا ۔۔۔ پس اگر تُو قُربان گاہ پر اپنی نذر گزرانتا ہو اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے بھائی کو مجھ سے کچھ شکایت ہے۔ تو وہیں قربان گا ہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے اور جا کر پہلے اپنے بھائی سے مِلاپ کر تب آکر اپنی نذر گزران۔۔۔ تم سُن چُکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ زِنا نہ کرنا۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ جِس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نِگاہ کی وہ اپنے دِل میں اُس کے ساتھ زِنا کر چُکا" (متی۵:۲۱۔۲۸)۔ دیگر مذاہب گناہ کے مرض کے بیرونی آثار یعنی اعمال کو قابو میں رکھنا چاہتے ہیں، لیکن خداوند مسیح گناہ کے مرض کی تشخیص کر کے اس کے اندرونی اور پنہاں اسباب کا قلع قمع کرتے ہیں تاکہ گناہ کا مریض کلیتہً صحت یاب ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جنابِ مسیح کی نگاہ دولت پر نہیں بلکہ دولت کی محبت پر ہے اور آپ اس سے نوع انسانی کو خبردار کرتے ہیں (لوقا۱۲:۱۵)۔ آپ کی نظر زناکاری پر نہیں بلکہ بُری خواہش پر ہے جس کا آپ سدِ باب کرنا چاہتے ہیں (متی ۵:۲۸)۔ آپ کی نظر خون، قتل، جنگ اور تشدد پر نہیں بلکہ کینہ توزی (کینہ رکھنا۔ حسد کرنا) اور عداوت پر ہے، جس کا آپ

استیصال کرنا چاہتے ہیں (متی ۵: ۴۳۔۴۸)۔ جب انسان کے خیالات اور جذبات درست ہوں گے تو افعال خود بخود درست ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ انہی خیالات اور جذبات کے نتائج ہوتے ہیں۔

کلمۃ اللہ نے گناہ کی بیخ کنی کرنے کے لیے نیک اعمال اور بد افعال کے شرعی قوانین کو مرتب نہ کیا، بلکہ اعمال کے لئے ایک نیا اصول قائم کر دیا۔ جس سے دنیا ناآشنا تھی یعنی آپ نے اصولِ محبت کو وضع کیا۔ کیونکہ بالفاظ انجیل شریف ''جو دوسرے سے محبت رکھتا ہے اس نے شریعت پر پورا عمل کیا۔ کیونکہ یہ باتیں کہ زنا نہ کر، خون نہ کر، چوری نہ کر اور ان کے سوا اور جو کوئی حکم ہو ان سب کا خلاصہ اس بات میں پایا جاتا ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھو محبت اپنے پڑوسی سے بدی نہیں کرتی اس واسطے محبت شریعت کی تکمیل ہے'' (رومیوں ۱۳: ۸۔۱۰)۔ اس اصول کا تعلق قانونی نکتہ نگاہ سے نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت اور قانون صرف ظاہری اعمال اور بیرونی افعال پر ہی حاوی ہوتے ہیں۔ لیکن محبت کا اصول اعمال کے بیرونی پردہ کو چاک کر کے انسان کے اصلی ارادہ اور خفیہ رضائے پنہاں پر نگاہ کرتا ہے۔ لہٰذا وہ شریعت سے بالا اور کل روحانی زندگی پر حاوی ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔

۱۲۔ نجات اور ابدی زندگی کا مفہوم

عام طور پر نجات کے تصور کو موت کے بعد کی زندگی سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور موجودہ زندگی کو دار العمل قرار دے کر اخروی زندگی کو ہی اصلی اور حقیقی زندگی تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب رسالہ الفرقان (ربوہ) ماہ جولائی ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں (سورۂ عنکبوت کی آیت ۶۴) ''وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ'' زیر عنوان ''اسلام کا معیار نجات'' کو لکھ کر اس کا یوں ترجمہ کرتے ہیں ''یعنی آنے والی زندگی ہی حقیقی اور اصلی دائمی زندگی ہے''۔ آیت کے اقتباس کے بعد وہ لکھتے ہیں ''پس یہ دنیا تو آخرت کے لئے کھیتی ہے۔ یہ تو امتحان کی جگہ ہے۔ اس جگہ کے اعمال کا پورا ثمرہ اگلے جہان میں ملے گا۔۔۔ اسلام نے نجات کی اہلیت اور عدم اہلیت کا معیار یعنی پاس اور فیل ہونے کے لئے معیار آیات ذیل میں ذکر فرمایا ہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ۔ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۔وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (سورہ القارعہ آیات ۶۔۹) ترجمہ: ''جن لوگوں کے (نیک اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے، وہ عافیت اور خوشی کی زندگی میں داخل ہوں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے، ان کا ٹھکانا گڑھا یعنی جہنم ہوگا''۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (سورہ المومنون آیات ۱۰۲، ۱۰۳)۔

ترجمہ: ''جن کے نیک اعمال کے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ عافیت اور خوش حالی میں رہنے والے ہوں اور جن کے یہ پلڑے ہلکے ہوں گے، وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کو خسارہ میں ڈالا۔ وہ جہنم میں سدا رہنے والے ہوں گے''۔

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ (سورہ اعراف آیات ۸۔۹)۔

ترجمہ: ''اس دن وزن صحیح طور پر ہوگا جن کے تنگ اعمال والے پلڑے بھاری ہوں گے، وہ عافیت اور خوشی پائیں گے اور جن کے

پلڑے ہلکے ہوں گے، وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیات پر ظلم کر کے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈالا"۔

ان آیات کا اقتباس کر کے ایڈیٹر صاحب ان کا مطلب یوں واضح کرتے ہیں

"قرآن مجید کی ان آیات میں اعلان فرمادیا گیا ہے کہ اس دنیا کے امتحان میں پاس ہونے کا اقل معیار یہ ہے کہ انسان کی نیکیاں اسکی بدیوں سے زیادہ ہوں۔ گویا اس مقابلہ میں جو شخص سو(۱۰۰) میں سے اکیاون (۵۱) فیصد نمبر لے گا وہ کامیاب ہوگا۔ البتہ زیادہ نمبر پانے والے اعلیٰ درجات حاصل کریں گے۔۔۔۔ اسلام کا یہ معیار نجات فطرت کے عین مطابق ہے اور نہایت معقول ہے۔ اس پر ذرا سا تدبر کرنے سے اسلام کی دیگر ادیان پر فضیلت و برتری روزِ روشن کی طرح عیاں ہے"۔

(ص ۵۰۴)

مذکورہ بالا آیات اور ان کی وضاحت سے ظاہر ہے (۱) نجات کا تعلق موجودہ زندگی سے نہیں بلکہ حیات بعد الموت سے ہے (۲) یہ دنیا دار العمل ہے اور حیات بعد الممات حقیقی اصلی اور دائمی زندگی ہے (۳) ہر شخص کے نیک و بد اعمال پلڑوں وزن کئے جائیں گے جس شخص کے نیک اعمال کا پلڑا اعمال بد کے پلڑے سے زیادہ بھاری ہوگا وہی جنت میں داخل ہوگا لیکن جس شخص کے نیک اعمال بد کے پلڑے سے زیادہ بھاری ہوگا وہی جنت میں داخل ہوگا لیکن جس شخص کے نیک اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ جہنم میں داخل ہوگا (۴) نیک و بد اعمال گویا اناج کے دانوں کی طرح گنتی میں الگ الگ ہوں گے نجات یافتوں کے نیک اعمال کی تعداد کم از کم (۵۱) فیصد ہوگی اور جہنم واصل ہونے والوں کے نیک اعمال کی تعداد (۴۹) فیصد یا اس سے زیادہ کم ہوگی۔

(۲)

انجیل جلیل کی تعلیم میں نجات کا مفہوم مذکور بالا معیار اور قصور سے کلیتہً مختلف ہے۔ جیسا ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں منجی عالمین کی تعلیم کے مطابق گناہ کا تعلق نہ صرف بیرونی افعال سے ہے (جو مرض گناہ کے صرف جسمانی اور ظاہری نشان ہیں) بلکہ گناہ کا اصلی تعلق انسان کے اندرونی منشا، ارادہ اور نیت سے ہے جو اس کے اصلی محرک اور سرچشمہ ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ہمارے کردہ گناہ کم ہوتے ہیں اور ناکردہ گناہ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ انسانی نیت اور ارادہ کا تعلق انسان کی روح سے ہے جو مادی شے نہیں بلکہ باطنی جا سکتے ہیں اور نہ امتحان کے نمبروں کی طرح گنے جا سکتے ہیں اور نہ مقدار میں تولے جا سکتے ہیں کیونکہ وہ مختص بالکیفیت ہوتے ہیں۔ وہ نہ بیرونی اور ظاہری ہوتے ہیں اور نہ مادی ہوتے ہیں بلکہ باطنی نفسی اور ذہنی ہوتے ہیں اور بدی کی قلبی کیفیات نہ تو ایک دوسرے سے جدا کی جا سکتی ہیں اور نہ بھاری یا ہلکی قرار دی جا سکتی ہیں۔

بغرض محال کسی شخص کی نیکیاں (۵۱) فیصد یا زیادہ اور بدیاں (۴۹) فیصد یا کم و بیش ہوں تو کون شخص ہے جو اپنی نیکیوں پر اترا کر خدا کی قدوس نظر میں ان کا شمار و حساب کر سکتا ہے۔ حضرت داؤد خدا سے دعا کرتے ہیں "اے خداوند اپنے بندے کو عدالت میں نہ لا کیونکہ کوئی انسان جیتی جان تیری نظر میں راستباز نہیں ٹھہر سکتا" (زبور ۱۴۳: ۲)۔

"اے خداوند۔ اگر تو بداعمالیوں کا حساب کرے تو کون تیرے حضور کھڑا رہ سکے گا۔ لیکن مغفرت تیرے ہاتھ میں ہے" (زبور ۱۳۰: ۳)۔

حضرت ایوب کہتے ہیں "اگر میں گناہ کروں تو اے خداوند تو مجھ پر نگراں ہے اور مجھے بدکاری سے بری نہیں کرے گا۔ اگر میں بدی کروں تو مجھ پر افسوس۔ اگر میں صادق ہوں تو کبھی بھی اپنا سر تیرے حضور نہیں اٹھا سکتا کیونکہ میں رسوائی سے مبرا ہوں (۱۰: ۱۴۔۱۵)

(۳)

منجی عالمین فرماتے ہیں ''میں تم کو اصل حقیقت بتلاتا ہوں۔ جو کوئی گناہ کرتا ہے وہ گناہ کا غلام ہے'' (یوحنا ۸: ۳۴) گناہ کی گرفت ایک ایسی غلامی جس سے گناہ گار انسان نہ تو کسی مقام کی یاترا اور زیارت کر کے اور نہ کسی دریا کے پانی میں اشنان کر کے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ گنہگار انسان صرف خلوص دل سے خدا کی بے بہا اور بے پایاں محبت پر ایمان لانے سے اور سچی توبہ کرنے سے گناہ کی عادت پر خدا کا فضل پا کر غالب آسکتا ہے۔ ہم سب اپنے تجربہ سے جانتے ہیں کہ یہ عادت ایسی زبردست ہو سکتی ہے کہ توبہ شکنی بھی گناہ کے غلام کی عادت ہو جاتی ہے۔ ع

ہست استغفار ما محتاج استغفار

خدا باپ کی ازلی محبت اور بے پایاں رحمت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے گنہگار بندہ کو جو شیطانی خیالات و جذبات کا غلام ہو چکا ہے اپنے فضل کی قدرت کاملہ کے وسیلے قلبی توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کے سوا گناہ کا اور کوئی چارہ نہیں۔ گناہ گار اپنے گناہوں کے ہاتھ بک جاتا ہے اور اس غلامی سے ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ ہر چند کوشش کرتا ہے کہ اس سے آزاد ہو جائے، لیکن جب وہ اپنے آپ کو خدا کی محبت کے حوالے کر دیتا تو بقول مقدس پولس رسول خدا کی محبت اس کے دل میں افراط سے موجزن ہو کر (رومیوں ۵: ۱۵) اس کے اندر سچی توبہ پیدا کر دیتی ہے۔ ''جہاں گناہ زیادہ ہوا وہاں خدا کا فضل اس سے بھی نہایت زیادہ ہوا (رومیوں ۵: ۲۰)۔ جو انسان کو اطمینان اور سکون قلب بخشتا ہے (متی ۱۱: ۲۸)

چند انکہ دست وپازدم آشفتہ تر شدم
ساکن شد م ،میانہ دریا کنار شد

گناہ گار شخص کو جہنم کا خوف اور سزا کا ہول اس کی بد عادات کے پنجہ سے نہیں چُھڑاتا اور نہ چھڑا سکتا ہے۔ ہر شخص جس کا قید خانوں سے سابقہ پڑتا ہے جانتا ہے کہ سزا کا خوف مجرم کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ مجرم قید خانہ سے چھوٹ کر آگے سے زیادہ نڈر ہو جاتا ہے اور شوق سے جرم کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ علاوہ ازیں گناہوں کے بدلے سزا اور عذاب دنیا بدی کا اضافہ کرنا ہے۔ چنانچہ عمر خیام کہتا ہے۔

ناکردہ گناہ در جہان کیست ،بگو
آنکس کہ گناہ نکرد،چوں زیست بگو
من بدکنم وتوبد مکافات دہی
پس فرق میان من وتو چیست ،بگو

گناہ کے مرض کا واحد علاج خدا کی بے پایاں ازلی محبت کا احساس ہے۔ خدا کی محبت نہ صرف گنہگار کے گناہوں کو معاف کرتی ہے بلکہ اس کی روح کو اپنے چشمہ فیض سے توبہ کے آنسوؤں سے دھو کر از سر نو بے گناہ بنا دیتی ہے۔ اسی محبت کا مظہر مسیح ہے اور یہی انجیل کی خوشخبری ہے جو ہم تمام گنہگاروں کو سناتے ہیں

نامائیم بلطف حق تو لاکردہ

وز طاعت ومعصیت مبرا کردہ

آنجاکہ عنایت تو باشد ،باشد

ناکردہ چوں کردہ ،کردہ چوں ناکردہ

ہر تائب گناہ گار کا یہ تجربہ ہے کہ جہاں گناہ زیادہ ہوتا ہے وہاں خدا کی مغفرت ومحبت کا فضل نہایت فراواں ہوتا ہے (رومیوں ۵:۲۰)۔ عمر خیام کہتا ہے۔

صدسال بامتحاں گناہ خوائم کرد

با جرم من است بیش یا رحمت تو

کسی گنہگار کے دل سے سزا کی ہیبت اور عقوبت کی دہشت گناہ کی بیخ کنی نہ کر سکی اور نہ کر سکتی ہے۔ صرف خدا کی ازلی محبت جس کا ظہور ابن اللہ کی زندگی اور موت میں ہوا اس کے دل میں سچی توبہ پیدا کر سکتی ہے اور دو ہزار سال سے کرتی چلی آئی ہے (اعمال ۴:۱۲؛لوقا ۹:۵۶؛یوحنا ۳:۱۶)۔

جیسا انجیل میں بار بار ذکر آیا ہے کہ خدا کی ذات گنہگار کی طرف پیش قدمی کرتی ہے جس کے فضل سے گنہگار کو یہ توفیق حاصل ہوتی ہے کہ گناہ پر غالب آئے۔ لیکن ہر حالت میں پہل ہمیشہ خدا کی محبت کرتی ہے۔

بوئے گل خود بہ چمن راہ نما شدزنخست

ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزار ے ہست

انجیل کی تعلیم کے مطابق نجات کا مطلب کسی دوسرے جہاں میں عیش وآرام میں رہنا نہیں ہے۔ بلکہ نجات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اسی جہاں میں گناہ سے مخلصی اور گناہ کی نیت اور ارادہ کی غلامی کے پنجے سے چھٹکارہ حاصل کرنا اور گناہ کی عادت سے رہائی پاتا ہے۔ نجات یافتہ لوگ وہ ہیں جو اسی دنیا میں گناہ اور شیطان کی غلامی سے آزاد ہو کر خدا کی قربت وفرزندیت اور پدرانہ محبت میں قائم رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں (لوقا ۱۹:۹؛ طیطس ۲:۱۲؛یوحنا ۱:۱۲،۱۳؛۸:۳۴وغیرہ)۔

حضرت کلمۃ اللہ اور آپ کی انجیل کے مطابق نیک زندگی خود ابدی زندگی ہے جو زمان ومکان کی قیود سے بلند وبالا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا ''میں تم سے ایک حق بات کہتا ہوں کہ جو میرا کلام سنتا اور میرے بھیجنے والے کا یقین کرتا ہے۔ ہمیشہ کی زندگی اس کی ہے اور وہ موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہو گیا ہے (یوحنا ۵:۲۴) ہم جانتے ہیں کہ ہم موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہو گئے ہیں کیونکہ ہم بھائیوں (نوع انسانی) سے محبت رکھتے ہیں''۔ (۱۔یوحنا ۳:۱۴) نیکی کی زندگی خود ابدی زندگی ہے۔ اس کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ جسمانی موت نئی زندگی کی ابتدا ہے جس سے موجودہ جسم میں تغیر اور تبدیلی وقوع میں آئی ہے اور یہ تبدیلی ایک بہتر زندگی کی پیش خیمہ ہے۔ ابدی زندگی کو فنا نہیں کیونکہ وہ غیر فانی ہے اور جسمانی موت اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ اس ابدی زندگی کو جس میں ہم گناہ کی موت سے نکل کر اسی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں دائمی بقا حاصل ہے کیونکہ خدا کی معرفت اور اس کی محبت کا عرفان ہی ابدی زندگی ہے (یوحنا ۱۷:۲،۳وغیرہ)

(۴)

ہم سطور بالا میں کہہ چکے ہیں کہ جسمانی موت سے محض ایک تبدیلی وقوع میں آتی ہے۔ جس طرح آنخداوند کا فانی جسم آپ کی صلیبی موت کے بعد روحانی اور غیر فانی ہو گیا تھا اسی طرح ہمارا بدن بھی روحانی ہو جائے گا (۱۔ کرنتھیوں ۱۵ باب)۔ ہمارے جسم ہماری روح کے اظہار کا وسیلہ اور ہماری شخصیت کے مظہر ہیں۔ جسم کی رفتار گفتار، نشست و برخاست، افعال و کردار وعادات وغیرہ کے ذریعے سب لوگوں پر ہماری خصلت وخو آشکارا ہو جاتی ہے۔ انسانی روح اس کے خیالات وجذبات اور احساسات وغیرہ کے مطابق انسانی اعضا اور جسم کو ایک خاص ڈھانچہ اور شکل میں ڈھالتی ہے جو ہمارے اس خاک کے پتلے کو بدل دیتے ہیں اور جس سے ہم ایک فرد کو دوسرے سے پہچان لیتے ہیں اور بعض اوقات کسی انسان کو دیکھ کر ہی ہم اس سے محبت یا نفرت کرنے لگتے ہیں کیونکہ اس کی شکل سے ہم اس کے باطن کو جان لیتے ہیں۔

بدن کی قیامت کا مطلب یہ ہے کہ حیات بعد از ممات میں ہر شخص کی شخصیت کی انفرادیت سالم و قائم رہے گی گو اس کا بدن بدل جائے گا اور ہمارے اس بن کے اعضا روحانی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدل کر غیر فانی ہوتے چلے جائیں گے اور قربت الٰہی کے باعث ہمارے ''بدن'' بالآخر خداوند مسیح کے ''بدن'' کی مانند جلالی ہوتے چلے جائیں گے (مرقس ۹: ۲۔۴؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۵ باب) بالفاظ انجیل ''جب ہم سب کے بے نقاب چہروں سے خداوند کا جلال اس طرح منعکس ہوتا ہے جس طرح آئینہ میں تو اس خداوند کے وسیلہ سے جو روح ہے ہم اس جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں (۲۔ کرنتھیوں ۳:۱۸)۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب ''توضیح العقائد'' میں مفصل بحث کی ہے۔

(۵)

ہمارے بعض ہندو برادراں گناہ کی مغفرت کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ گنگا جمنا وغیرہ دریاؤں کے پانی میں اشنان کرنے سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ لیکن گناہ بیرونی اور ظاہری شے نہیں بلکہ باطنی ہے۔ اگر کوئی دھوبی میلے کپڑوں کو ایک صندوق میں بند کر دے اور صندوق کو باہر سے خوب دھوئے تو صندوق دھل کر صاف ہو جائے گا۔ لیکن اس کے اندر کے کپڑے ویسے کے ویسے میلے رہیں گے گنگا کے پانی سے پاپی کا جسم صاف ہو جائے تو ہو جائے، لیکن اس کا دل حسب سابق ناپاک اور نجس ہی رہے گا۔ انسان کا دل خدا کا مسکن ہے اور مقدس ہے۔ جس کو گناہ ناپاک اور تباہ کر دیتا ہے۔ (۱۔ کرنتھیوں ۳:۱۶) وہ سچی توبہ کے آنسوؤں اور خدا کی باران مغفرت ہی سے دھل سکتا ہے (زبور ۵۱: ۱۔۱۷)۔

منکا پھیرت جنم گیا پر گیا نہ من کا پھیر
کرکا منکا ڈال دے تو من کا منکا پھیر

۱۳۔ مسیحیت کی تعلیم قابل عمل ہے

(۱)

کلمۃ اللہ کے اصول بلند اور ارفع ہونے میں کسی مخالف کو چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ موالف و مخالف دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ مسیحیت کی اخلاقیات کے اصول اعلیٰ اور افضل ہیں۔ اس حقیقت کے قبول کرنے کے باوجود بعض مخالفین ان اصول کے اعلیٰ ہونے کی بنا پر ان کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔ مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ پہاڑی وعظ کی تعلیم ہمارے روز مرہ کے خیال سے اتنی بالا ہے کہ وہ ناقابل عمل ہے۔ مسیحیت کے اصول ایسے بلند پایہ کے ہیں کہ انسانی فطرت ان پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی۔ لیکن کیا گالی کھا کر گالی نہ دینا ناقابل عمل ہے۔ ہاں اس کے لئے بڑا دل اور گردہ درکار

ہے(۱۔پطرس ۲:۲۱۔۲۳)۔ہم نے اس مضمون پر ایک مبسوط رسالہ[1] ''دینِ فطرت اسلام یا مسیحیت؟'' لکھا ہے پس ناظرین کی توجہ اس رسالہ کی جانب مبذول کرتے ہیں۔اس کتاب میں ہم نے علم نفسیات کی رو سے یہ ثابت کیا ہے کہ مسیحیت میں انسانی فطرت کے تمام اقتضا بدرجہ احسن پورے ہوتے ہیں۔

(۲)

الفاظ ''قابل عمل'' کا کیا مطلب ہے۔تمام غیر مسیحی مذاہب انسان کے صرف بیرونی افعال پر قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اس نقطہ نگاہ سے ان مذاہب کے قوانین اور کسی مہذب ملک کے ملکی اور سیاسی قوانین میں کوئی فرق نہیں۔دونوں کا مقصد واحد ہے۔کیونکہ ان قوانین کی تہ میں یہ قیاس ہوتا ہے کہ عامتہ الناس سے فلاں حالات کے ماتحت فلاں موقع پر فلاں قسم کے افعال عموماً سرزد ہوتے ہیں یا ہوں گے اور قانون سازوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایسے قوانین وضع کئے جائیں جن پر لوگ آسانی سے عمل کر سکیں۔بقول شخصے:

ع مصلحت ہیں وکار آسان کن۔

مثلاً ایک مذہب یہ کھلی اجازت دیتا ہے کہ مرد جتنی بیویاں چاہے، کرے اور اس کو ''قابل عمل'' خیال کرے۔دوسرا مذہب بیویوں کی تعداد پر قید لگاتا ہے اور تیسرا مذہب اس کو ''ناقابل عمل'' خیال کر کے صرف چار بیویوں کی بیک وقت اجازت دے دیتا ہے اور اس کو قابل عمل خیال کرتا ہے ۔ایک مذہب چوری یا ڈاکا کی کھلی اجازت دیتا ہے۔دوسرا خاص حالات کے اندر پرائے مال کو حلال قرار دے دیتا ہے اور اس کو ''قابل عمل'' خیال کرتا ہے۔یہ مذاہب اپنے اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کے خاص حالات کو مد نظر رکھ کر کسی فعل کی کھلی اجازت دے دیتے ہیں اور کسی کی خاص حالات کے اندر اجازت دیتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ کسی فعل سے لوگ آسانی سے باز آسکتے ہیں تو اس کو ممنوع قرار دے دیتے ہیں۔لیکن ایسے مذاہب بعض اقوام کے خاص عارضی حالات اور وقتی ضروریات کو ہی پورا کرتے ہیں۔لیکن وہ ان خاص ممالک واقوام کے عارضی حالات اور ضروریات کے باہر کسی مصرف (کام۔خرچ کرنے کی جگہ) کے نہیں ہوتے۔لہٰذا ان میں عالم گیر ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

(۳)

جیسا ہم سطور بالا میں ذکر کر چکے ہیں کہ خداوند مسیح نے کوئی شرعی احکام صادر نہ کئے، بلکہ نوع انسانی کو ایک نیا مکاشفہ عطا کیا (جس کا تعلق کسی خاص ملک، قوم یا زمانہ کے ساتھ نہیں) تاکہ نوع انسانی کی تاریخ میں ایک نیا باب کھل جائے اور خلق خدا نئی زندگی بسر کرے۔چونکہ اس مکاشفہ کا تعلق انسانی نوع کے ساتھ ہے۔لہٰذا اس مکاشفہ کے اصول زمان ومکان کی قیود سے آزاد اور ہمہ گیر اوصاف رکھتے ہیں۔کلمتہ اللہ (مسیح) نے نوع انسانی کے آگے یہ نصب العین رکھا کہ ''چاہیئے کہ تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے'' (متی ۵:۴۸)۔مسیح چاہتے ہیں کہ ہماری زندگیاں ایک نئی طرز اختیار کریں۔ہم از سر نو پیدا ہوں تاکہ نوع انسانی کاملیت کے نصب العین کو پیش نظر رکھ کر ترقی کرتی چلی جائے۔تاریخ عالم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسیح کے پہاڑی وعظ کے اصول نہ صرف قابل عمل ہیں، یہ بھی کہ اگر ان پر عمل نہ کیا جائے تو نوع انسانی پر ترقی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔یہ بات بھی صرف افراد پر بلکہ گروہوں اور قوموں کی زندگی پر بھی صادق آتی ہے کہ اگر بدی کا مقابلہ نہ کیا جائے اور بدی کا جواب نیکی ہو تو یہ پروگرام افراد اور اقوام کی زندگی اور بقا کا موجب ہوتا ہے۔لیکن اگر بدی کا جواب بدی سے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے تو یہ لائحہ عمل افراد اور اقوام کے فنا کا موجب ہو جاتا ہے۔

---

[1] ۔یہ کتاب پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، انارکلی، لاہور سے مل سکتی ہے۔(برکت اللہ)

خود برصغیر ہندوستان کی موجودہ صدی کی تاریخ پر نگاہ کرو تو اس صداقت کی اعلیٰ مثال پاؤ گے۔ بیسویں صدی کے شروع میں بنگال کے نوجوان قوم پرستوں نے انگلستان کی سخت گیر پالیسی کا جواب بم سازی اور دہشت انگیزی سے دینا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ رولٹ ایکٹ ہوا۔ شمالی ہند کے نوجوانوں کی طرف سے اس ایکٹ کا جواب تشدد کی صورت میں دیا گیا، جس کا نتیجہ پنجاب میں مارشل لا کی صورت میں نمودار ہوا۔ بیسیوں گھر تباہ ہو گئے اور ہزاروں کی جان و مال کا نقصان ہوا۔ اس تشدد کے علت و معلول سے ہندوستان کی قوم کا شیرازہ بکھر گیا۔

ع شامتِ اعمالِ ماصورتِ نادِر گرفت [1]

ہندوستان کے طول و عرض میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن مسٹر گاندھی مرحوم کی سرکردگی میں تشدد کا جواب عدم تشدد سے دیا گیا۔ صبر کرنے اور تحمل، ضبط اور بردباری کو کام میں لانے کی تلقین کی گئی۔ پنجاب میں سکھوں کی جری اور شجاع قوم نے گورو کے باغ امرتسر میں عدم تشدد پر عمل پیرا ہو کر ایسا نظارہ دکھا دیا کہ دنیا وَرطہ حیرت میں پڑ گئی۔ مسلمانوں نے اپنے اصول قصاص وغیرہ کو خیر باد کہہ دیا اور مرحوم مولانا محمد علی نے کانگریس کے اجلاس میں اپنے خطبہ میں انجیل جلیل کی آیت کا اقتباس کر کے تمام ملک کو یہی درس دیا کہ بدی کا مقابلہ نہ کرو۔ جو تم کو ایک گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرے کو بھی اس کی طرف پھیر دو۔ مرحوم مولانا ظفر علی خان نے بھی اپنے اخبار زمیندار کے ذریعہ یہی سبق اہل اسلام کو سکھا دیا کہ ''محکوموں کے پاس ضبط و انضباط کے ساتھ ایثار و قربانی کی متحدہ طاقت کا مظاہرہ ہی ایک چیز ہے جس کے آگے بڑی سے بڑی جاہ و جلال اور غرور و نخوت والی حکومت گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور نیاز مندانہ دست بستہ محکوموں کے آگے کھڑی ہو کر ان کی آرزوؤں کو پورا کرنا تخت و تاج کی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہے (۱۷۔ نومبر ۱۹۲۹ء)۔ مسٹر گاندھی کے پیش کردہ لائحہ عمل کا نتیجہ آج ہم کو نظر آرہا ہے۔ ہمارے ملک کی محکوم قوم نے عدم تشدد کو اختیار کر کے بقا اور زندگی حاصل کی اور آج خود مختار ہو کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے۔ ہماری اپنی قوم کے بچوں، جوانوں اور عورتوں نے اس اعتراض کا منہ بند کر دیا ہے کہ مسیحیت ناقابل عمل ہے اور یہ سبق سکھا دیا ہے کہ کلمۃ اللہ کے اصول کے سوا افراد اور اقوام کے لئے زندگی کی اور کوئی راہ ہے ہی نہیں۔ جنابِ مسیح نے سچ کہا تھا کہ ''بچوں اور شیر خواروں کے منہ سے خدا نے اپنی حمد کرائی'' (متی ۱۱:۲۵)۔ ہمارے ملک کے نونہالوں نے کل عالم و عالمیان پر ثابت کر دیا ہے کہ عدم تشدد کو اختیار کر کے نہ صرف افراد اور گروہ بلکہ دنیا کے کل ممالک اور اقوام بھی تشدد اور جنگ و جدل پر غالب آسکتی ہیں۔

(۴)

اس سلسلہ میں مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن یوں رقم طراز ہیں:

''حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی ظاہر پرستیوں اور اخلاقی محرومیوں کی جگہ رحم اور محبت، عفو اور بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا اور ان کی دعوت کی اصلی روح یہی ہے''۔

چنانچہ ہم انجیل مقدس کے مواعظ میں جابجا اس طرح کے خطابات پاتے ہیں'' تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں (خداوند یسوع مسیح) تم سے یہ کہتا ہُوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دُوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے'' (متی ۵:۳۸،۳۹)۔ افسوس ہے کہ نکتہ چینوں نے یہاں ایسی ٹھوکر کھائی اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ یہ ناقابل عمل احکام ہیں۔ لیکن فی الحقیقت یہ بڑی ہی دردانگیز ناانصافی ہے جو تاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان معلم کے

---

[1] ۔ یہ ایک فارسی مثل ہے۔ اس کا مطلب یوں بیان کیا جاتا ہے ''ہمارے گناہوں کی سزا نے نادر کی صورت اختیار کی۔ یہ مصرع نظام الملک نے اس وقت کہا تھا جب نادر شاہ کے ظلم و ستم نے دہلی میں قیامت برپا کی تھی۔

ساتھ جائز رکھی گئی ہے۔ خداوند مسیح کی تعلیم کو فطرت انسانی کے خلاف سمجھنا تفریق بین الرسل ہے۔ کیا کوئی انسان جو قرآن کی سچائی کا معترف ہو ایسا خیال کر سکتا ہے کہ خداوند مسیح کی تعلیم فطرت انسانی کے خلاف تھی اور اس لئے ناقابل عمل تھی؟

حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کی تصدیق کے ساتھ ایسا منکرانہ خیال جمع نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لئے اس کو تسلیم کر لیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم خداوند یسوع مسیح کی تعلیم کی سچائی اور ان کی رسالت سے انکار کر دیں۔ کیونکہ جو تعلیم اور فطرت انسانی کے خلاف ہو وہ نہ تو سچی ہو سکتی ہے اور نہ کسی خدا کے فرستادہ پیغمبر کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسا اعتقاد نہ صرف قرآن کے خلاف ہے بلکہ اس کی دعوت کی اصلی بنیاد ہی متزلزل ہو جاتی ہے۔ قرآن کی دعوت کی بنیادی اصل یہ ہے کہ تمام راہ نماؤں کی یکساں طور تصدیق کرتا ہے۔ اور سب کو خدا کی ایک ہی سچائی کا پیامبر قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیروان مذہب کی سب سے بری گمراہی ''تفریق بین الرسل'' ہے یعنی ایمان اور تصدیق کے لحاظ سے خدا کے رسولوں میں تفریق کرنا۔ کسی ایک کو ماننا اور دوسروں کو جھٹلانا۔ یا سب کو ماننا کسی ایک کا انکار کر دینا۔ اسی لئے جابجا اسلام کی راہ یہ بتائی ہے کہ **لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ** یعنی ''ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) ہم تو خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں (اس کی سچائی کہیں سے بھی آئی ہو اور کسی کی زبانی آئی ہو۔ ہمارا اس پر ایمان ہے) (سورہ آل عمران ۳:۸۴)۔

علاوہ بریں خود قرآن کریم نے جنابِ مسیح کی دعوت کا یہی پہلو جابجا نمایاں کیا ہے کہ وہ رحمت اور محبت کے پیامبر تھے اور یہودیوں کی اخلاقی خشونت (دشمنی۔ نفرت) وخساوت کے مقابلہ میں مسیحی اخلاق کی رقت (نرمی۔ رحم) اور رفعت (بلندی۔ شان) کی بار بار مدح ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو: **لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا** ''تاکہ ہم اس کو (مسیح کے ظہور کو) لوگوں کے لئے ایک الٰہی نشانی اور اپنی رحمت کا فیضان بنائیں اور یہ بات (مشیت الٰہی میں) طے شدہ تھی'' (سورہ مریم ۱۹:۲۱)۔ پھر لکھا ہے **وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً** ''ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں مسیح کی پیروی کی ہے شفقت، نرمی اور رحمت ڈال دی'' (سورہ الحدید ۵۷:۲۷)۔ اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن نے جس قدر اوصاف خود اپنی نسبت بیان کئے ہیں، وہی اوصاف بار بار تاکید کے ساتھ توراۃ وانجیل کے لئے بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً جس طرح وہ اپنے آپ کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا، نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا راہ نما قرار دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پچھلے صحیفوں کو بھی ان تمام اوصاف سے متصف قرار دیتا ہے۔ چنانچہ انجیل کی نسبت ہم جابجا پڑھتے ہیں **وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ** (سورہ مائدہ ۵:۴۶)۔ یہ ظاہر کہ جو تعلیم فطرت بشری کے خلاف ہو اور ناقابل عمل ہو، وہ کبھی ''نور اور ہدایت'' نہیں ہو سکتی۔

ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مرحوم مسٹر گاندھی کا اصول عدم تشدد اثباتی کا اصول نہ تھا، بلکہ محض ایک منفی اصول تھا۔ لہٰذا اس اصول میں جنابِ مسیح کے اصول محبت کی صرف ایک ادنیٰ جھلک پائی جاتی ہے۔ گاندھی جی روس کے مرحوم ٹالسٹای (Count Tolstoy) کی تعلیم سے متاثر تھے، جو یہ چاہتا تھا کہ جنابِ مسیح کے اس اصول محبت پر عمل کرے جو آپ کے ''پہاڑی وعظ'' میں درج ہے۔ مسٹر گاندھی نے کلمۃ اللہ کے اصول محبت کے منفی پہلو عدم تشدد پر ہی زور دیا اور دنیا کو یہی تعلیم دی کہ شریر کا مقابلہ بدی سے نہ کرو۔ لیکن کلمۃ اللہ کی تعلیم صرف اس منفی پہلو پر ہی قناعت نہیں کرتی، بلکہ یہ حکم دیتی ہے کہ نہ صرف ہم بدی کا مقابلہ بدی سے نہ کریں، بلکہ نیکی کے ذریعہ سے بدی

پر غالب آئیں۔ چنانچہ خداوند نے فرمایا ہے "اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو جو تم سے عداوت رکھیں ان کا بھلا کرو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لئے دعائے خیر مانگو اور جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو"(متی ۵: ۴۴؛لوقا ۶: ۲۷)۔ "اپنا انتقام نہ لو۔ اگر تیرا دشمن بھوکا ہو تو اس کو کھانا کھلا، اگر پیاسا ہو تو اسے پانی پلا، کیونکہ ایسا کرنے سے تو اس کے سر پر آگ کے انگاروں کا ڈھیر لگائے گا۔ بدی سے مغلوب نہ ہو، بلکہ نیکی کے ذریعہ سے بدی پر غالب آؤ"(رومیوں ۱۲: ۱۹)۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر منفی پہلو میں اس قدر طاقت ہے جو دور حاضرہ کی تاریخ اور ہمارے اپنے ملک کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ عدم تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہو کر ہی افراد اور اقوام ترقی کر سکتی ہیں تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اگر کلمتہ اللہ کے اصولِ محبت کے مثبت پہلو پر عمل کیا جائے تو دنیا کس قدر ترقی کر جائے گی ایسا کہ عالم وعالمیان کی کایا پلٹ جائے گی۔ اگر ظلم وتعدی کا جواب نہ صرف عدم تشدد سے دیا جائے، بلکہ ظالم کے لئے صدق قلب سے دعا مانگی جائے اور اس سے ایسی محبت رکھی جائے، جیسی مظلوم اپنے آپ سے محبت رکھتا ہے اور ظالم سے ایسا سلوک کیا جائے، جیسا مظلوم چاہتا ہے کہ ظالم اس کے ساتھ روا رکھے، تو یہ رویہ ظالم کے لئے توبہ کا دروازہ کھول دیتا ہے اور مظلوم کے سینہ میں انتقام کے جذبہ کی بجائے محبت کی آگ شعلہ زن ہو جاتی ہے، جو ظالم کے دل کو کلیتہً تبدیل کر دیتی ہے۔ یوں ظالم ومظلوم کے درمیان عداوت کے رشتہ کی بجائے آشتی، صلح، میل ملاپ اور محبت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔

وفا کنیم وملامت کشیم وخوش باشیم

کہ در طریقتِ ماہ کافری ست رنجیدن

(۵)

پس افراد واقوام کے باہمی میل ملاپ، صلح اور امن کا ایک ہی واحد طریقہ ہے جو کلمتہ اللہ کے اصولِ محبت میں موجود ہے اور جس پر عمل کر کے نوع انسان ترقی کر سکتی ہے۔ ہمارے ملک اور دنیا کی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ مسیحی اصولِ محبت پر ایک بڑے اور وسیع پیمانہ پر عمل ہو سکتا ہے۔۔ تاریخ نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اگر کلمتہ اللہ کے اصول پر عمل نہ کیا جائے تو نوع انسانی کو رسوائی، ذلت اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ نوع انسانی کا تجربہ اس بات کو ثابت کر دیتا ہے کہ مذہب اور فلسفہ دونوں میں جنابِ مسیح کا نصب العین ہی فاتح ہے۔ کیونکہ خدا سے اور انسان سے محبت رکھنے سے بڑا کوئی اور نصب العین ہو ہی نہیں سکتا اور مسیحی اخلاقیات کا انحصار انہی دو اصولوں پر ہے۔ اخلاقیات کا استاد جان سٹوارٹ مل(J.S.Mill) مسیحی نہیں تھا، لیکن وہ بھی اقرار کرتا ہے کہ :

> "ایک منکر مسیحیت کے لئے یہ ایک ناممکن امر ہے کہ عملی زندگی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور قانون وضع کر سکے۔ ہم اپنی زندگیوں کو اس طور پر بسر کریں کہ مسیح ہمارے طرز زندگی کو وضع (پسند) کرے"۔

یہودی عالم مونٹی فیوری مرحوم(Montifiori) کہتا ہے:

> "مستقبل میں ایسا زمانہ قیاس میں بھی نہیں آسکتا، جب مسیح کی شخصیت درخشاں ستارے کی مانند نہ چمکے گی"۔

یروشلیم کا موجودہ یہودی ربی ڈاکٹر جوزف کلاسنر(Klausner) کہتا ہے کہ :

> "یسوع مسیح کی اخلاقی تعلیم تمام زمانوں کے لئے ایک نہایت بیش بہا موتی ہے"[1]۔

مرحوم جارج برنارڈ شاہ(G.B.Shaw) جیسا شخص بھی یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ :

---

[1]. Quoted in John's Finality of Christ, p.94.

''گزشتہ جنگ عظیم سے صرف ایک ہی شخص ہے جو عزت اور شان سے بچ نکلا ہے اور وہ یسوع مسیح ہے''[1]۔

دورِ حاضرہ میں تمام اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی امور کلمۃ اللہ کے معیار سے ہی پرکھے جاتے ہیں۔ پروفیسر سکاٹ (Prof.Scot) بجا کہتا ہے کہ:

> ''آج جب ہم دنیا کی حالت پر نظر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف یسوع مسیح ہی نوع انسانی کا واحد اخلاقی لیڈر ہے۔ گزشتہ چند سالوں کے تلخ تجربہ کی کسوٹی پر مسیح کے اصول پورے اترے ہیں۔ تمام ارباب دانش اس بات پر متفق ہیں کہ مستقبل زمانہ میں انسانی معاشرت کی عمارت اس ایک بنیاد کے علاوہ کسی اور بنیاد پر رکھی نہیں جاسکتی''۔

پس مخالف و موالف دونوں اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ دنیا کی تمام مشکلات کا حل اسی میں ہے کہ کلمۃ اللہ کے اصول محبت پر عمل کیا جائے۔ مخالفین مسیحیت جو اس کی تعلیم کو ناقابل عمل ثابت کرنے کے خواہاں ہیں، کم از کم یہ اقرار تو ضرور کریں گے کہ اگر کلمۃ اللہ کے اصول اور پہاڑی وعظ پر عمل کیا جائے تو یہ دنیا نوع انسانی کے رہنے کے لئے زیادہ بہتر جگہ ہو جائے گی۔ تاریخ اس صداقت پر مہر کر کے بتا دیتی ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں اس تعلیم پر عمل کیا گیا یہ دنیا جنت الفردوس کا نمونہ بن گئی۔

۱۴۔ مسیحی تعلیم کی جِدت

کلمۃ اللہ کی تعلیم کے اصولوں کے مطالعہ سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ آپ کی تعلیم عالم گیر ہے۔ اس تعلیم کے اصول کلمۃ اللہ کی جِدت طبع کا نتیجہ تھے۔ جب ہم دیگر مذاہب کے انبیا کی تعلیم کے اصولوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان مذاہب میں غالب اصول (عنصر) ایسا ہے جو ان انبیا کے گرد و پیش کے ماحول اور ان کے قومی مذہب کے اصول پر مشتمل ہے، جن میں وہ اصلاح کرتے ہیں۔ مثلاً اسلامی تعلیم کے ماخذ عرب کے مذاہب، مسیحی اور یہودی عقائد اور زرتشتی اور زمانہ جاہلیت کی رسوم ہیں۔ ان کی تفاصیل رسالہ ''ینابیع الاسلام'' اور ''ماخذ القرآن[2]'' میں موجود ہیں۔ حضرت محمد نے ان عقائد اور رسوم کی اصلاح کی اور اس کا نام اسلام رکھا۔ لیکن کلمۃ اللہ نے محض عہدِ عتیق کی تعلیم اور یہودیت کے عقائد کی اصلاح نہیں کی۔ آپ کی تعلیم میں اور عہد عتیق کی تعلیم میں درحقیقت کوئی نسبت ہے ہی نہیں۔ آپ صاحب اختیار کی طرح فرماتے تھے ''تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا۔۔۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں''۔ آپ کے خیالات یہودی نظام اور یہودیت کے عین ضد تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل یہود نے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ آپ کے خلاف سازش کریں اور آپ کو مصلوب کروادیں۔ اخلاقیات کا مورخ لیکی (جو مسیحی نہیں تھا) کہتا ہے:

> ''یقیناً اس خیال سے زیادہ غلط کوئی اور دوسرا خیال نہیں کہ مسیحیت کی تعلیم کے اخلاقی عناصر میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ مسیحیت کی تعلیم اور دیگر مذاہب کی تعلیم میں ایسا بین فرق ہے کہ دونوں درحقیقت مختلف اقسام کی تعلیم ہیں اور ایک ہی نوع کے ماتحت نہیں کی جاسکتیں''۔

کلمۃ اللہ کی زندگی کے پہلے تیس سال ملکِ کنعان جیسی تہذیب سے دور افتادہ ملک کے ایک صوبہ میں گزرے جو جہالت کی وجہ سے حقیر شمار کیا جاتا تھا (یوحنا ۱:۴۶؛ ۷:۴۱، ۵۲)۔ آپ نے کسی فلاسفر کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہ کیا۔ آپ کے سامعین آپ کی تعلیم کو سن کر حیران رہ جاتے تھے (مرقس ۱:۲۲؛ ۱۱:۱۸؛ متی ۲۲:۲۲) اور کہتے تھے ''۔۔۔ اِس میں یہ حِکمت اور معجزے کہاں سے آئے؟ کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور

---

[1]. Praface to Androcles and the lion by G.B. Shaw.

[2]۔ رسالہ ماخذ القرآن علامہ نیاز فتح پوری نے شائع کیا ہے۔

اِس کی ماں کا نام مریم اوراِس کے بھائی یعقوب اور یُوسُف اور شمعُون اور یہوداہ نہیں ؟اور کیااِس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں ؟ پھر یہ سب کچھ اِس میں کہاں سے آیا ؟''(متی ۱۳: ۵۴-۵۶)۔یہ باتیں اس کو کہاں سے آ گئیں اور یہ کیا حکمت ہے جو اسے بخشی گئی ہے ؟(مرقس ۶: ۲؛ لوقا۴: ۳۶)۔اس کا کلام اختیار کے ساتھ ہے (لوقا۴: ۳۲)۔جب اہل یہود نے آپ کی تعلیم پر تعجب کیااور کہا کہ ''اس کو بغیر پڑھے کیونکہ علم آگیا ؟''توکلمتہ اللہ نے ان کواپنے علم کے منبع اور سرچشمہ سے مطلع کر کے فرمایا''میری تعلیم میری نہیں، بلکہ میرے بھیجنے والے کی ہے۔اگر کوئی اس کی مرضی پر چلنا چاہے تو وہ اس تعلیم کی بابت جان جائے گا کہ خدا کی طرف سے ہے یا میں اپنی طرف سے کہتاہوں''(یوحنا۷: ۱۶)۔''۔۔۔ میں وُہی ہُوں اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا بلکہ جِس طرح باپ نے مجھے سکھایااُسی طرح یہ باتیں کہتاہُوں۔اور جِس نے مجھے بھیجاوہ میرے ساتھ ہے۔اُس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وُہی کام کرتاہُوں جو اُسے پسند آتے ہیں''(یوحنا۸: ۲۸، ۲۹)۔''کیونکہ میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ باپ جِس نے مجھے بھیجا اُسی نے مجھ کو حکم دِیا ہے کہ کیا کہوں اور کیا بولوں۔۔۔پس جو کچھ میں کہتا ہُوں جِس طرح باپ نے مجھ سے فرمایا ہے اُسی طرح کہتاہُوں''(یوحنا۱۲: ۴۹، ۵۰)۔''۔۔۔یہ باتیں جو میں تُم سے کہتاہُوں اپنی طرف سے نہیں کہتا لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے''(یوحنا۱۴: ۱۰)۔''۔۔۔جو کلام تُم سُنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جِس نے مجھے بھیجا''(یوحنا۱۴: ۲۴)۔روئے زمین کے کسی نبی یافلاسفر کی تعلیم آپ کی تعلیم کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی۔

گزشتہ دو ہزار سال سے کسی شخص نے کسی زمانہ میں بھی ایسی تعلیم نہیں دی جو آپ کی تعلیم کی جگہ غصب کر سکے۔امتدادِ زمانہ کے باوجود آپ کے اصول اب بھی ویسے ہی عجوبہ روزگار ہیں، جیسے پہلے تھے۔کلمتہ اللہ کے الفاظ کی لطافت، ندرت (عمدگی)، عظمت اور قدرت میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔وہ صدہا سال سے ہزاروں ملکوں اور قوموں میں مروج رہے ہیں، لیکن ان کی تروتازگی اور شگفتگی مثل سابق قائم ہے اور تاقیامت قائم رہے گی۔کلمتہ اللہ کے کلماتِ طیبات کی سحر آفرینی، بے نظیر متانت، حلاوت (مٹھاس) اور لاثانی حکمت اور معقولیت صدیوں سے مختلف ملکوں اور زمانوں کے کروڑہا انسانوں کو متاثر کرتی چلی آرہی ہے اور ان الفاظ کی برکت اور کرامت کے طفیل نوع انسانی شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتی چلی آئی ہے۔آپ کا پیغام اپنی نظیر آپ ہی رہاہے اور تاقیامت رہے گا۔

۱۵۔ مسیحی تعلیم کی ہمہ گیری

(۱)

دیگر معلموں کے پیغام ان کے اپنے پیغام یا مختلف لوگوں کے خیالات کا مجموعہ ہیں، جو ان کی قوم اور ملک کے ساتھ مختص ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے پیغام عالم گیر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔وہ ایک خاص ملک یا قوم یا زمانہ کے حالات یا مسائل کو جو ان کے بانیوں کے درپیش تھے ،ایک خاص مدت تک ہی حل کر سکے۔لیکن چونکہ ان کے اصول کا تعلق صرف خاص حالات کے ساتھ ہی تھا۔لہٰذا وہ اس تعلق اور وابستگی کی وجہ سے عالم گیر نہ ہو سکے۔ان میں سے بعض کو خود ان کے وضع کرنے والوں کو اپنی حین حیات میں ہی منسوخ کرنا پڑا تھا۔چنانچہ قرآن مجید میں بعض احکام مثلاً قبلہ کا تعین وغیرہ، حضرت رسول عربی کی حین حیات میں ہی منسوخ ہو گئے۔کیونکہ وہ وقتی احکام تھے اور حالات کے بدلنے سے ان کا نفاذ مفید نہ رہا تھا۔اسی واسطے اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (سورہ بقر رآیت ۱۰۶)۔(ترجمہ)''جب ہم کسی آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کی مثل کی آیات پہنچا دیتے ہیں''۔حضرت شاہ ولی اللہ اسباب نسخ پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

"کسی شے میں ایک وقت کوئی مصلحت یا خرابی ہوتی ہے۔اس کے مطابق حکم متعین ہو جایا کرتا ہے۔اس کے بعد ایک زمانہ آتا ہے جس میں اس شے کی وہ حالت نہیں رہا کرتی۔اس لئے اس کا وہ حکم بھی نہیں کرتا"

(آیات اللہ الکاملہ ترجمہ حجۃ البالغہ، باب ۷۳، صفحات ۱۹۱، ۱۹۲)۔

اس کے بعد شاہ صاحب جہاد کی مثال دیتے ہیں (سورہ ہود آیت ۱۹، سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۴، سورہ ابراہیم آیت ۴، سورہ انعام آیت ۲۵ وغیرہ)۔ صحائف انبیا میں بھی جابجا ایسے وقتی احکام ملتے ہیں جن کو حضرت کلمۃ اللہ نے غیر مکمل یا ناقص قرار دے دیا (متی ۲۲:۲۲۔۳۳؛ ۱۹:۳۔۱۰) اور فرمایا "موسیٰ نے تمہاری سخت دلی کے سبب سے تم کو اجازت دی تھی" (متی ۱۹:۸) اور ایسے احکام کی بجائے آپ نے جہاں گیر اصول بتائے جو خالق کے ازلی ارادہ کے مطابق تھے (متی ۱۹:۹؛ ۲۲:۲۹۔۳۳)۔ لیکن کلمۃ اللہ کے احکام اور جہاں گیر اصولوں میں کوئی حکم بھی گزشتہ بیس صدیوں میں کسی زمانہ، قوم، نسل اور ملک میں منسوخ کئے جانے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ کیونکہ ان عالم گیر اصولوں میں نفس کی رعایت، سخت دلی، جہالت وغیرہ (جو نسخ کے اسباب ہوتے ہیں) کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نسخ سے کتاب میں اختلاف معنوی پڑ جاتا ہے، جو کتاب اللہ میں نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کلمۃ اللہ کے اصول (جو اناجیل اربعہ میں ہیں) میں کسی جگہ اختلاف معنوی نہیں پایا جاتا۔ لیکن کلمۃ اللہ کے اصول کسی خاص قوم یا ملک یا زمانہ کے ماحول کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ کسی خاص جماعت کے حالات کے ساتھ وابستہ نہیں۔ لہٰذا وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد اور عالم گیر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ مکاشفہ جو خدا نے آپ کے ذریعہ دنیا پر ظاہر کیا، قطعی اور آخری ہے۔ کیونکہ اس سے بہتر مکاشفہ ہو نہیں سکتا۔ آپ کا پیغام روحانیت کی انتہائی منزل ہے۔ یہ آخری معراج ہے جس کے بعد کوئی عروج نہیں۔ کوئی شخص عالم خیال میں بھی ایسی تعلیم وضع نہیں کر سکتا جو ابن اللہ کی تعلیم سے اعلیٰ ہو۔ ہر ایسی ناکام کوشش اور سعی باطل کلمۃ اللہ کے پیغام کے قطعی ہونے کا بین ثبوت ہے۔ جنابِ مسیح کے ساتھ دنیا میں ایک نئی تعلیم آئی جو ابد تک غیر متزلزل ہے۔ اس میں وہ آخری اور قطعی اور بے مثال اور لازوال مکاشفہ ہے جو خدا نے ایک لاثانی اور بے نظیر شخصیت کے ذریعہ عطا کیا ہے جو ہر پہلو سے بے عدیل ہے۔ انسانی تجربہ اور تاریخ اس بات کے شاہد ہیں کہ کلمۃ اللہ اخلاقیات کے واحد حکمران اور تاج دار ہیں۔

(۲)

اس حقیقت کو مخالفین تک چار و ناچار تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کی انجمن کے ملاحدہ[1] نے ۱۹۱۹ء کے سالانہ اجلاس میں کفِ افسوس مل کر (ہاتھ مل کر۔ پچھتا کر) اقرار کیا کہ:

"مسیحیت کا وجود اور اس کی زندگی اور بقا بجائے خود ایک ایسا زبردست معجزہ ہے جس سے ہم کو مجال انکار نہیں۔ مادیت اور اخلاقیات نے ہر نکتہ نظر اور ہر پہلو سے اس پر ایسے زبردست حملے کئے ہیں جو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ لیکن ہم کو اس مذہب میں مغلوب و مفتوح ہونے کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر آج ہم کو مسیحیت اس دنیا سے رخصت ہوتی نظر آتی ہے تو روز فردا مثل سابق ہماری ناکام مساعی پر نہایت سکون اور اطمینان سے مسکراتی نظر آتی ہے۔ روئے زمین کے ادیان میں سے کسی دوسرے مذہب کو اس قدر سنگلاخ (دشوار۔ مشکل) رکاوٹوں اور جاں کاہ (تکلیف دہ) آزمائشوں سے مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ ہمارے مغربی ممالک کی حقیقت شناس فضا میں مسیحیت کی بقا ایک ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے جس نے ہم کو ورطہ حیرت میں ڈال

[1] . Rationalist Press Association.

رکھا ہے۔ اس کے پاس سامان تک نہیں جس سے وہ ہمارے حملوں کی وجہ سے اپنی حفاظت بھی کر سکے۔ گزشتہ پشت کے علما و فضلا نے جو یگانہ روزگار تھے۔ مسیحیت کے گڑھ کو اپنے حملوں کی ٹکروں سے چکنا چور کر ڈالا تھا، لیکن یہ مثل سابق اپنا سر ویسے ہی بلند کئے اطمینان خاطر سے ہمت باندھے متکبرانہ انداز سے کھڑی ہے۔ یہ امر ہمارے لئے ایک عجوبہ اور اچنبھا ہے، بلکہ ایک حیران کن معجزانہ بات ہے۔ ہم نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا دنیا جہاں پر اس کی بے اعتباری کو تشت از بام (ظاہر۔ رسوا) کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسیحیت کا اخلاقی، تواریخی اور عقلی پہلو سے دیوالہ نکل گیا ہے، لیکن باوجود ہماری مساعی کے مسیحیت پہلے کی طرح ویسی ہی بڑھتی، پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی نظر آتی ہے"۔

(Quoted from the Christianity the Final Religion?)

ابتدا ہی سے مسیحیت کے مخالفین کا یہی تجربہ رہا ہے جو انجمن ملاحدہ یورپ کا ہے۔ مسیحیت کی ہر پہلو سے آزمائش کی گئی ہے۔ دو ہزار سال سے مخالفین اس کی بیخ کنی کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ان کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے تمام مخالف روم کے بت پرست قیصر جولین کے ہم آواز ہو کر دم واپسین (حالت نزع) یہی کہتے ہیں کہ "اے گلیلی۔ تو فاتح رہا"۔

۱۶۔ مسیحیت اور ادیانِ عالم کی اصلاح

جنابِ مسیح نے قطعی کامل اور اکمل طور پر خدا کی ذات اور صفات کو بنی نوع انسان پر ظاہر کر دیا ہے اور ان معنوں میں آں خداوند خاتم الانبیا اور خاتم المرسلین ہیں۔ آپ کی شخصیت لاثانی اور عالم گیر ہے۔ آپ خدا کا مظہر اور منجی عالم ہیں۔ آپ کے پیغام کا تعلق زمین کے کسی خاص خطہ کے ساتھ نہیں، بلکہ وہ کل بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ اس کا تعلق کل ممالک اور اقوام کے ساتھ ہے۔ اس کے اصول زمان و مکان کی قیود سے آزاد اور تمام عالم اور ازمنہ پر حاوی ہیں۔ اس تصور زا (تصور پیدا کرنے والا) پیغام کی روشنی میں دنیا کی کل اقوام دو ہزار سال سے اپنے خیالات، جذبات، معتقدات، رسمیات وغیرہ کی اصلاح کرتی آئی ہیں اور تاابد کرتی رہیں گی۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ آپ کے بے عدیل پیغام کو کسی دوسرے مذہب یا فلسفہ کے اصول کی روشنی میں اپنے روحانی اصول کی اصلاح کرنے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوئی۔ اس کے برعکس اس کی قسمت میں روزِ اوّل سے ہی یہ لکھا ہے کہ کل ادیانِ عالم پر فاتح اور تمام دنیا اور اقوام پر حاوی ہو۔ اگر ہم دنیا کے مذاہب کی تاریخ پر ایک سطحی نظر ڈالیں تو ہم پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ جس جس ملک اور قوم میں مسیحیت گئی اور جس زمانہ میں بھی کلمۃ اللہ کے اصول کی روشنی چمکی، اس ملک اور قوم اور زمانہ کے مذاہب نے مسیحیت کی روشنی میں اپنے اپنے اصول کی نظر ثانی کر ڈالی۔ آفتابِ صداقت کی پاک شعاعوں نے ان مذاہب کے پیروؤں پر ان کے بوسیدہ اصول کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے ان کو منور کر دیا۔ ان کے دینی پیشواؤں نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنے مذہب کے اصول کی کلمۃ اللہ کے پیغام کے ساتھ مطابقت کر ڈالیں اور اپنے مذاہب کے اصول کے ان عناصر کو ترک کر دیں جو اس پیغام کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے۔ انہوں نے حتی الوسع کوشش کی کہ اپنے مذاہب کے بانیوں کی زندگیوں کے تاریک مقامات کی (جو جنابِ مسیح کی مقدس زندگی کے اصول کے مطابق نہیں) پادر ہوا (بے بنیاد۔ خیالی) تاویلات کریں یا ان کا سرے سے انکار کر دیں۔

اس برصغیر کو دیکھ لو۔ ہمارے برادران (ہندو اور مسلم) جو آں خداوند مسیح کی مقدس زندگی اور محبت کے اصول سے متاثر ہو چکے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مذاہب کے بانیوں کی زندگیاں بھی ابن اللہ کی سی ہوں۔ لہٰذا دورِ حاضرہ میں ان مذاہب کے راہ نما (پنڈت اور مولوی صاحبان) اس بات کو ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے بانیوں (حضرت محمد اور مہاراج کرشن وغیرہ) کی زندگیوں کے وہ واقعات جو انجیل

جلیل کے اصول کے نقیض ہیں، سرے سے غلط اور افتراہیں اور کہ ان کے مذاہب کے وہ اصول جو آں خداوند مسیح کے جاں فزا پیغام کے متضاد ہیں ،ان کے مذاہب کا جزو نہیں۔ مثلاً ذات پات کی قیود، اچھوت، بت پرستی، اوہام پرستی، دیوداسی، مندروں میں زناکاری، شرک، جہاد، تعدد ازدواج، (جنت ودوزخ کا نقشہ) وغیرہ۔ جہاں تک اس میں برصغیر کا تعلق ہے مرحوم مولانا حالی کے مسدس میں ایک بند لکھا ہے جو ایک لفظ کی تبدیلی سے مسیحی تحریک پر پورا صادق آتا ہے۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
زمین ہند کی جس نے ساری ہلادی
نئی اِک لگن سب کے دل میں لگادی
اِک آواز سے سوتی بستی جگا دی

ہندوستان کو کلمۃ اللہ کی خوش خبری کے پیغام نے ایسا مسخر کر لیا ہے کہ ہر شخص اسی بات کا خواہاں ہے کہ کاش میرے مذہب کے بانی کی زندگی جنابِ مسیح کی زندگی کی مانند ہو اور میرے مذہب کے اصول اس کے پیغام کی مانند ہوں۔ مسیحیت کی خصوصیت مخالف وموالف دونوں پر عیاں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سر رادھا کرشن لکھتا ہے کہ :

''مسیحیت میں ہر جگہ یہ فاتحانہ انداز پایا جاتا ہے کہ مسیحیت ہی مذہب کا بہترین اور اعلیٰ ترین اظہار ہے اور کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے قطعی اخلاقی معیار ہے، جس کی کسوٹی پر ہر دوسرا مذہب جانچا جائے''[1]۔

پس تاریخ شاہد ہے کہ جس ملک یا قوم یا ملت میں مسیحیت گئی، اس کے درود مسعود کے ساتھ ہی وہاں کے مذہب کی اصلاح شروع ہو گئی۔ لیکن انجام کار اصلاح کی تمام کوششیں بے کار اور بے سود ثابت ہوئیں۔

مصیبت میں پڑا ہے سینے والا چاک دامن کا
جو وہ ٹانکا تو یہ ادھڑا جو وہ ادھڑا تو یہ ٹانکا

دنیا کے ممالک اور اقوام مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو گئے اور جنابِ مسیح غالب اور فاتح ہوئے۔ لیکن مسیحیت نے کسی زمانہ میں بھی کسی دوسرے مذہب کے اصول کی روشنی میں اپنے بنیادی اصول کی کبھی اصلاح نہ کی۔ اس کی تمام تاریخ میں اس کو ایسا کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہ آئی۔ گزشتہ بیس صدیوں میں کلیسیائے جامع کے کسی ملک کی کلیسیا کے کسی دینی پیشوا کے وہم گمان میں بھی یہ بات نہ آئی جو اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ جنابِ مسیح کی تعلیم ادیانِ عالم پر غیر مکمل ہونے کا فتویٰ لگاتی چلی آئی ہے اور اقوام عالم نے کلمۃ اللہ کی تعلیم کی روشنی میں اپنے مذاہب کی اصلاح کر کے اس فتویٰ کی صحت کا اقبال کر لیا ہے۔

[1] . East and West in Religion p.24.

۱۷۔ مسیحیت اور اقوامِ عالم کی ترقی

مذکورہ بالا کوائف سے ناظرین ہو گیا ہو گا کہ کلمۃ اللہ کا پیغام عالم گیر اور جامع ہے۔ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کے اصول کسی خاص قوم یا زبان یا ملک یا تمدن کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے، بلکہ یہ اصول تمام اقوام عالم پر یکساں طور پر حاوی ہیں اور ہر قوم، ملک اور زبان کے افراد ان کی یکساں طور پر تعمیل کر سکتے ہیں اور ہر قسم کے دماغ اور سمجھ والے ان اصول کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ چونکہ اس تعلیم کے اصول رسوم، عقائد اور قیود شرعیہ کے پابند نہیں۔ ان میں یہ اہلیت ہے کہ وہ روحانی اصول ہونے کے سبب عالم گیر ہو سکیں۔ عالم گیریت کا یہ دعویٰ یا تو غلط ہے یا صحیح ہے۔ لیکن تاریخ نے اپنی شہادت کی مہر اس کی ہمہ گیری پر ثبت کر دی ہے۔ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ منجی کونین کی تعلیم ہر آب و ہوا اور ہر زمانہ میں پھلتی پھولتی رہی۔ وہ ہر زمانہ، ہر ملک اور قوم اور ملت کے ساتھ سازگاری کر سکی۔ جہاں جہاں یہ تعلیم گئی اس نے ہر قوم اور ہر ملک کے ماحول میں کامیابی کے ساتھ رائج ہونے کی قابلیت اور صلاحیت رکھنے کا پورا پورا ثبوت دے دیا۔

تاریخ عالم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کے اصول اور اس کے قوانین کلی تمام ممالک اور ازمنہ کے اصول و کلیاتِ تمدن، معاشرت اقتصاد اور ارتقائے ذہنی کا جامع ہو کر بہ آسانی تمام جزئیات کا استخراج کر سکنے کی استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں۔ اس کی مکمل اور جامع تعلیم تمام ممالک و ازمنہ کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہونے کی مدعی رہی ہے اور اس کام کو بطرز احسن نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام بھی دیتی ہے۔ وہ اقوام عالم کی نشوونما میں مدد و معاون اور ان کی ترقی کا باعث رہی ہے۔ اس نے کبھی کسی قوم کو ایک ہی جامد سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش نہ کی۔ اس کی تاریخ کے تاریک ترین زمانوں میں بھی ایسا وقت کبھی نہ آیا جب اس نے یہ کوشش کی ہو کہ مختلف قوموں کے فطرتی اختلاف کو جو قدرت کی طرف سے ان کو ملے ہیں، مٹا کر ان کی طرز رہائش، معاشرت وغیرہ کو ایک ہی قسم کے قانون فقہ کے ماتحت کر دے۔ مسیحیت کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی کہ جس طرح قدرت نے بدن کے ہر ایک عضو کو الگ الگ کام سپرد کیا ہے اور کل اعضا اپنے مختلف کاموں کو پورا کر کے جسم کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر ملک اور ہر قوم اپنی اپنی جداگانہ خداداد قابلیت کی نشوونما حاصل کر کے نوع انسانی کی ترقی کا باعث بنے۔ مسیحیت نے ہر ملک کو اور ہر قوم کو اس کی خصوصی نشوونما میں مدد دی۔ اس کی ترقی کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ ہر ملک اور قوم کا انسان اس کے حلقہ بگوش ہو کر بھی اپنی قومی اور ملی نشوونما اور ترقی میں کوشاں ہوتا رہے۔ چین یا ایران یا عرب یا مغرب کا باشندہ مسیحی ہو کر اپنی قومی طرز معاشرت کو ترک نہیں کر دیتا۔ اس پر یہ لازم نہیں ہوتا کہ مسیحی ہو کر وہ اپنی ڈاڑھی خاص حد تک لمبی رکھے یا اپنی مونچھوں کو کسی خاص طرز سے کٹوائے یا اپنے پاجامہ کو ٹخنوں تک آنے دے یا کسی دوسری قوم کی زبان کو اپنی زبان بنالے یا کسی خاص مقام کو حج، زیارت اور یاترا کے لئے جانا اس پر فرض ہو جائے۔ جس طرح بعض مذاہب ہر ملک اور ہر قوم کو ایک ہی ٹھوس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر کے اس کی ترقی میں سدراہ ہو جاتے ہیں۔

مسیحیت نے کسی قوم پر اس قسم کا غیر فطری جبر روا نہیں رکھا۔ اگر کسی ہندوستانی نے مسیحیت کو قبول کر لیا ہے تو وہ اپنے ملک کے باہر ارض مقدس کے کسی مقام کو اپنائیت قرار نہیں دیتا، اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہم پہلے مسیحی ہیں اور پھر اپنے ملک کے شہری ہیں۔ کیونکہ کلیسیائے جامع کے نزدیک کسی ملک کا کوئی مسیحی اچھا مسیحی نہیں ہو سکتا جو اپنے ملک کا اچھا شہری نہ ہو۔ مسیحیت کا یہ مقصد ہے کہ ہر ایک قوم کی نشوونما اور ترقی اس طور پر ہو کہ وہ اس خاص خداداد قابلیت کو جو فطرت نے خاص اس قوم میں ودیعت فرمائی ہے، بطرز احسن انجام دے سکے۔ جس طرح بدن کا ہر ایک عضو اپنے اپنے کام کو کماحقُہ، (کما۔ حَق۔ قُ۔ ہُو۔ بخوبی) انجام دیتا ہے۔ گزشتہ دو ہزار سال میں جس ملک میں بھی مسیحیت گئی اس نے وہاں کی اقوام کی قدرتی نشوونما میں مدد دی اور وہ اقوام ترقی کر کے نوع انسانی کی تقویت کا باعث ہو گئیں۔ جس طرح ہمارے جسم کے مختلف اعضا نشوونما پا کر ہمارے بدن کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں، اسی طرح مسیحیت گزشتہ بیس صدیوں سے ہزاروں ممالک و اقوام کی نشوونما کا

باعث بنی ہے اور ان ممالک و اقوام کے تمدنی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی مسائل کو اپنے عالم گیر اصول کے ذریعہ حل کر کے نظام عالم کی شیرازہ بندی کرتی چلی آئی ہے۔

مسیحیت کی عالم گیری کی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ اقوام عالم کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکتی اور نہ ان کو ایک سانچہ میں ڈھالتی ہے۔ اس کی ہمہ گیری میں تمام اقوام عالم کی خصوصی نشوونما کے لئے جگہ ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ مسیحیت کے عالم گیر اصول کے اطلاق میں ہر قوم کی نشوونما کی گنجائش ہے اور ان اصول کا اطلاق ہر ملک و قوم اور زمانہ کے مختلف حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ جو شے مسیحیت کو ایک عالم گیر مذہب بناتی ہے، وہ اس کی آزادی کی روح ہے جس کی وجہ سے ہر ملک و قوم اور زمانہ کے مختلف حالات پر اس کے اصول عائد ہو سکتے ہیں۔ مسیحیت کسی قوم و ملک کے لوگوں کو کسی خاص انتظام کا غلام نہیں بناتی۔ اس حقیقت کو مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً ایک فاضل ترک مصنف ایبل آدم اپنی تصنیف ''کتابِ مصطفیٰ کمال'' (قسطنطنیہ ۱۹۲۶ء) میں یوں رقم طراز ہے:

> ''اسلام نے اپنے پیروؤں کو ضمیر اور خیالات کی آزادی عطا نہیں کی اور اسلامی شرع نے زندگی سے اس کا حق چھین لیا ہے۔ چونکہ اسلامی آئین لا تبدیل ہیں، لہٰذا وہ ترقی کی راہ کو بند کرتے رہے ہیں۔ کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ آئین و قوانین کا بدلنا بھی لازم ہے۔ قرآن و حدیث صحرائے کے ان باشندوں کی کتابیں ہیں جو تہذیب و تمدن کی ابتدائی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اسلامی آئین و شرعی قوانین میں نفسیات اور معاشرتی زندگی کی نشوونما اور ترقی کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ جائے غور ہے کہ مسیحیت بھی اسلام کی طرح ایک ایشیائی مذہب ہے، لیکن اس نے کسی قوم کی معاشرت اور تمدنی زندگی پر جبر روا نہ رکھا۔ مسیحیت شہر رومہ میں گئی، لیکن وہ اپنے ساتھ اہل یہود کی معاشرتی زندگی نہ لے گئی۔ اگر اسلام کی طرح مسیحیت بھی ایک لشکر جرار کے ساتھ یروشلیم سے چلتی اور یورپ پر قابض ہو کر ان پر یہودی معاشرتی زندگی جبریہ لازم قرار دیتی تو یورپ کا بھی اسلامی ممالک سا حال ہو جاتا، لیکن مسیحیت نے ایسا نہ کیا''۔

ایک اور ترکی مصنف جلال نوری لکھتا ہے:

> ''اسلام میں ہم نے مسیحیت جیسی نشوونما اور گرد و پیش کے حالات اور ماحول سے مطابق ہو جانے کی صلاحیت اور اہلیت نہیں پائی۔ اسلام آج تک جمود کی غیر متحرک حالت میں جامد و ساکن رہا ہے۔ ہم پرانے زمانہ کے ساکن تصورات اور غیر متحرک معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تصورات کی ٹھوس زنجیروں میں جکڑے ہوئے بے بس پڑے ہیں[1]''

(ترکی انقلاب، صفحہ ۵۸)۔

[1] .The Turkish Revelution .p.58.

۱۸۔ مسیحی اصول اور فروعات

مسیحیت کی حیرت انگیز کامیابی کا اصلی سبب جو مسیحیت کا کمال ہے اور جو دیگر مذاہب میں نہیں پایا جاتا یہ ہے کہ مسیحیت نے جامع اصول اور فروعات میں تمیز کر دی ہے۔ تمام غیر مسیحی مذاہب میں اصولوں کے ساتھ فروعات ایسے وابستہ ہیں کہ ان کو بھی اصولوں کی سی وقعت حاصل ہے۔ جرمن عالم ڈاکٹر ہارنیک نے صحیح کہا ہے کہ ''مسیح کا امتیازی نشان یہ ہے کہ وہ نہ صرف جامع ہے، بلکہ مانع بھی ہے''۔ کلمۃ اللہ نے اپنے اصول میں سے تمام رسوم اور پابندیاں اور وقتی قوانین جن کا صرف کسی خاص زمانہ یا پشت یا ملک یا قوم کے ساتھ تعلق تھا، خارج کر دیں۔ مثلاً حرام و حلال کا سوال (مرقس باب ۷، رومیوں ۱۴: ۱۷)، فقہ کے سوال (متی باب ۲۲)، بزرگوں کی سنتوں پر عمل کرنے کا سوال (متی ۱۵: ۳۔۹)، دونوں تہواروں، سبتوں، موسموں وغیرہ کا ماننا (متی باب ۱۲، گلتیوں ۴: ۱۰)، ظاہری افعال اور بیرونی اعمال پر بے حد زور دینا (متی باب ۶، لوقا ۸: ۱۲، متی باب ۵) وغیرہ وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحیت نے یہودیت سے سوائے اس کی کتب مقدسہ کے اور کچھ نہ لیا اور ان کتب کی بھی حضرت کلمۃ اللہ سے آزادانہ تاویل کی (مرقس ۲: ۷؛ یوحنا ۵: ۱۶۔۱۸؛ لوقا ۶: ۵۔۱۱؛ ۱۳: ۱۰۔۱۷؛ متی ۱۹: ۳۔۱۲؛ ۲۳: ۲۳؛ ۹: ۳)۔ یہاں ہم اہل یہود کے ربیوں کے فقہ کے احکام میں سے صرف سبت کو ماننے کا حکم مثال کے طور پر ناظرین کے پیش کرتے ہیں[1]۔ اہل یہود کی کتاب سبت میں سبت کے مفصل احکام درج ہیں۔ یہ کتاب ۳۹ انواع پر مشتمل ہے، جن میں چند احکام ملاحظہ ہوں۔ سبت کے روز ذیل کے کام کرنے کی ممانعت تھی:

ہل چلانا، بیج کا بونا، فصل کاٹنا، گانٹھ دینا یا کھولنا، دو سے زیادہ حروف کا لکھنا، کسی شے کو اٹھا کر دوسری جگہ رکھنا، کاٹھ کی مصنوعی ٹانک (ٹانگ) استعمال کرنا، مصنوعی داموں (دانتوں) کو اکھاڑ کر منہ میں رکھنا، کسی شے میں سے بال نکالنا، لکڑی کا صرف اتنا بوجھ اٹھانا جائز تھا جس سے انڈا گرم ہو سکے۔ ایسے سوالوں پر بحث کی گئی جو مضحکہ خیز معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر مرغی سبت کے روز انڈا دے تو کیا وہ انڈا کھانا جائز ہے، کیونکہ مرغی نے سبت کا حکم توڑ کر انڈا دیا ہے۔ کیا کسی جوں کو سبت کے روز مار ڈالنا جائز ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ صرف جوں کی ٹانگیں توڑنا ہی جائز ہے۔ اگر اناج کی کوٹھی میں قربانی کی غرض سے اناج جمع کیا گیا ہو تو کیا اس میں کھانے کی غرض سے اناج رکھنا جائز ہے۔ اگر کسی نے یہ منت مانی ہو کہ وہ کچلی ہوئی سبزی نہیں کھائے گا تو اس کے لئے یہ جائز ہے ایسا پیاز کھائے جو اس نے انجانے سب کے روز پاؤں کے تلے کچل دیا ہو۔ ربی ہلیل اور شمعون جیسے زبردست علما ایسے مضحکہ خیز مسائل پر فتویٰ صادر کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیت کی شرع کی روح قوم کے بدن سے پرواز کر گئی اور صرف رسوم کی پابندیوں کا ڈھانچہ حضرت کلمۃ اللہ کے زمانہ میں رہ گیا جو بالفاظ مقدس پطرس ایسا بھاری تھا جس کو نہ تو اس کے ہم عصر یہودی اور نہ ان کے باپ دادا اٹھا سکتے تھے (متی ۲۳: ۴؛ لوقا ۱۱: ۴۶؛ اعمال ۱۵: ۱۰؛ گلتیوں ۵: ۱)۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہودیت کے ہر مسلک کے یہودی احکام سبت پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بیش از بیش (زیادہ سے زیادہ) زور دیتے گئے، کیونکہ اب قوم یہود کی نہ حکومت رہی تھی اور نہ ہیکل۔ ان کا مذہب صرف ایک واحد شے تھی جو ان کی آنکھوں میں قابل قدر شے تھی۔ پس عبادت خانوں نے جابجا ہیکل کی جگہ لے لی تھی جن میں یہودی شریعت اور بزرگوں کی روایات پر درس دیئے جاتے تھے۔ وہاں تمام یہود سبت کے روز اکٹھے ہوتے۔ اب سبت ہی ان کی قومی زندگی اور ماضی کی عظمت کا ایک واحد نشان باقی رہ گیا تھا، جو قوم کی شیرازہ بندی اور اجتماعیت کا ایک واحد وسیلہ تھا۔ پس ہر دس برس کے یہودی بچے پر لازم کر دیا گیا کہ وہ باپ دادا کی روایت کو زبانی حفظ کرے۔ یہودی ربی علم روایت اور علم فقہ میں طاق تھے۔ ان کی قیود شرعیہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھیں، لیکن کلمۃ اللہ نے ان تمام قیود کو جن کا تعلق زمان و مکان کے ساتھ تھا

[1] .Daily Life in the time of JESUS.

بے تامل رد کر دیا(متی باب ۲۳)۔یہی وجہ ہے کہ مسیحی کلیسیا نے بنی اسرائیل سے ان کی صرف کتبِ مقدسہ ہی کو لیا اور باقی تمام روایات، تفاسیر، فقہ وغیرہ کی کتب کو رد کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ اقوام عالم کا مذہب ہو سکے۔ دنیائے مذاہب میں اپنے اصول کے لحاظ سے صرف مسیحیت ہی ایک واحد جامع اور مانع مذہب ہے۔

۱۹۔انجیلی اصول کا اطلاق اور اقوام

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ تمام مذاہب سے زیادہ مسیحی کلیسیا میں دنیا کی مختلف اقوام ایک جگہ جمع ہیں۔اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ تعداد مسیحیوں کی ہے (اگرچہ یہ بھی ایک حق بات ہے) بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ دنیا کی اس قدر مختلف اقوام مسیحی جھنڈے تلے جمع ہیں اور کلیسیائے جامع میں برابر کی شریک ہیں جو کسی دوسرے مذاہب میں نہیں ہیں۔ جس سے کم از کم یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسیحیت میں یہ صلاحیت پائی گئی ہے کہ اس نے اقوام عالم کے خصوصی اختلافات اور امتیازی نشانات جو کہ ان کی قومی نشوونما اور ملی ترقی کا باعث ہیں ، قائم رکھے ہیں اور ان کی روحانی اور قومی ضروریات کو پورا بھی کیا ہے۔ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ صرف مسیحی مذہب میں ہی مختلف زمانوں، ملکوں اور قوموں کی روحانی اور قومی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا وہ عالم گیر مذہب ہے جو ہمہ گیر رہا ہے اور رہے گا۔

علاوہ ازیں ان گزشتہ دو ہزار سالوں میں صفحہ ہستی پر کوئی ایسی قوم نہیں گزری جس نے اپنی قومی اور ملی زندگی کو مسیحی اصول کے مطابق نشوونما دینے کی کوشش کی ہو اور وہ اس کوشش میں ناکام رہی ہو۔ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ کسی زمانہ میں بھی اس قسم کی مساعی جمیلہ میں کسی ملک اور قوم کو ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ جس قوم اور ملک نے کلمۃ اللہ کے اصول پر چلنے کی کوشش کی، وہ ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہو گئی۔ پس اقوام عالم کی تاریخ مسیحیت کی عالم گیری پر مہرِ صداقت ثبت کرتی ہے اور یہ ثابت کر دیتی ہے کہ کل ادیان عالم میں سے صرف مسیحیت ہر قوم وملک کو یہ توفیق عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے قومی کیریکٹر اور ملی خصائل کو سدھارے۔ دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالو تو یہ حقیقت تم پر عیاں ہو جائے گی کہ جن ممالک نے اپنی باگ ڈور مسیحیت کے سپرد کر دی ہے، وہاں ہر قسم کے علوم وفنون رائج ہیں۔ خیالات کی آزادی ہے۔ مردوں اور عورتوں، بلکہ بچوں تک کو حقوق حاصل ہیں۔ ان ممالک کی کلیسیا کے افراد نہ صرف اپنی روحانی بہبودی کو مدِ نظر رکھتے ہیں، بلکہ وہ مسیحی مبلغین کو دُور دراز مقامات میں بھیج کر دنیا کو بچانا چاہتے ہیں۔

مسیحیت نے ہزاروں وحشی اور مردم خوار اقوام کو چاہِ ذلت وضلالت سے نکالا اور ان کو بے ہودہ رسمیات، وحشیانہ دستورات اور توہمات کے پنجہ سے خلاصی بخشی۔ ان کے افراد کو حیوانوں سے انسان بنا کر ترقی اور تہذیب کی راہ پر چلایا۔ گزشتہ بیس صدیوں میں دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کی اقوام نے دانستہ یا نادانستہ کلمۃ اللہ کے اصول کو اپنی زندگی کا معیار نہ بنایا ہو۔ دورِ حاضرہ میں روئے زمین پر کوئی ایسی قوم نہیں ہے کہ جس کے روحانی جذبات کا مرکز جنابِ مسیح کی ذات ستودہ صفات نہیں ہے۔ پس مسیحیت ہمہ گیر ہے اور عالم وعالمیان پر حاوی ہے۔

۲۰۔ بائبل شریف کی عالم گیری

(۱)

دور حاضرہ کتابوں کی اشاعت اور پروپیگنڈا کا زمانہ ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک کے پریس ہزاروں کتابیں روز شائع کرتے ہیں۔ لیکن ان ہزاروں کتابوں میں معدودے چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی ملک میں ایک سال کے بعد اس ملک کے باشندوں کی نگاہ میں مثل سابق قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں اور ان خوش قسمت کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی ملے گی جو نہ صرف ایک خاص ملک کے باشندوں کی نگاہ میں قابل قدر ہو، بلکہ ایک براعظم کے تمام ممالک میں قدر اور وقعت کی نظر سے دیکھی جائے اور ایک صدی کے گزرنے پر آپ کو شاید ہی کوئی کتاب ایسی ملے گی جو دنیا کے تمام ملکوں اور اقوام عالم کی نزدیک مقبول عام ہو۔

لیکن اس دنیا میں بائبل مقدس ہی ایک واحد کتاب ہے جو صدیوں سے ہزاروں ملکوں اور قوموں کے کروڑوں افراد کے نزدیک آج بھی ویسی ہی وقعت کے قابل ہے، جیسی وہ اس زمانہ میں تھی جب وہ تحریر میں آئی۔ حق تو یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اور دنیا میں علم و تہذیب کی روشنی پھیلتی جاتی ہے، یہ کتاب بیش از بیش قابل احترام خیال کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے روحانی رموز کے عمیق مطالب پنہاں ہیں جن کو معمولی عقل کا انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اقوام عالم گھاس کی طرح مرجھا جاتی ہیں اور دنیا کی پشتیں اور نسلیں پھول کی طرح کملا جاتی ہیں، لیکن ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے (یسعیاہ ۴۰:۸)۔ مسیح نے سچ فرمایا تھا "آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہر گز نہ ٹلیں گی" (متی ۲۴:۳۵؛ ۱۔ پطرس ۱:۲۳۔۲۵)۔ اناجیل اربعہ میں جذبات نگاری، تصنع اور خیال آفرینی کا نام بھی نہیں۔ گو وہ روحانیت کے ارتقائے کامل کی آخری منزل ہے، اس میں ندرت خیال کے ساتھ ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے۔ یہ تمام اسباب اس کی مقبولیت کا راز ہیں۔

کلمۃ اللہ (مسیح) کی تعلیم کی عالم گیری کا یہ کافی ثبوت ہے کہ جب سے انجیل جلیل احاطہ تحریر میں آئی ہے، اس کا ترجمہ دنیا کی مختلف اقوام کی زبانوں ہوتا رہا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "صحت کتب مقدسہ" میں مفصل ذکر کیا ہے کہ آن خداوند کی صلیبی موت اور ظفریاب قیامت کے بعد کی پانچ صدیوں میں انجیل جلیل کا ترجمہ مشرق و مغرب کے مختلف مہذب ممالک کی زبانوں میں ہو گیا۔ تاریخ کلیسیائے جامع ہم کو بتاتی ہے کہ گزشتہ دو ہزار سالوں کے درمیان میں دنیا کے جس ملک میں بھی مشرق و مغرب کے مسیحی مبلغین گئے، انہوں نے کتاب مقدس کا ترجمہ اس ملک کی زبان میں کر دیا اور انجیل جلیل کی تبلیغ و اشاعت کرتے رہے اور وہاں کی کلیسیا دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی۔

مثال کے طور پر ماضی قریب کا زمانہ لے لو۔ قریباً ڈیڑھ صدی کا عرصہ گزرا ہے کہ ۱۸۱۶ء میں امریکن بائبل سوسائٹی نے چھ ہزار پانچ سو جلدیں مختلف زبانوں میں شائع کر کے فروخت کیں۔ لیکن ۱۸۵۰ء میں اس سوسائٹی نے قریباً چھ لاکھ اور اس کے پچیس سال بعد ساڑھے آٹھ لاکھ سے زیادہ جلدیں فروخت کیں۔ گزشتہ صدی کے آخر میں یہ تعداد ساڑھے پندرہ لاکھ سے زیادہ ہو گئی۔ ۱۹۲۵ء میں اس سوسائٹی نے بانوے لاکھ پندرہ ہزار جلدیں فروخت کیں اور اس کے ۲۵ سال بعد یہ تعداد ایک کروڑ ساڑھے دس لاکھ سے زیادہ ہو گئی۔ دس سال کے بعد ۱۹۶۰ء میں دو کروڑ بتیس لاکھ دس ہزار سے زائد جلدیں فروخت ہو گئیں۔ ۱۹۶۲ء میں یہ تعداد تین کروڑ پندرہ لاکھ دس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس ایک سوسائٹی نے اپنی ۱۴۸ سالہ زندگی میں تاحال باسٹھ کروڑ اکتالیس لاکھ اٹھارہ ہزار جلدیں فروخت کی ہیں[1]۔ جب ہم اس حقیقت کو اپنی نظروں کے سامنے رکھتے ہیں کہ

[1] .American Bible Society Report for 1963.

بعض ممالک میں انجیل جلیل اور اس کے مبلغین اور مبشرین کا داخلہ قانوناً ممنوع ہے اور دنیا کے بہتیرے ممالک کے بے شمار باشندے اپنے مذہبی، نسلی، قومی اور ملکی تعصبات اور تعلیمی حالات کی وجہ سے انجیل جلیل اور اس کے حصص کو نہیں خریدتے تو ہم ان خارق عادت اعداد و شمار پر حیران رہ جاتے ہیں۔ مندرجہ بالا اعداد و شمار صرف ایک ملک یعنی امریکہ کی بائبل سوسائٹی کے ہیں۔

لیکن انجیل جلیل کی اشاعت کسی ایک ملک کی کلیسیا کی مساعی جمیلہ پر منحصر نہیں۔ مثلاً برطانیہ کی برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی[1] کے اعداد و شمار پر نظر کرو۔ یہ سوسائٹی ۱۸۰۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۷ء تک اس نے اپنی ۱۳۳ سالہ زندگی میں کتاب مقدس اور اس کے حصوں کی پچاس کروڑ سے زائد جلدیں فروخت کیں۔ ۱۹۳۷ء میں اس نے ایک کروڑ ساڑھے تیرہ لاکھ جلدیں فروخت کیں۔ اپنی زندگی کے پہلے پانچ سالوں میں یہ سوسائٹی لندن سے ہر گھنٹے میں نو جلدیں دیگر ممالک کو روانہ کرتی تھی۔ پچاس سال کے بعد ۱۵۶ جلدیں فی گھنٹا روانہ کرنے لگی۔ ایک سو سال کے بعد ۶۵۰ جلدیں فی گھنٹا روانہ ہونے لگیں۔ ۱۹۳۷ء میں اس سوسائٹی نے ایک ہزار تین سو جلدیں فی گھنٹا فروخت کیں۔ بالفاظ دیگر ہر منٹ میں قریباً ۲۲ جلدیں لندن سے مختلف زبانوں میں دیگر ممالک کو بھیجی گئیں۔ یہ اعداد شمار اس ایک سوسائٹی کی فقط ایک شاخ (لندن) کے ہیں۔ ان اعداد میں اس سوسائٹی کی ان شاخوں کے اعداد شامل نہیں ہیں جو روئے زمین کے تمام براعظم کے مختلف ملکوں کے ہر صوبہ کے ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔

برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کی یہ شاخیں جو دنیا بھر کے ہر بڑے صوبہ میں ہیں۔ اب لندن کی شاخ سے الگ ہو کر خود انجیل کی اشاعت کا کام کرتی ہیں۔ مثلاً عراق، اردن، لبنان، شام اور خلیج فارس کی ریاستوں میں ۱۹۵۹ء میں صرف ۹۶ ہزار کے قریب کتاب مقدس اور اس کے حصص کی جلدیں فروخت ہوئیں، لیکن اس کے تین سال بعد ۱۹۶۲ء میں ان ممالک میں ایک لاکھ گیارہ ہزار کے قریب جلدیں فروخت ہوئیں۔ اسی سال ۱۹۶۲ء میں پانچ لاکھ سات ہزار سے زیادہ جلدیں افریقہ کی ۳۸ زبانوں میں فروخت ہوئیں۔ ۱۹۶۱ء میں افریقہ کے صرف دو ممالک گانہ اور نائیجیریا میں دو لاکھ اکیس ہزار جلدیں فروخت ہوئیں۔ ۱۹۶۳ء میں لندن کی شاخ نے کتاب مقدس کو تین سو بیالیس زبانوں میں ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

(۲)

برصغیر ہندوستان میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے ۱۸۱۱ء میں شہر کلکتہ میں اپنی شاخ کھولی۔ اگرچہ اس سال سے ایک صدی پہلے جنوبی ہند کے اولین مبلغین میں سے ایک یعنی زیگن بالگ (Bartholomäus Ziegenbalg) نے ۱۷۱۱ء میں انجیل جلیل کا تامل زبان میں ترجمہ مکمل کر لیا تھا اور ولیم کیری (William Carry) نے (جو ہندوستان کی چوالیس زبانوں سے واقف تھا اور اس نے بعض زبانوں کی لغات بھی تیار کر دی تھیں) ان زبانوں میں انجیل جلیل اور کتاب مقدس کے دیگر حصص کا ترجمہ کر دیا تھا۔ ہنری مارٹن (Henry Martyn) اپریل ۱۸۰۶ء میں ہندوستان آیا اور صرف اکتیس سال کی عمر تک ۱۶ اکتوبر ۱۸۱۲ء کے روز ترکی میں فوت ہو گیا۔ لیکن اس چھ سال کے عرصہ میں اس صلیب کے جاں نثار نے انجیل جلیل کا ترجمہ اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں کر دیا۔

برصغیر ہندوستان میں تقسیم ملک کے بعد برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کی بجائے دو شاخیں قائم ہو گئیں۔ یعنی ہندوستان و لنکا کی بائبل سوسائٹی اور پاکستان بائبل سوسائٹی جس کی دو شاخیں لاہور اور ڈھاکہ میں قائم ہیں۔ یہ دونوں سوسائٹیاں اب اپنے اپنے ملک میں کتاب مقدس اور اس کے حصص کو مختلف زبانوں میں شائع کرتی اور فروخت کرتی ہیں۔ ہندوستان اور لنکا بائبل سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۶۱ء

[1] .British and Foreign Bible Society, London.

میں اس نے کتاب مقدس اور اس کے حصص کی ستائیس لاکھ اکانوے ہزار سے زائد جلدیں فروخت کیں جو ۱۲۹ زبانوں میں ملک کے ۴۴ کروڑ افراد کے لئے شائع ہوئی تھیں۔ان میں سے اکانوے زبانیں خاص ہندوستان کے باشندوں کی تھیں۔اس نے کتاب مقدس کے تامل، بنگالی، ہندی، مرہٹی، سنتالی، ملیالم اور گجراتی ترجموں کی نظر ثانی کر کے ان کو بھی شائع کیا۔ مغربی پاکستان بائبل سوسائٹی کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ۱۹۶۲ء میں کتاب مقدس اور اس کے حصص کی قریباً پچھتر ہزار جلدیں ۴۵ زبانوں میں فروخت کیں۔ گزشتہ بانوے سالوں میں اس سو سائٹی نے ۶۳ لاکھ ۳۲ ہزار سے زائد جلدیں فروخت کیں۔ تقسیم ملک کے بعد پچھلے چار سالوں میں چار لاکھ چالیس ہزار جلدیں فروخت ہوئیں۔ مشرقی پاکستان کی بائبل سوسائٹی نے اپنی ایک سالہ زندگی میں ۱۹۶۳ء میں چھبیس ہزار سے زائد جلدیں فروخت کیں۔ پاکستان کے دونوں حصوں کی سوسائٹی نے کتاب مقدس کے مختلف حصوں کے بلوچی، مسلمانی، بنگالی، فارسی، سندھی، اردو، پشتو وغیرہ زبانوں کے ترجموں کی نظر ثانی کر کے ان کو شائع کیا۔ پس برصغیر ہندوستان کے دونوں ملکوں یعنی بھارت اور پاکستان میں ۱۹۶۲ء میں اٹھائیس لاکھ بانوے ہزار جلدیں ۱۸۲ زبانوں میں شائع ہو کر فروخت ہوئیں۔

سطور بالا میں ہم نے مغربی ممالک کی صرف دو سوسائٹیوں یعنی امریکن بائبل سوسائٹی اور برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کا ذکر کیا ہے۔ ناظرین پر مخفی نہ رہے کہ ان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک کی بائبل سوسائٹیوں نے بھی کار خیر کا ذمہ اٹھایا ہوا ہے۔ مثلاً سکاٹ لینڈ کی نیشنل بائبل سوسائٹی وغیرہ مشرقی ممالک اور افریقہ کے آزاد شدہ ممالک کی کلیسیائیں بھی اس تبلیغ واشاعت انجیل کے کام میں کوشاں ہیں۔ اب دنیا کی تمام بائبل سوسائٹیوں نے از سر نو اپنی تنظیم کر لی ہے اور سب کی سب ایک یونائیٹڈ بائبل سوسائٹی کے ماتحت ہیں۔ جس نے اس کام کا ذمہ اٹھایا ہے کہ متحدہ اور متفقہ سوسائٹی سے دنیا کے تمام ممالک میں کتاب مقدس کی تبلیغ واشاعت کے وسیلے سے انجیل جلیل کا پیغام بنی نوع انسان کے ہر فرد بشر تک پہنچ جائے۔

یہ سوسائٹی ایک عالم گیر جماعت ہے، جس کا کام دنیا کے تمام براعظموں میں ہے۔ اس کی شاخوں کے صدر مقام ممالک میں ہیں اور اس کا صدر آرچ بشپ آف یارک ہے۔ فی زمانہ دنیا کی آبادی میں ہر سال ۶ کروڑ کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر بائبل سوسائٹی نے اپنے ذمہ یہ فرض لے لیا ہے کہ دنیا کا ہر فرد اپنی اپنی زبان میں خدا کا کلام پڑھ سکے۔ تادم تحریر ۱۹۶۳ء انجیل جلیل دنیا کی ایک ہزار دو سو بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اگر دنیا کے اعداد و شمار کا لحاظ رکھا جائے تو اس واضح حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا میں ایک سو آدمی زندہ ہیں تو ان میں سے چھیانوے انجیل شریف کے نجات بخش پیغام کو اپنی مادری زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔ کیا یہ روشن حقیقت کلمۃ اللہ اور انجیل جلیل کی عالم گیری پر دلالت نہیں کرتی؟ کیا کسی دوسرے مذہب کی کتاب کو ایسی جہاں گیر شہرت اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہے؟ کیا یہ کامیابی کلمۃ اللہ کی اعجازی تعلیم کی قوت کو ظاہر نہیں کرتی؟

(۳)

ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے کہ کتاب مقدس اور اس کے حصص کا ترجمہ دنیا کی ایک ہزار دو سو بارہ سے زائد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ہر سال یہ کوشش کی جارہی ہے کہ دنیا کی تمام معلوم زبانوں میں کتاب مقدس کا ترجمہ ہو جائے تاکہ انجیل شریف کے نجات بخش پیغام سے روئے زمین کے کسی ملک یا قوم کا کوئی فرد محروم نہ رہ جائے۔ دنیا کی بہتیری زبانیں ایسی ہیں جن میں حروف تہجی تک معرض وجود میں نہیں تھے۔ پس مسیحی مبلغین کو ان کے حروف تہجی کو اختراع کرنا پڑا تاکہ وہ بائبل شریف کا اس زبان میں ترجمہ کر سکیں۔ مسیحی مبلغین نے نابیناؤں تک کو کتاب مقدس کے مطالعہ سے محروم نہیں رکھا اور ہر سال ان کے لئے کتاب مقدس کے ترجمے تیار کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے

۱۹۳۷ء کے آخر تک ۴۱ مختلف زبانوں میں کتابِ مقدس کو نابیناؤں اور اندھوں کے لئے تیار کیا تھا۔ اب ۶۲ء میں امریکن بائبل سوسائٹی نے کتاب مقدس کے قریباً تریسٹھ ہزار (تراجم) "بریل[1]" کے چھاپہ میں نابیناؤں کے لئے شائع کئے۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ بائبل سوسائٹیاں اسی کوشش میں ہیں کہ دنیا کی تمام زبانوں میں کتاب مقدس کا ترجمہ ہو جائے تاکہ روئے زمین کے ممالک واقوام پر اتمام حجت ہو جائے اور قیامت کے روز مبلغین سرخرو ہوں۔ اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی گیارہ سے لے کر چودہ نئی زبانوں میں کتاب مقدس اور اس کے حصص کا ترجمہ کر دیتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا جب اس دنیا میں کتاب مقدس یا اس کے حصص کا دنیا کی کسی نہ کسی نئی زبان میں ترجمہ نہیں ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بائبل شریف کی اعجازی طاقت پر دلالت نہیں کرتا؟

(۴)

بائبل شریف کے ترجموں کے متعلق ایک اور بات قابل غور ہے۔ بائبل مقدس کی اصلی زبان اس قسم کی ہے کہ دنیا کی جس زبان میں بھی اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے، اس میں ترجمہ کا لطف اصلی زبان کا سا نظر آتا ہے۔ کلمۃ اللہ کا کلام بلاغت و وضاحت سے پُر ہے، جیسا ہم نے اپنی کتاب قدامت واصلیت اناجیل کی جلد دوم میں ثابت کر دیا ہے۔ اس میں کوئی بات بھدی نظر نہیں آتی، بلکہ ترجمہ کی عبارت تک نہایت سلیس اور رواں ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کتاب مقدس کے انگریزی ترجمہ کو لیں۔ تمام انگریزی علم ادب کو چھان مارو زبان کے لحاظ سے آپ کو کوئی (کتاب) اس کے انگریزی ترجمے سے اعلیٰ پایہ کی نہیں ملے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کتاب مقدس کے مصنفین نے اس کو انگریزی زبان میں لکھا تھا۔ انجیل شریف کے اردو ترجمہ کو لے لیجئے۔ (اس کی زبان) ایسی صاف، سلیس اور رواں ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجیل کے مصنفین نے اس کو اردو زبان میں لکھا تھا۔ مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد نے بار بار اس اردو ترجمہ کو سراہا ہے جس میں کوئی سبک (بے تعلق) لفظ نہیں ہے۔ یہی حال فارسی اور دیگر تراجم کا ہے۔

کتاب مقدس کی زبان، عبارت، الفاظ اور محاورات ہی ایسے ہیں کہ دنیا کی ہر زبان میں باآسانی ترجمہ ہو سکتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہی زبان کتاب مقدس کی اصلی زبان ہے۔ کلام کی بلاغت، بیان کی لطافت، زبان کی سلاست، بندش کی چستی، موزوں الفاظ و محاورات، تمثیلات و تشبیہات کی دلآویزی نے سونے پر سہاگے کا کام کر دیا ہے۔ دیگر مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کا یہ حال نہیں۔ ان کی زبان اور عبارت ایسی ہے کہ وہ دوسری زبانوں میں باآسانی ترجمہ نہیں کی جا سکتیں اور اگر بصد مشکل ان کا ترجمہ ہوتا بھی ہے تو ناظر کو فوراً پتا چل جاتا ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب پڑھ رہا ہے جو اس کے ملک اور قوم کی نہیں۔ ترجمہ بھدا اور عبارت مغلق (مشکل۔ دوراز فہم) اور اسی قسم کی ہوتی ہے کہ اصلی زبان کا مدعا دوسری زبان میں کماحقہ ادا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے انگریزی تراجم جو مسیحی علما نے کئے ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں، لیکن کوئی ترجمہ بھی ایسا نہیں جس میں کتاب مقدس کے انگریزی ترجمے کی سی خوبیاں موجود ہوں۔ مثال کے طور پر آپ قرآن کو لیں۔ اس کے انگریزی تراجم جو مسیحی علما نے کئے ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں۔ پامر کا ترجمہ بے مثل ہے۔ مسلمان علما نے بھی اس کے ترجمے انگریزی میں کئے ہیں، لیکن کوئی ترجمہ بھی ایسا نہیں جس میں کتاب مقدس کے انگریزی ترجمہ کی سی خوبیاں موجود ہوں۔ قرآن کے ان انگریزی تراجم کی عبارت بھدی اور طرز تحریر کرخت ہے۔ ناظر فوراً پڑھتے ہی بھانپ جاتا ہے کہ یہ ایک ترجمہ ہے جو غیر مانوس ہونے کی وجہ سے اس کو اپیل نہیں کرتا اور اس کے جذبات کو متاثر نہیں کر سکتا۔ کوئی صحیح العقل شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ اگر کسی نے انگریزی علم ادب کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ انگریزی ترجموں کو پڑھے۔ ان

---

[1] ۔ بریل (Braille) اندھوں کے لئے ابھرے ہوئے حروف کا نظام طباعت۔ اندھے حروف کو ہاتھ سے چھو کر عبارت پڑھتے ہیں۔

مذاہب کے علمانے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ ان کتب کا اردو میں اس قسم کا ترجمہ کریں جس طرح انجیل شریف کا اردو میں موجود ہے۔ بیسیوں علمانے اس میدان میں زور آزمائی کی اور ان مترجمین میں سے بعض (ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کی مانند) نہ صرف اہل زبان، بلکہ اردو علم وادب کے فاضل استاد بھی تھے، لیکن سب ناکام رہے۔ انجیل کے ترجمہ کے مقابل یہ حال دیگر مذاہب کی کتب کا ہے۔ مثلاً ویدوں، ژند[1] واُستا[2] وغیرہ کا ترجمہ ہوا ہی نہیں اور اگر ہوا بھی ہے تو ان کے الفاظ، محاورات، عبارت وغیرہ کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک خاص ملک اور قوم کے ساتھ ہی مختص ہے۔ اردو کے ناظرین ان تراجم کو دیکھ کر ان کے عیوب ونقائص سے فوراً واقف ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ البقرہ کی پہلی آیت کا ترجمہ لیں "الم، اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ ہدایت ہے پرہیز گاروں کے لئے (ترجمہ نواب محمد حسین قلی خان)۔ "الم، یہ کتاب نہیں شک بیچ اس کے راہ دکھاتی ہے واسطے پرہیز گاروں کے" (ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلوی) "الم۔ اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو" (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی) "الم یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں راہ بتانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو" (ترجمہ اشرف علی تھانوی)۔ الم، یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں متقیوں کے واسطے ہدایات ہے" (ترجمہ ڈاکٹر عبدالحکیم)۔ الم، یہ وہ کتاب ہے جس (کے کلام الٰہی ہونے) میں کچھ شک نہیں پرہیز گاروں کی راہ نما ہے۔ (ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد) الف۔ لام۔ میم یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں متقی انسانوں پر فلاح وسعادت کی) راہ کھولنے والی" (ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد) مذکورہ بالا تمام تراجم بے لطف اور زبان کے لحاظ سے ایک بھی ایسا نہیں جو مطلب خیز ہو۔ کسی میں لفظوں کا زیادہ لحاظ کسی میں معنوں پر زیادہ زور کسی میں محاورات کی بھرمار اصلی غیر مانوس عبارتِ قرآنی (الف۔ لام۔ میم) ہر ایک میں موجود ہے جس کا مطلب کوئی شخص نہیں جانتا۔ ترجمہ کے عیوب ونقائص مترجمین کی نالیاقتی کی وجہ سے نہیں بلکہ قرآن کی اصل عبارت ہی ایسی ہے کہ اس کو دنیا کے ممالک کی اقوام اپنی مادری زبان میں پڑھ نہیں سکتیں کیونکہ اس کا دنیا کی زبانوں میں ترجمہ ہو نہیں سکتا اور اگر ہوتا ہے تو ان اقوام کے لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کی دینی کتاب کو پڑھ رہے ہیں جو ان کی اپنی قوم کی نہیں ہو سکتی یہی حال دیگر مذاہب کی کتب کا ہے۔ ان کے الفاظ محاورات۔ عبارت وغیرہ کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک خاص ملک اور قوم کے ساتھ ہی مختص ہے۔ مثلاً قرآن میں اگر فصاحت وبلاغت ہے تو صرف اہل عرب اس کی قدر کر سکتے ہیں۔ غیر مذہب کے لئے وہ زبان ایسی ہے کہ جب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو وہ ان کے جذبات کو متاثر ہی نہیں کر سکتی۔ اسی طرح سنسکرت کی کتاب میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف ہندو سنسکرت دان ہی اس کو جان سکتے ہیں۔ جب غیر ہنود اور غیر سنسکرت دان اس کے ایک دو فقروں کو پڑھ لیتے ہیں تو ان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ یہی حال ژند واُستا کا ہے۔ اس کا جو انگریزی ترجمہ ہوا بھی ہے اس کو پڑھ کر غیر پارسیوں کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دینی کتب (قرآن، وید، ژند، استا وغیرہ) صرف ایک ملک یا قوم کے حالات کے ساتھ ایسی وابستہ ہیں کہ وہ دیگر ممالک واقوام واز منہ کے لئے غیر موزوں ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والوں کے حلقہ کے باہر (اور اندر بھی) ان کتب کے مضامین سے کوئی واقف نہیں ہوتا اور ان کا ترجمہ غیر زبانوں میں نہیں کیا جاتا۔ صرف بائبل شریف ہی ایک ایسی کتاب ہے جو دنیا کی تقریباً تمام معلوم زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور جس ملک اور قوم کی زبان میں بھی اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے، اس ملک اور قوم کے افراد کے جذبات کو وہ متاثر کر دیتی ہے۔ یہ حقیقت ثابت کرتی ہے کہ روئے زمین پر بائبل شریف کے سوا اور کوئی کتاب عالم گیر نہیں ہے۔ کیونکہ صرف یہی کتاب دنیا کی تمام اقوام کی زبانوں میں ان کی مادری زبان کی طرح ہی "اُم الکتاب" ہو کر بولتی ہے اور دنیا کے تمام ملکوں میں چلتی پھرتی، جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔

---

[1] ۔ پارسیوں کے پیشوا زرتُشت کی مقدس کتاب۔

[2] ۔ اوستا کا مخفف۔ آتش پرستوں کے پیشوا زرتشت کی تصنیف۔ ژند کی شرح۔

حاصل کلام

ہم نے اس فصل میں بیان کیا ہے کہ کلمۃ اللہ (مسیح) نے جو تصورِ خدا بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے، وہ ایسا ہے کہ ہر زمانہ، ملک اور قوم کا ہر فرد بشر یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس سے بہتر اور اعلیٰ تصور ناممکن ہے۔ مسیحیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا محبت ہے اور وہ بنی نوع انسان سے ابدی محبت رکھتا ہے۔ انسانی قوتِ متخیلہ اس سے بہتر تصور پیش نہیں کر سکتی۔ الٰہی محبت کا نتیجہ انسانی اخوت، مساوات اور محبت ہے اور یہی مسیحیت کا اخلاقی نصب العین ہے جس سے بہتر مطمح نظر (مرکز نگاہ۔ اصلی مقصد) کا ہونا محالات میں سے ہے۔ یہ نصب العین کامل ہے جو روئے زمین کی اقوام کی دینی اور دنیاوی ضروریات کو پورا کرتا ہے (کلسیوں ۲: ۳) اور اپنے اندر تمام ممالک اور ازمنہ کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے میں مدد و معاون ہے۔ مسیحیت کا نصب العین کسی خاص مقام، ملک یا وقت یا قوم کا نصب العین نہیں ہے۔ ابتدا ہی سے مسیحیت کا یہ مقصد رہا ہے کہ تمام زمانوں، تمام ملکوں اور تمام انسانوں غرضیکہ کل کائنات کو اپنے وسیع اور لامحدود دائرہ کے اندر لائے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا بانی رحمت اللعالمین اور منجی عالمین ہے جو کل انسانوں کو نجات دینے اور کامل کرنے کے لئے آیا ہے۔ مسیحیت تمام بنی نوع انسان کو ایک واحد کلیسیائے جامع میں اکٹھا کرتی ہے۔ مسیحیت کے اصول دینی اور دنیاوی امور پر حاوی ہیں۔ وہ مادی عالم میں بھی ویسے ہی حکمران ہیں جیسے وہ اخلاقیات پر حکمران ہیں۔ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ مسیحیت بنی نوع انسان کو ہر زمانے میں یہ سبق دیتی آئی ہے کہ کائنات کی بنیاد روحانی اصول پر قائم ہے اور کہ اس مادی دنیا میں ہم حقیقی خوشی حاصل نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ ہم اپنے گردوپیش کے حالات اور دیگر تمام تعلقات میں ان روحانی اصولوں پر کاربند نہ ہوں۔ چونکہ مادی دنیا کی بنیاد روحانیت پر قائم ہے، پس ہم کو تمام امور اخوت و محبت اور مساوات کے اصولوں کے مطابق سرانجام دینے چاہئیں۔ ہماری تمدنی و معاشرتی زندگی، ہماری اقتصادی اور سیاسی زندگی غرضیکہ ہمارے تعلقات کی بنیاد روحانیت پر ہونی چاہیے۔ جب سے مسیحیت اس دنیا میں آئی دنیا کی ترقی کا راز اس ایک حقیقت میں مضمر رہا ہے۔ تاریخ عالم اس بات کی گواہ ہے کہ مسیحیت نے تمدنی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا ہے اور کوئی مستند مورخ ایسا نہیں جو اس واضح تاریخی حقیقت میں اور مسیحیت کی تعلیم اور اشاعت میں علت و معلول کا رشتہ قائم نہیں کرتا۔ مسیحیت اپنے اندر کل کائنات کو نئی مخلوق بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جہاں مسیحیت جاتی ہے، وہاں ایک نیا آسمان اور نئی زمین پیدا ہو جاتی ہے اور پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہتی ہے، کیونکہ ابن اللہ (مسیح) جو تخت پر بیٹھے ہیں کہتے ہیں کہ دیکھ میں ساری چیزوں کو نیا بنا دیتا ہوں (مکاشفہ ۲۱: ۱۔۵)۔ جنابِ مسیح کل بنی نوع انسان کے واحد منجی ہیں، جن کے علاوہ "۔۔۔آسمان کے تلے آدمیوں کو کوئی دُوسرا نام نہیں بخشا گیا جِس کے وسیلہ سے ہم نجات پا سکیں" (اعمال ۴: ۱۲)۔ یہی ایمان ہمیشہ ہے اور یہی ایمان مسیحیت اور مسیحی کلیسیا کی پشت پناہ رہا ہے او راسی ایمان کی قوت نے دنیا کے تمام مذاہب پر فتح پائی ہے (۱۔یوحنا ۵: ۴)۔ تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے روشن گواہ ہیں کہ دنیا میں کوئی مذہب یا فلسفہ ایسا نہیں ہوا جس کے پیروؤں کی دینی، ذہنی اور روحانی ضروریات کو کلمۃ اللہ (مسیح) نے کامل طور پر پورا نہ کیا ہو۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ یہ مذاہب اور فلسفہ ان ضروریات کو کبھی اس احسن طور پر پورا نہ کر سکے جس طرح منجی کونین نے پورا کر دیا ہے۔ وہ اپنی ناکامی کی وجہ سے مسیحیت کے سامنے قائم نہ رہ سکے اور کلمۃ اللہ (مسیح) بالآخر غالب ہوئے۔ "وہ غلبہ جِس سے دُنیا مغلوب ہُوئی ہے ہمارا اِیمان ہے" (۱۔یوحنا ۵: ۴)۔ ابن اللہ بنی نوع انسان کی ضروریات کا "اول اور آخر" ہے اور وہ "ابدالآباد زندہ" ہے (مکاشفہ ۱: ۱۷)۔ وہی دنیائے مذہب پر اکیلا واحد حکمران ہے۔

گوئی بغیر واسطہ در گوش خا کئے
راز ے گزاں خبر نبود جبرئیل را

فصل دوم

مسیحیت جامع مذہب ہے

اس رسالہ کے باب اول میں عالم گیر مذہب کی خصوصیات پر بحث کرتے وقت ہم نے ذکر کیا تھا کہ عالم گیر مذہب کے لئے لازم ہے کہ اس میں خدا کا تصور اعلیٰ وارفع اور اس کی اخلاقیات کا نصب العین بلند پایہ کا اور اس کے اصول عالم گیر ہوں۔ جو زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان کا اطلاق تمام ممالک و اقوام اور ازمنہ پر ہو سکے۔ گزشتہ فصل میں ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صرف مسیحیت ہی ایک واحد مذہب ہے جو اس شرط کو پورا کر سکتا ہے۔

ا۔ مسیحیت اور دیگر مذاہب

مسیحیت کے عالم گیر ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ مذہب ادیان عالم کے بہترین اصول کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ ہم نے باب اول میں یہ ذکر کیا تھا کہ خدا نے ہر قوم کو ہدایت کا نور اس کے دل اور ضمیر میں عطا کیا ہے (اعمال باب ۱۷؛ رومیوں ۱: ۲۱)۔ قرآن مجید میں بھی آیا ہے کہ ہر امت میں خدا نے نذیر بھیجا ہے (سورہ فاطر رکوع ۳)۔ پس دنیا کے تمام مذاہب میں کم و بیش صداقت کے عناصر موجود ہیں جو ان کی کامیابی کا سبب رہے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ عناصر ان مذاہب میں باطل عناصر کے ساتھ خلط ملط تھے، وہ اس قابل نہ رہے کہ اقوام عالم کے ہادی ہو سکیں۔ وہ ایک خاص ملک یا قوم یا طبقہ یا پشت کی صرف خاص حالات کے اندر ہی راہ نمائی کر سکے۔ لیکن ان حالات کے باہر ان مذاہب کے اصول کا اطلاق نہ ہو سکا۔ چونکہ وہ اصول خاص حالات کے رونما ہونے کی وجہ سے وضع کئے گئے تھے۔ لہٰذا جب وہ صورت حالات بدل گئی، وہ اصول غیر مکمل ہونے کی وجہ سے ناکافی ثابت ہوئے۔ ان مذاہب میں جو صداقت کے عناصر تھے وہ ٹمٹماتے چراغ کی مانند رات کی تاریکی میں کچھ مدت کے لئے کسی خاص قوم کو چند قدم تک راہ دکھانے کا کام دیتے رہے اور بس۔ جونہی آندھی چلی یا تیل بتی ختم ہو گئی چراغ بجھ گیا اور شب کی تاریکی نے دنیا کو مثل سابق گھیر لیا۔ یوں یہ مذاہب اپنی عمر طبعی کو ختم کر کے دنیا کو اپنی حالت پر چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ مسیحیت کا یہ عقیدہ ہے کہ کل ادیان عالم میں جو صداقت کے عناصر ہیں وہ اس "حقیقی نور" یعنی جنابِ مسیح کے نور کی شعاعیں ہیں، جو ہر ایک آدمی روشن کرتا ہے (یوحنا ۱: ۹)۔ دنیا کی کل اقوام میں سے کسی کو خدا نے بغیر گواہ کے نہیں چھوڑا تاکہ وہ خدا کو ڈھونڈیں اور اس کو ٹٹول کر پائیں (اعمال ۱۴: ۱۷؛ ۱۷: ۲۷)۔ دنیا کے تمام مذاہب میں یہ قدرت کی طرف سے یہ روشنی موجود ہے (رومیوں ۱: ۱۹؛ ۲: ۱۴؛ یرمیاہ ۳۱: ۳۳)۔ کیونکہ "خدا کسی کا طرف دار نہیں بلکہ ہر قوم میں جو اس ڈرتا اور نیک عمل کرتا ہے وہ اس کو پسند آتا ہے" (اعمال ۱۰: ۳۴؛ رومیوں ۳: ۲۹)۔ یہ مذاہب اقوام عالم کو مسیح تک پہنچانے میں ان کے راہبر کا فرض ادا کرتے ہیں (گلتیوں ۳: ۲۴؛ متی ۵: ۱۷؛ رومیوں ۱۰: ۴؛ عبرانیوں ۹: ۹، ۱۰)۔

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گا ہے

حق تو یہ ہے کہ مقابلہ مذاہب کا علم اس حقیقت کو آشکارا کر دیتا ہے کہ کل اقوام کے مذاہب ''آنے والی'' مسیحیت کا پیش خیمہ اور ''سایہ'' ہیں، مگر اصل چیز مسیح میں ہے (کلسیوں ۲:۱۷)۔ وہ آسمانی مذہب کی نقل اور عکس کی خدمت کا کام سرانجام دیتے ہیں (عبرانیوں ۵:۸)۔ جو ان سے ''بزرگ تر اور کامل تر'' ہے (عبرانیوں ۹:۱۱)۔ مسیحیت ان تمام غیر مکمل صداقتوں کو اپنے اندر جمع رکھتی ہے، کیونکہ وہ ان سے زیادہ کامل ہے۔ مختلف ممالک اور مختلف اقوام کے مذاہب میں صداقت کے مختلف پہلو موجود ہیں، لیکن مسیحیت ہی اکیلا واحد مذہب ہے جو تمام دنیا کے ممالک و اقوام کے مذاہب کی صداقتوں کو ایک جگہ جمع کرتا ہے۔ کیونکہ مسیح شریعت و انبیا کا کامل کرنے والا ہے (متی ۵:۱۷؛ یوحنا ۱۰:۳۹)۔ انجیل مقدس میں ارشاد ہے کہ ان غیر مکمل مذاہب میں ''جتنی باتیں سچ ہیں اور جتنی باتیں شرافت کی ہیں اور جتنی باتیں واجب ہیں اور جتنی باتیں پاک ہیں اور جتنی باتیں پسندیدہ ہیں اور جتنی باتیں دل کش ہیں۔ غرض جو نیکی اور تعریف کی باتیں ہیں'' ہم ان کو نظر انداز نہ کریں (فلپیوں ۴:۸)۔ کیونکہ جو نور مسیحیت میں اپنی ساری شان و شوکت کے ساتھ چمکتا ہے، اس کی شعاعیں اقوام و مذاہب عالم کی حق اور سچائی کی طرف راہ نمائی بھی کرتی ہیں (یوحنا ۱۶:۱۳)۔ تمام رسولوں کی اور بالخصوص مقدس پطرس اور مقدس پولس کی تحریرات اور تقریرات (اعمال باب ۲؛ باب ۷؛ ۸:۳۰؛ ۱۰:۳۴؛ باب ۱۱؛ باب ۱۵؛ باب ۱۷) سے ظاہر ہے کہ جنابِ مسیح کے رسولوں نے اپنے سامعین کے مذاہب میں ''دل کش اور پسندیدہ'' باتیں پائیں۔ جن کے ذریعہ وہ لوگوں کو جنابِ مسیح کے قدموں میں لے آئے۔ خود کلمۃ اللہ نے اس قسم کے استدلال سے کام لیا تھا (یوحنا ۱۰:۳۴۔۳۶)۔

عبرانیوں کے خط کا مصنف یہ ثابت کر دیتا ہے کہ یہودیت ایک ابتدائی منزل تھی۔ جس کی انتہائی کڑی مسیحیت ہے۔ اسی طرح مقدس یوحنا نے یونانی فلسفہ میں لوگوس (کلام) کی تعلیم میں صداقت کے عناصر دیکھے۔ اس نے اپنی انجیل میں ثابت کیا کہ یہ صداقت اعلیٰ ترین اور افضل ترین حالت میں صرف مسیح کلمۃ اللہ میں پائی جاتی ہے۔ اس نے لوگوس کی اصطلاح کو گویا بپتسمادے کر تمام ناقص تصورات سے جدا اور پاک کر کے مسیحی علم کلام کا حصہ بنا دیا۔ پولس رسول نے ثابت کیا کہ مسیحیت یہودیت کی تکمیل ہے (رومیوں ۱۳:۱۰)۔ مہاتما بدھ کو خود اس بات کا احساس تھا کہ اس کا مشن محدود اور غیر مکمل ہے۔ چنانچہ موت سے پہلے اس نے آنند کو کہا:

> ''اس دنیا میں میں آخری بدھ نہیں ہوں۔ وقت مقررہ پر ایک اور بدھ ظاہر ہو گا جو قدوس ہستی ہو گا اور نیر اعظم ہو گا۔ جس کی گفتار صادق ہو گی اور جس کا نمونہ کامل ہو گا۔ وہ بنی نوع انسان کا قائد اعظم ہو گا اور تم پر تمام ابدی صداقتیں ظاہر کرے گا۔ وہ کامل انسان ہو گا جس کی زندگی میں تمام صداقتوں کا ظہور ہو گا۔ اس کے پیرو لاکھوں ہوں گے، گو میرے پیرو ہزار ہی ہیں۔ اس کا نام ہی ''محبتِ مجسم'' ہو گا۔۔۔۔''[1]۔

مقدس یوحنا رسول نے ثابت کر دیا کہ یونانی فلسفہ اور مذہب کی تکمیل مسیح میں ہے (افسیوں ۱:۱۰؛ کلسیوں ۱:۱۷)۔ آبائے کلیسیا اس صداقت پر زور دیتے ہیں کہ مسیح راہ حق اور زندگی ہے۔ پس جہاں حق کا عنصر ہے وہاں کلام حق موجود ہے جو اس قوم کی مسیح کی طرف ہدایت کر رہا ہے۔ جسٹن شہید اور سکندریہ کے کلیمنٹ نے یونان کے مذہب و فلسفہ میں ایسی باتیں پائیں جو ان کو مسیحیت کے قدموں میں لے آئیں۔ چنانچہ موخر الذکر کہتا ہے:

> ''جس طرح شریعت یہود کو مسیح تک لانے میں ان کی استاد بنی، اسی طرح فلسفہ یونانیوں کا استاد بنا[2]''۔

طرطلیان (Tertullian) (۲۰۰ء) غیر یہودی مذاہب کی نسبت کہتا ہے کہ:

---

[1] . The Gospel of Buddah ch XCVI, Maitreya pp 217+210(Open court publisher COCHICEG,15)

[2] . Stromateis

''ان میں ایسی صداقتیں موجود ہیں جو اپنے کمال میں صرف مسیحیت میں پائی جاتی ہیں''۔

کلیسیائے انگلستان کے اساقف نے ۱۹۰۸ء کی لیمبتھ (Lambeth) کانفرنس میں یہ ہدایت کی تھی کہ:

> مسیحیوں پر واجب ہے کہ بغیر کسی تامل کے غیر مسیحی مذاہب کی صداقتوں کو قبول کرلیں اور اس بات کو تسلیم کرلیں کہ رب العالمین کی منشا کے مطابق صداقت کے عناصر دنیا کی تمام اقوام کے مذاہب میں موجود ہیں۔ لازم ہے کہ مسیحی ان صداقتوں کے ذریعہ غیر مسیحی مذاہب والوں کو مسیح کے قدموں میں لے آئیں، کیونکہ وہی راہ اور حق (اور زندگی) ہے۔

۲۔ کل مذاہب کے اصول مسیحیت میں شامل ہیں

(۱)

جب ہم مسیحیت اور دیگر مذاہب کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اعلیٰ اصول اور اچھی تعلیم جو اِن مذاہب میں موجود ہے، وہ بدرجہ احسن مسیحیت میں پائی جاتی ہے۔ اقوام عالم کی ایک بھی روحانی ضرورت ایسی نہیں جس کو مسیحیت پورا نہیں کرتی۔ ہم ثابت کر آئے ہیں کہ انسانی فطرت کی تمام ضروریات اور تقاضے مسیحیت میں احسن طور پر پورے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضروریات دیگر مذاہب میں ادھورے طور پر ہی پوری ہوتی ہیں۔ جب مسیحیت کے اصول اور دیگر مذاہب کے اصول کو پیش نظر رکھ کر دونوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اس موازنہ سے مسیحی اصول کی روشنی زیادہ چمکتی ہے۔ یہ درحقیقت ایسا ہی ہے جیسا آفتاب کو چراغ دکھانا۔ دنیا کے مختلف کونوں کی تاریکی میں دیگر مذاہب کے اصول ٹمٹاتے چراغ کی طرح کام میں آئے۔ لیکن آفتاب نصف النہار کے سامنے یہ چراغ بے کار ہو جاتے ہیں۔ پھر سورج اور چاند کی روشنی کی کچھ حاجت نہیں، کیونکہ خدا کے جلال نے اس کو روشن کر رکھا ہے (مکاشفہ ۲۱: ۲۳)۔

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو راز مہ واختر کھلا

(غالب)

ہر صداقت پسند شخص خوشی سے قبول کرنے کو تیار ہوگا کہ ایک زمانہ تھا جب ان مذاہب کی روشنی متلاشیان حق کو خدا کی طرف لانے میں راہ نما کا کام دیتی رہی۔ لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جو صداقت کے عناصر ان مذاہب میں موجود ہیں، وہ اپنی پاکیزہ ترین شکل میں مسیحیت میں موجود ہیں۔ دنیا کے کسی مذہب میں بھی صداقت کا کوئی ایسا عنصر نہیں جو بدرجہ احسن مسیحیت میں موجود نہ ہو۔ جنابِ مسیح وہ آفتاب صداقت ہے جس کی شعاعوں نے ان عناصر کو ایسا منور کر رکھا ہے کہ انسان کی نگاہ خیرہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ''قومیں اس کی روشنی میں چلیں پھریں گی'' (مکاشفہ ۲۱: ۲۴)۔ یہ تمام مذاہب چھوٹی چھوٹی پہاڑی دھاریوں کی طرح ہیں اور مسیحیت سمندر کی طرح ہے۔

سالک را توئی رہبر ممالک را توئی زیور
محامدرا توئی مظہر معارفرا توئی منشا

جس طرح مسیحیت ایک جامع مذہب ہے اور اس میں تمام دیگر مذاہب کی صداقتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جنابِ مسیح کی شخصیت ایک جامع شخصیت ہے جس میں کل بانیان مذاہب کی اعلیٰ ترین صفات بدرجہ احسن پائی جاتی ہیں۔ پس تمام دنیا کے اولیا، انبیا اور مصلحین کے اصول،

تعلیم و زندگی، مسیحیت اور مسیح میں موجود ہیں۔ مسیحیت ایک ایسا جامع مذہب ہے جس میں ہم کل ادیان عالم کی تمام صداقتوں کو اعلیٰ ترین صورت میں پاتے ہیں۔ مختلف مذاہب کی مختلف صداقتیں مسیحیت میں جمع ہیں اور ابن اللہ کی قدوس ذات روحانیت کا بحر ناپیدا کٹھ ہے۔ مسیح میں حکمت اور معرفت کے سارے خزانے چھپے ہیں (کلسیوں ۲: ۳)۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب صرف چند ایک صداقتوں پر زور دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ پر وہ صداقت کے دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن مسیحیت کا یہ جلال ہے کہ وہ تمام صداقتوں کو اپنے اندر جمع کرتی ہے اور سچائی کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ مثلاً ہندو دھرم اس صداقت پر زور دیتا ہے کہ خدا ہمارے اندر ہے، لیکن گناہ کی حقیقت اور وجود کو قطعی طور پر نظر انداز کر کے اس صداقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ خدا کی ذات پاک اور قدوس ہے۔ اسلام خدا کو خدائے واحد اور برتر و تعالیٰ مانتا ہے، لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ خدا کی ذات محبت ہے۔ وہ اس کو سلطان السلاطین مانتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ ہمارا باپ ہے جو ہر گناہ گار سے ابدی محبت رکھتا ہے اور اس کو بچانے کے لئے بے قرار ہے۔

مسیحیت میں وہ تمام صداقتیں پائی جاتی ہیں جن کو دیگر مذاہب نظر انداز کر دیتے ہیں یا جن سے وہ کلیتہً ناواقف ہے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم میں صداقت کے وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جن کو مختلف مذاہب تسلیم کرتے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر عناصر بھی پائے جاتے ہیں جو ان مذاہب میں موجود نہیں، اگرچہ وہ بھی حقیقی روحانی حقائق ہیں۔ مثلاً ہندو دھرم کی یہ تعلیم ہے کہ خدا اپنی کائنات کے اندر موجود ہے۔ یہودیت اور اسلام اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ خدا کائنات سے بلند و بالا اور برتر و ارفع ہے۔ بدھ مت تعلیم دیتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے اور ہماری چند روزہ زندگی ایک نہایت اہم شئے ہے۔ چین کا مذہب دنیاوی تعلقات اور معاشرت کے اصول کو واضح کرتا ہے۔ اب جو شخص کلمۃ اللہ کی تعلیم سے واقف ہے وہ جانتا ہے کہ یہ تمام اصول نہایت اعلیٰ، ارفع اور پاکیزہ ترین شکل میں مسیحیت میں موجود ہیں اور ان کے علاوہ دیگر روحانی حقائق بھی موجود ہیں جن کو یہ مذاہب نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(۲)

ہمیں اس امر کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ دیگر ادیان عالم میں جہاں چند صداقتیں پائی جاتی ہیں، وہاں ان میں ایسی متعدد باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو روحانیت کے منافی اور مخرب اخلاق ہیں۔ یہ مذاہب اس گھنے جنگل کی مانند ہیں جہاں دن میں بھی تاریکی ہوتی ہے، گو وہاں آفتاب کی شعاعیں کہیں کہیں داخل ہو ہی جاتی ہیں۔ صرف مسیحیت ہی اکیلا ایسا مذہب ہے جس میں مخرب اخلاق باتیں تو درکنار ناپاکی اور بدی کا سایہ تک نہیں ملتا۔ اس کا بانی ایک ایسی قدوس ہستی ہے جس کی زندگی اور تعلیم نے کروڑہا شیطان صفت انسانوں کو قدوسیوں کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ دیگر مذاہب میں صداقت کا ایک عنصر بطالت کے بے شمار عناصر کے ساتھ ملا جلا دکھائی دیتا ہے۔ اگر ہم ان تاریک پہلوؤں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو ہم ایک روشن حقیقت کو جھٹلائیں گے اور نہ صرف خود گمراہ ہوں گے، بلکہ حق کے متلاشیوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ ان مذاہب کی قوت ان کے عنصر صداقت کی وجہ سے ہے۔ لیکن ان کے مخرب اخلاق عناصر ان مذاہب کی کمزوری اور ناکامی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ جس حد تک ان مذاہب میں بطالت کی آمیزش کر کے عناصر موجود ہیں، اس حد تک وہ مذاہب باطل ہیں۔ اگر خدا کے متعلق ان کے تصورات غلط ہیں یا اگر گناہ اور نجات کی نسبت ان کے خیالات باطل ہیں یا اگر ان کے اصول مخرب اخلاق اور ان کی رسمیات بد ہیں۔ اگر ان کی تعلیم میں شرک یا بت پرستی، تعداد ازدواج یا ذات پات کی قیود ہیں یا ان کی عبادت بگڑی ہوئی ہے اور دیوداسی وغیرہ ان کی عبادت کا جزو ہیں۔ جس حد تک ان میں یہ باتیں پائی جاتی

ہیں،اس حد تک وہ یقیناً باطل ہیں اور کوئی استدلال باطل کو حق نہیں بنا سکتا۔ دیانت داری اور حق شناسی ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم ان باطل عناصر کو فی الحقیقت باطل جانیں اور باطل مانیں اور ان کو رد کریں۔

یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ ان غیر مسیحی مذاہب میں جو کلمۃ اللہ کی بعثت کے وقت دنیا میں مروج تھے، ہر قسم کی بدی نے پناہ لے رکھی تھی۔ پس مسیحیت نے تمام دنیا کو ان مذاہب باطلہ کے باطل عناصر کی طرف سے خبر دار کیا ہے۔ ہم نے اپنے رسالہ نور الہدیٰ[1] میں ان مذاہب کی مفصل طور پر توضیح، تنقیح اور تنقید کی ہے اور ناظرین کی توجہ اس رسالہ کی جانب مبذول کرتے ہیں۔ مقدس پولس نے ان مشرکانہ مذاہب کی رسوم بد کو "شیطانی" قرار دے دیا تھا (۱۔کرنتھیوں ۱۰: ۱۴۔۲۲)۔ آغاز مسیحیت میں آبائے کلیسیا کی تحریرات بھی ان مذاہب باطلہ کی بطالت کو تشت از بام کر دیتی ہیں۔ مقدس اگنیتیس (Ignatious) جو ۱۰۷ء میں شہید ہوا اور جسٹن شہید (Justin) ۱۰۵ء میں ان کی تحریرات مقدس پولوس کی ہم نوا ہیں۔ شیئن (Tation) (۱۷۰ء) گو بدعتی تھا تاہم مذاہب باطلہ کی نسبت لکھتا ہے کہ:

> "ان مذاہب میں کفر اور فسق و فجور پایا جاتا ہے جس سے انسان کی روح کو صدمہ پہنچتا ہے۔ یونانی اور رومی معبود بدی کے مجسمے ہیں۔ ان کی دیویاں کسبیاں ہیں، جن کی تمام عمر بد چلنی اور بدکاری میں گزری۔ اس قسم کے دیوی دیوتاؤں پر ایمان رکھنے کی بجائے جو دغا باز ہیں ہم نے ایک خداوند پر ایمان رکھنا سیکھا ہے جو محب صادق ہے"۔

تھیوفلس (Theophilus) (۱۵۰ء) کہتا ہے کہ:

> "بت پرستوں کو مخاطب کر کے جن معبودوں کی تم پرستش کرتے ہو، وہ مردے ہیں اور جب وہ زندہ تھے تو ان سے بدترین افعال سرزد ہوتے تھے۔ زحل (Saturn) مردم خوار تھا جس نے اپنے بچوں تک کو نگل لیا۔ مشتری (Jupiter) زناکاری اور شہوت پرستی کے لئے چار دانگ عالم میں مشہور تھا۔ تمہارے معبودوں کے قصص عقل مندوں کے نزدیک مضحکہ خیز ہیں۔ ان کے اقوال و افعال ارباب دانش کے نزدیک رد کرنے کے قابل ہیں"۔

مسیحیت نے اپنے روحانی اور جامع اصول کی اندرونی طاقت کی وجہ سے اپنے عالم گیر اصول اور اعلیٰ تصورات کی وجہ سے، اپنے ایمان کی قوت کی وجہ سے، اپنی کتب مقدسہ کی دل آویزی کی وجہ سے، غم اور دکھ اور رنج کے مسئلہ کو حل کرنے کی وجہ سے، اعلیٰ ترین تصور خدا کی وجہ سے اور کل بنی نوع انسان کو نجات کا علم اور نئی زندگی بخشنے کی وجہ سے تمام مشرکانہ اور باطل مذاہب پر فتح پائی۔ ان امور کا مفصل ذکر ہم اپنے رسالہ نور الہدیٰ میں کر چکے ہیں۔

بڑی سے بڑی بات جو مسیحیت نے ان مشرکانہ مذاہب اور دیگر ادیان عالم اور فلسفہ کے حق میں کہی یہ تھی کہ ان میں بھی صداقت کا عنصر موجود ہے اور کہ یہ عنصر آفتاب صداقت یعنی کلمۃ اللہ کی شعاعوں کا عکس ہے۔ مقدس یوحنا کے الفاظ میں کلمۃ اللہ "حقیقی نور" ہے جو ہر ایک آدمی کو روشن کرتا ہے (یوحنا ۱: ۹)۔ اس نور کی روشنی ہر مذہب میں کم و بیش چمکتی ہے تاکہ ان کے پرستار اس روشنی کے ذریعہ "حقیقی نور" کے پاس آسکیں۔ ان مذاہب کی ٹمٹماتی روشنی لوگوں کو خداوند کے قدموں تک لانے میں راہ نما کا فرض ادا کر سکتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مذہب گواہی کے

---

[1] ۔ یہ رسالہ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انار کلی لاہور سے مل سکتا ہے۔ (برکت اللہ)

لئے آیا تاکہ نور کی گواہی دے تاکہ سب اس کے وسیلے سے ایمان لائیں۔ وہ خود تو نور نہ تھا، مگر نور کی گواہی دینے کے لئے آیا تھا(یوحنا۱:۷،۸)۔ یہ نور مختلف مذاہب کی تاریکی میں چمکتا ہے۔

جس طرح ان مذاہب باطلہ میں تاریکی اور بطالت کے عناصر موجود ہیں، اسی طرح دورِ حاضرہ کے غیر مسیحی مذاہب میں ایسے عناصر ہیں جن کا تعلق تاریکی اور بطالت کے ساتھ ہے۔ یہ حالت کسی ایک مذہب کی نہیں، بلکہ ان تمام غیر مسیحی مذاہب کی ہے جو فی زمانہ مختلف ممالک میں موجود ہیں۔ ان مذاہب میں مختلف اقسام کی برائیوں نے پناہ پائی ہوئی ہے جو روا اور جائز خیال کی گئی ہے۔ کنفیوشس (Confucius) اور ٹاؤ(Tao) کے مذاہب میں شرک اور بت پرستی اور مدخولہ عورات کا رکھنا جائز ہے۔ ہندو دھرم میں ہمہ اوستی خیالات، شرک، بت پرستی، ذات پات، دیوداس تعداد ازدواجی وغیرہ جائز ہیں۔ چنانچہ مشہور جرمن فلاسفر ڈاکٹر البرٹ سویٹزر(Schweitzer) کہتا ہے کہ:

> ''ہندو دھرم میں شرک اور وحدانیت، ہمہ اوستی اور ملحدانہ خیالات، ترس اور رحم کی تعلیم، ہر طرح کے اخلاقی افعال سے پرہیز رکھنے کی تعلیم، دیوتا پرستی، اوہام پرستی غرضیکہ مختلف قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس بات کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہ یہ تصورات اور خیالات ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان مختلف اور متضاد اصولوں کو یکجا نہیں کر سکتی۔ یہ صداقت اور بطالت کے عناصر ملے جلے ایک کچکول (بھیک کی جھولی) میں پڑے ہیں''۔

گویا صداقت کا عنصر بطالت کے عناصر کے جال میں چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔ ان غیر مسیحی مذاہب کے اچھے اصول اس بیج کی مانند ہیں جو جھاڑیوں میں گرا اور جھاڑیوں نے بڑھ کر اس کو دبا لیا اور بے پھل رہ گیا(متی ۱۳: ۲۲)۔ یہاں تک کہ یہ مذاہب جھاڑیاں ہی رہ گئیں جنہوں نے اپنے پیروؤں کو ترقی کی شاہ راہ پر گامزن نہ ہونے دیا۔ لیکن یہی اچھے اصول اور نیک جذبات مسیحیت میں نشوونما پا کر اس بیج کی مانند ہو جاتے ہیں جو اچھی زمین میں بویا گیا اور پھل بھی لاتا ہے۔ کوئی (اصول) سو گنا پھل لاتا ہے، کوئی ساٹھ گنا(متی ۱۳: ۲۳)۔

تو جسم شرع را جانی تو در رسل کافی تو گنج کا یزدانی۔ تو رآنی

(۳)

چونکہ اس رسالہ میں ہم تمام ادیان عالم کا ذکر نہیں کر سکتے اور ہمارا روئے سخن صرف شمال کے باشندوں (شمالی ہندوستان) کی جانب ہے۔ لہٰذا ہم یہاں مختصر طور پر صرف ان مذاہب کا ذکر کریں گے جو شمال میں رائج ہیں یعنی ہندو دھرم اور اسلام، تاکہ ناظرین پر ظاہر ہو جائے کہ ان مذاہب میں بعض صداقتیں موجود ہیں جو ہم کو ان میں صرف دھندلی سی نظر آتی ہیں۔ لیکن مسیحیت میں یہی صداقتیں بدرجہ احسن موجود ہیں۔ یہ مذاہب کسی ایک صداقت پر زور دیتے ہیں، لیکن مسیحیت کی تعلیم میں ان تمام مذاہب کی صداقتیں ایک جگہ جمع ہیں اور مسیحی تعلیم ان مذاہب کے ناقص، غیر مکمل اور باطل عناصر سے سراسر پاک ہے۔

۳۔ ہندو دھرم کے اصول اور مسیحیت

(۱)

ہندو دھرم نے اپنی سوسائٹی کا انحصار چار ذاتوں پر رکھا ہے یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ اچھوت لوگ جو شمار میں کروڑوں ہیں ان ذاتوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارے بعض ہندو بھائی کہتے ہیں کہ ذاتیں تنظیم کی خاطر کی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں کبھی کوئی

ایسازمانہ آیاہو جب تنظیم کی خاطر ذات کا وچار مفید تھا۔ لیکن دور حاضرہ میں ذات پات کی قیود کی زنجیریں ہندو مذہب اور ملک کے لئے لعنت اور غلامی کا طوق ہو گئی ہیں۔ جس طرح کسی خنزیر کے دماغ میں یہ خیال نہیں آسکتا کہ وہ اپنے آقا کے دیوان خانے میں جاکر استراحت کرے۔اسی طرح ہندو سوسائٹی میں کسی اچھوت ذات کے آدمی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آسکتا کہ وہ اپناگھر کسی برہمن کی گلی میں جابنائے۔ جس طرح کالا کتا سفید نہیں ہو سکتا،اسی طرح کوئی شخص برہمن نہیں ہو سکتا۔منونے کہاہے کہ نیچ ذات کے لوگ پیدا ہی اس غرض کے لئے ہوئے ہیں کہ وہ برہمنوں کے غلام ہو کر رہیں۔اس نے حکم دیاہے کہ :

> ''چنڈال (ادنیٰ ذات کا)اور سواپک کے گھر قصبہ کے باہر ہوں۔ان کے برتن ٹوٹے پھوٹے ہوں۔ان کی دولت صرف کتوں اور گدھوں پر مشتمل ہو۔ان کے کپڑے صرف وہ ہوں جو مردوں کے بدنوں پر سے اتارے جائیں۔ان کے زیورات زنگ خوردہ لوہے کے ہوں۔ان کی مستقل جائے رہائش کہیں نہ ہوں۔کوئی شخص جس کو اپنے مذہب اور سماج کا ذرا بھی پاس ہے ان کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ رکھے۔ان کو مٹی کے برتن میں خوراک دی جائے اور دینے والے کا ہاتھ برتن کو لگنے نہ پائے۔وہ قصبوں اور شہروں میں صرف رات کو باہر نکلا کریں''1۔

ستیار تھ پرکاش میں سوامی دیانند جی بھی لکھتے ہیں ''چنڈال وغیرہ نیچ لوگوں کا کھانا نہیں کھانا چاہیئے''(ستیارتھ پرکاش اردو مطبوعہ ۱۹۰۸،صفحہ ۳۵۴)۔منو شاستر میں آیاہے کہ :

> عیب دار بدخصلت آدمی، مخنث،دھوکے وغیرہ کا اور شودر کا جھوٹا(جھوٹھا) نہیں کھانا چاہیئے(۴:۲۱۱) حور گانے والا، بڑھئی، سود خور، چغل خور، نٹ(بازی گر۔ایک نیچ قوم)،درزی اور احسان نہ ماننے والے کی روٹی نہیں کھانی چاہیئے۔لوہار،دھوبی،رنگ ریز(کپڑے رنگنے والا،نیلاری)،جلاد اور جس عورت کے گھر میں دوسرا شوہر ہو ان کی روٹی نہیں کھانی چاہیئے(منو شاستر ۴)۔شودر صرف اپنی ذات کی لڑکی سے اور ویش اپنی ذات اور شودر کی لڑکی سے اور کشتری(کھتری)اپنی ذات اور ویش و شودر کی لڑکی سے بیاہ کرے،لیکن برہمن چاروں ذاتوں کی لڑکیوں سے بیاہ کر سکتاہے(باب ۲)۔

ہم فصل اول میں ذکر کر چکے ہیں کہ مسیحیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا کل نوع انسانی کا باپ ہے جو بلا کسی امتیاز کے سب سے یکساں محبت کرتاہے اور کل بنی نوع انسان ایک دوسرے کے بھائی اور جنابِ مسیح میں ایک ہیں۔پس ذات پات کی قیود ان اصول کی عین ضد ہیں۔از روئے منطق دو متضاد قضایا میں سے اگر ایک صحیح اور درست ہو تو دوسرا غلط ہوتاہے۔چونکہ مسیحیت کے اصول ابوت الہٰی اور اخوت انسانی صحیح ہیں۔لہٰذا ذات پات کا وجود غلط اور باطل ہے۔پس مسیحی کلیسیائے جامع ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان اس کی پیدائش کی بنا پر کسی قسم کی تفریق کو جائز قرار نہیں دیتی۔کلمتہ اللہ جسمانی پیدائش پر نہیں،بلکہ روحانی پیدائش پر زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں''۔۔۔ جب تک کوئی آدمی پانی اور رُوح سے پَیدا نہ ہو وہ خُدا کی بادشاہی میں داخِل نہیں ہوسکتا۔جو جِسم سے پَیدا ہُوا ہے جِسم ہے اور جو رُوح سے پَیدا ہُوا

1. The Out-Cast's Hope p.2

ہے رُوح ہے۔۔۔"(یوحنا۳:۵۔۱۲؛۱:۱۳؛۲۔کرنتھیوں ۵:۱۷؛افسیوں ۲:۱۵)۔ حق تو یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں مسیحی کلیسیا ہی ایک واحد جماعت ہے جس میں ہر ذات کے انسان مساوی طور پر شامل ہیں۔

نہ افغا نیم ونے ترک وتتاریم
چمن زاد یم ازیک شاخسار یم
تمیز رنگ وبوبرما حرام است
کہ ماپرور دہ یک نو بہار یم

ہندوستان (کے برصغیر) میں مسیحی کلیسیا ایک واحد جماعت ہے جس میں برہمن، شیخ، سید، چوہڑے، چمار، چھتری، سکھ، ویش غرضیکہ ہر قسم کے لوگ برابر طور پر شامل ہیں، لیکن ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ان لوگوں کی لڑکیاں جو برہمنوں سے مسیحی ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے بیٹوں کو بیاہ دی جاتی ہیں جو چوہڑوں میں سے جنابِ مسیح کے قدموں میں آئے ہیں۔ یہ بات کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ اسلام کو اسلامی اخوت پر ناز ہے، پر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کوئی سید اپنی لڑکی کو کسی ایسے شخص کو نکاح میں دے دے جو "دین دار" یعنی چوہڑوں میں سے مسلمان ہوا ہو۔ مسیحیت کسی شخص کو اس کی پیدائش کی وجہ سے ناپاک یا اچھوت قرار نہیں دیتی، کیونکہ مسیحیت میں داخل ہو کر ہر شخص یکساں طور پر مسیح کا عضو، خدا کا فرزند اور آسمان کی بادشاہت کا وارث بن جاتا ہے۔

امتیازات نسل راپاک سوخت
آتش اوایں خس وخاشاک سوخت

پس ذات کے تصور میں جو صداقت کا یہ عنصر موجود تھا کہ سوسائٹی کی تنظیم ہو، مسیحیت میں یہ صداقت بطرز احسن پوری ہوتی ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی تنظیم آزادی، مساوات، انصاف اور محبت واخوت کی بناپر ہوتی ہے (افسیوں ۴:۱۔۱۶)۔ اہل ہنود کے خیال میں ذات کا یہ فائدہ ہے کہ اس کے ذریعہ پاکیزگی، شستہ (پاک۔خالص) اطوار اور تہذیب و کلچر قائم رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ خصوصیات پنچ ذات کے لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن مسیحیت نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ پاکیزگی، کلچر اور شستہ اطوار کل نوع انسانی کے لئے ہیں اور کسی ایک قوم یا ذات سے مخصوص نہیں۔ صرف برہمنوں نہیں، بلکہ سب کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ پاکیزہ اطوار کے لوگ ہوں اور ان کی روحیں خدا کے حضور پاک ہوں۔ ہندو مذہب اس صداقت کو صرف ایک خاص طبقہ تک محدود رکھتا ہے۔ مسیحیت اس کو سب انسانوں کے لئے عام کر دیتی ہے۔ یوں ہندو مذہب کی یہ صداقت مسیحیت میں بطرز احسن پوری ہوتی ہے۔ ہندو دھرم میں برہمن ایک ایسا شخص تصور کیا جاتا ہے جو دعا اور قربانی کے ذریعہ خدا کے حضور حاضر ہو سکتا ہے۔ مسیحیت کے مطابق یہ نہ صرف ایک طبقہ کا بلکہ ہر شخص کا پیدائشی حق ہے کہ وہ آسمانی باپ کے حضور دعا کے ذریعہ حاضر ہو۔ شودر کا یہ کام تھا کہ وہ باقی تین ذاتوں کی خدمت کرے۔ جنابِ مسیح نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ یہ ہر مرد اور عورت کا حق ہے کہ وہ دوسروں کی خدمت کرے۔ اس میں اپنی سرفرازی سمجھ کر اس قسم کی خدمت کے ذریعہ اپنی انانیت کو ترقی دے (متی ۲۰:۲۸)۔ ہندوؤں کا یہ خیال ہے کہ برہمن، کشتری اور ویش کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے حقوق کو استعمال کرنے سے پہلے دوسرا جنم لیں۔ لیکن کلمۃ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ ہر مرد اور عورت کے لئے لازم ہے کہ وہ خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے از سر نو پیدا ہو (یوحنا باب ۳) اور توبہ اور معافی کے ذریعہ خدا سے توفیق حاصل کر کے ایسی زندگی بسر کرے جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو۔ پس ذات کے تصور میں جو صداقت کے عناصر ہیں وہ مسیحیت میں

بطر ازاحسن موجود ہیں۔ لیکن ذات کی قیود کی برائیوں سے مسیحیت سراسر خالی ہے۔ مسیحیت میں ذات کی صداقت کے عناصر قائم رہتے ہیں، لیکن بطالت کے عناصر زائل ہو جاتے ہیں۔

(۲)

ہندو مت کے ہمہ اوستی خیالات عوام الناس کو گرویدہ نہیں کر سکتے۔ مجرد فلسفیانہ تصورات میں سرے سے یہ طاقت ہی نہیں ہوتی کہ وہ جذبات کو مشتعل کر سکیں یا افعال کے محرک ہو سکیں۔ لہٰذا عوام ہندو شرک کو اختیار کر کے لا تعداد معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ ہندوؤں کے دیوتاؤں کا شماران کی اپنی مردم شماری کی طرح کروڑوں پر مشتمل ہے۔ ان کروڑوں معبودوں میں سے وشنو کی شوا اور اس کی بیوی کالی کی ، کرشن کی اور رام اور اس کی بیوی سیتا کی خاص طور پر پوجا کی جاتی ہے۔ یہ حق ہے کہ تلسی داس، کبیر، رامانند وغیرہ کے خیالات دلوں کو موہ لیتے ہیں، لیکن عام طور پر یہ کہنا بجانہ ہو گا کہ ان دیوی دیوتاؤں کی پوجا میں ایسے عناصر موجود ہیں جو گھنونے، نفرت انگیز اور مخرب اخلاق ہیں اور دور حاضرہ میں روشن خیال ہندو ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ یہ دیوی دیوتا ہر گز پوجا کے لائق نہیں۔ ان کے اٹھارہ پرانوں کا مطالعہ عیاں کر دیتا ہے کہ وہ سب کے سب گناہوں کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

چنانچہ سورگیہ لیکھرام جی ''کلیات آریہ مسافر'' (صفحہ ۱۸۸) میں اور مہاشہ دھرم پال ''کفر توڑ'' (صفحہ ۲۸،۲۷) میں لکھتے ہیں کہ

> ''برہما نے اپنی بیٹی سے مجامعت کی اور جھوٹ بولنے کا مرتکب ہوا۔ کرشن ، گوپی [1] اور رادھکان [2] سے اور گوپیوں سے بدفعلی کرتا اور دودھ ،دہی، مکھن چراتا تھا۔ وشنو کو جلندھر کی بیوی سے عشق تھا۔ مہادیو کو رشیوں کی استریوں سے ناجائز محبت تھی اور اس نے ایک فاحشہ عورت سے بدکاری کی۔ وہ ہمیشہ بھنگ اور دھتورا [3] پیا کرتا تھا۔ سورج کو کنتی سے چندرماں کو اپنے گرو برہسپتی کی بیوی تارا سے مابو دیوتا کو کیسری کی عورت انجنی سے،ورون دیوتا کو اگست دیوتا کی ماں اروشی سے ناجائز عشق تھا۔ برہسپتی کو اپنے بھائی کی بیوی انتھا سے وشوامتر کو اروشی، پاراشر کو زودسے، بامن کو چھل سے ناجائز پیار تھا۔ بلدیو شراب کا متوالا تھا۔ رام چندر نے دھوکا دے کر بامی کو مار ڈالا۔ رام نے اپنی بیوی سیتا کو زنا کے شک میں گھر سے نکال دیا۔ حالانکہ وہ اس کو بے الزام سمجھتا تھا''۔

قصہ مختصر پرانوں کا مطالعہ اور دیوی دیوتاؤں کے افعال ہر سلیم الطبع شخص پر گراں گزرتے ہیں ۔ عموماً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ سامرتھی (زور آور) کو دوش نہیں، لیکن یہ دیوی دیوتا سامرتھی نہ تھے۔ کیونکہ وہ نفس امارہ کی خواہشوں کے قابو میں آکر خود بے قابو ہو کر بدعادات کے غلام تھے۔ ان میں یہ ساتھ (شراکت) نہ تھا کہ وہ اپنے گناہوں سے بچ سکیں۔

ع اوخود گمراہ است کرا رہبری کند

ہندو دھرم میں بت پرستی کا عام رواج ہے اور اس کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ نہ صرف عامتہ الناس ہندو بت پرست ہیں، بلکہ بڑے بڑے ہندو فلاسفر اور بھگت بت پرستی کے شیدائی تھے۔ مثلاً شینکر، مانکاواچکر، رامانجو، رامانند، تلسی داس، ٹکارام جیسے مہاتما پرش زمانہ ماضی میں اور گاندھی

---

[1] ۔ گوالن۔ کرشن جی کے ساتھ بچپن میں کھیلنے والی گوالوں کی لڑکیوں کا لقب۔

[2] ۔ اس کو رادھا بھی لکھا جاتا ہے۔ کرشن جی کی ایک پیاری گوپی۔

[3] ۔ ایک پودا جس کا بیج نشہ آور ہے اور بطور دوا استعمال ہوتا ہے۔

جیسے دور حاضرہ میں بتوں کی پوجا کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے ہندو برادران بت پرستی کے جواز میں کہتے ہیں کہ ہم اس طریقہ سے اپنے معبود حضوری کو محسوس کر سکتے ہیں اور یہ مان سکتے ہیں کہ خدا ان کے ذریعہ اپنا مکاشفہ لوگوں کو دیا ہے۔ اگر یہ وجوہ صحیح ہیں تو بت پرستی میں یہ صداقت کے عناصر تھے جو دیگر توہمات کے ساتھ اس قدر خلط ملط ہو گئے کہ ان عناصر کی ٹمٹماتی روشنی بجھ گئی۔ مسیحیت میں صداقت کے ان عناصر پر زور دیا گیا ہے۔

مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ ''اگلے زمانہ میں خُدا نے باپ دادا سے حِصّہ بہ حِصّہ اور طرح بہ طرح نبیوں کی معرفت کلام کر کے۔ اِس زمانہ کے آخر میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا جِسے اُس نے سب چِیزوں کا وارِث ٹھہرایا اور جِس کے وسیلہ سے اُس نے عالم بھی پَیدا کئے۔ وہ اُس کے جلال کا پرتَو اور اُس کی ذات کا نقش ہو کر سب چِیزوں کو اپنی قُدرت کے کلام سے سنبھالتا ہے۔ وہ گناہوں کو دھو کر عالم بالا پر کبریا کی دہنی طرف جا بیٹھا'' (عبرانیوں ۱:۱۔۳)۔ ابن اللہ (جنابِ مسیح) نے کامل طور پر خدا کی ذات کو ہم پر ظاہر کر دیا ہے۔ ایسا کہ آپ نے فرمایا ''میں باپ (پروردگار) میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے'' (یوحنا ۱۴:۱۰) اور ''جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ (پروردگار) کو دیکھا'' (یوحنا ۱۲:۴۵)۔ جنابِ مسیح اندیکھے خدا کی صورت ہے (کلسیوں ۱:۱۵) جس میں الوہیت کی ساری معموری سکونت کرتی ہے (کلسیوں ۱:۱۹)۔ پس ہندو دھرم کی بت پرستی میں جس صداقت کا وجود بتایا جاتا ہے وہ بطرز احسن جنابِ مسیح کی شخصیت میں پائی جاتی ہے۔ لیکن بت پرستی کا باطل پہلو یعنی شرک وغیرہ کا مسیحیت میں دخل تک نہیں۔

کیونکہ کلمۃ اللہ کی تعلیم خدا کی وحدانیت پر اصرار کرتی ہے (مرقس ۱۲:۲۹؛ رومیوں ۳:۳۰؛ ۱۔کرنتھیوں ۸:۴،۶؛ گلتیوں ۳:۲۰؛ افسیوں ۴:۶؛ ۱۔تیمتھیس ۱:۱۷؛ ۲:۵)۔

(۳)

شرک کا عنصر ہندو دھرم میں غالب ہے۔ لیکن وہ ایک ایسا مشرکانہ مذہب ہے جس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ایک اخلاقی موحدانہ مذہب ہو جائے۔ لیکن اس کے مصلحین کو اس بات میں ارمان اور حسرت ہی نصیب ہوتی ہے، کیونکہ ان میں یہ جرأت نہیں کہ شرک کی طاقت کو مٹا دیں۔ اس مذہب کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اپنے بے شمار معبودوں میں سے ایک دیوتا کو مہادیو بنا دیتا ہے۔ عموماً یہ دیوتا وشنو (کرشن) ہوتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہندومت موحدانہ مذاہب کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے اور دیگر اوقات وہ مشرکانہ مذاہب کی صف میں کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اہل ہنود اس غلط دلیل سے اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں کہ جن معبودوں کی عامۃ الناس پرستش کرتے ہیں، وہ درحقیقت خدائے بزرگ کے مختلف روپ ہیں اور کہ وہ درحقیقت ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی دلیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شرک توحید کے خیال کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور وحدت الٰہی کا تصور غائب ہو جاتا ہے۔ ہندو مذہب کی ان تمام اصلاحی کوششوں میں ہم صداقت کا یہ عنصر پاتے ہیں کہ خدا ایک اخلاقی ہستی ہے جس کی محبت کے سپرد انسان اپنے آپ کو کر سکتا ہے۔ بعض اوقات اس صداقت کے عنصر کی وجہ سے ہندو مذہب ایسے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے جن سے مسیحیت کی بو ٹپکتی ہے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ جس شخص نے انجیل جلیل کا سطحی نظر سے بھی مطالعہ کیا ہے، وہ جانتا ہے کہ صداقت کا یہ عنصر کامل طور پر صرف مسیحیت میں ہی پایا جاتا ہے۔ ہندو دھرم ایک اخلاقی مَت (مذہب) نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس میں شرک اور بت پرستی کے باطل عناصر غالب ہیں اور جن کی وجہ سے ہندو مذہب میں یہ صلاحیت نہیں رہتی کہ وہ خدا کو ایک واحد، کامل، حقیقی، اخلاقی ہستی مان سکے۔ لیکن مسیحیت ان باطل عناصر سے پاک ہے۔ لہٰذا اس میں خدا کے واحد، کامل اور بے مثل اخلاق ہستی ہونے کا اعلیٰ ترین تصور پایا جاتا ہے۔

(۴)

ہندو دھرم میں کرم کے عقیدے میں صداقت کا یہ عنصر پایا جاتا ہے کہ دنیا کے پروردگار نے اس عالم کو عدل وانصاف پر قائم کیا ہے اور کہ نیک و بد افعال دونوں کی جزا اور سزا ہو گی۔ مسیحیت نے صداقت کے اس پہلو کو بطر زاحسن اپنے اصول عدل میں محفوظ رکھا ہے (متی ۲۵: ۳۱۔۴۶؛ ۲۔کرنتھیوں ۵: ۱۰؛ گلتیوں ۶: ۸)۔ چنانچہ انجیل جلیل میں ارشاد ہے "فریب نہ کھاؤ۔ خُدا ٹھٹھوں میں نہیں اُڑایا جاتا کیونکہ آدمی جو کچھ بوتا ہے وُہی کاٹے گا۔ جو کوئی اپنے جِسم کے لئے بوتا ہے وہ جِسم سے ہلاکت کی فصل کاٹے گا اور جو رُوح کے لئے بوتا ہے وہ رُوح سے ہمیشہ کی زِندگی کی فصل کاٹے گا" (گلتیوں ۶: ۷، ۸؛ رومیوں ۶: ۲۱)۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا"۔۔۔ کیا جھاڑیوں سے انگور یا اُونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں ؟ اِسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت بُرا پھل نہیں لا سکتا نہ بُرا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے۔جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے۔پس اُن کے پھلوں سے تُم اُن کو پہچان لو گے" (متی ۷: ۱۶۔۲۰؛ ۱۲: ۳۳؛ ۱۵: ۱۸، ۱۹؛ لوقا ۶: ۴۵)۔ پس انجیل جلیل نے بطر زاحسن اس صداقت کی تلقین کی ہے کہ دنیا اور کائنات کا سلسلہ علت و معلول، الٰہی انصاف اور عدل کے قوانین پر مبنی ہے، جو اٹل ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کے مقصد اور ارادہ کے عین مطابق ہیں۔

لیکن جہاں مسیحیت نے مسئلہ کرم کی صداقت کے عنصر کو اپنے اندر محفوظ رکھا ہے، وہاں اس نے بے تامل اس مسئلہ کے باطل پہلو اور اس کے غلط نظریہ یعنی تناسخ اور آواگون [1] کو رد کر دیا ہے (یوحنا ۹: ۲؛ لوقا ۱۲: ۲، ۴؛ اعمال ۲۸: ۴)۔ کرم کی تعلیم کے باطل عناصر نے ہندوستان کی زندگی کو تباہ کر دیا ہے اور اس کے کروڑوں بد نصیبوں کو ان کی ناگفتہ بہ حالت پر چھوڑ رکھا ہے جو اپنی قسمت پر رو رہے ہیں اور اب مسیحیت نے ان بد قسمتوں کو چاہ ضلالت سے نکالنے کا ذمہ اٹھالیا ہے۔

ویدوں میں ایک وید کا نام اتھر وویدہے جو بعض اوقات "سراپ وید" کہلاتا ہے۔ کیونکہ اس میں ایسے منتر بکثرت موجود ہیں جو دشمنوں کی تباہی کی خاطر پڑھے جاتے ہیں۔انجیل جلیل کی تعلیم اس قسم کی باتوں سے پاک ہے، کیونکہ جیسا ہم بتاآئے ہیں کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "۔۔۔اپنے دشمنوں سے محبّت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دُعا کرو۔ تاکہ تُم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو کیونکہ وہ اپنے سُورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راستبازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے "(متی ۵: ۴۴، ۴۵)۔ ویدوں اور سوتروں کے بعد منو کے قوانین (منوسمرتی) مقدس شمار کیے جاتے ہے جو مسیح سے پانچ سو سال پہلے لکھی گئی تھی۔ان قوانین سے بعض اعلیٰ ترین اخلاقی پایہ کے اصول ہیں، لیکن اکثر قوانین ایسے ہیں جو فرسودہ و قیاسی، بوسیدہ اور سماج کے حق میں مضر ہیں۔ مثلاً طبقہ نسواں (جو سماج کا کم از کم نصف حصہ ہے) کی نسبت حکم ہے کہ عورت بچپن میں اپنے باپ کی، عالم شباب میں اپنے خاوند کی اور رنڈاپے میں اپنے بیٹوں کی تابع فرمان رہے۔ کوئی عورت کسی حالت میں اور اپنی عمر کی کسی منزل میں بھی مستقل طور پر خود مختار اور آزاد ہستی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ رشتہ داروں سے الگ بے تعلق ہو کر زندگی بسر کر سکتی ہے۔ وہ ہر منزل میں کسی نہ کسی مرد کی محتاج ہوتی ہے۔ خاوند جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔اس کو زودکوب کر سکتا ہے۔ اگر بدنصیب بیوی بے اولاد ہو یا اس کے بیٹے مر جائیں یا وہ صرف بیٹیاں ہی جنے یا خاوند کے حکم سے روگردانی کرے تو خاوند کو اختیار ہے کہ وہ اس کو چھوڑ دے اور دیگر متعدد نکاح کرے۔

[1] ۔ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کرنا۔ روح کا ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانا(ہندوعقیدہ)۔

منو سمرتی میں خدا کا تصور سانکھیہ فلسفہ (علم الراوح) پر مبنی ہے۔ یہ تصور ایسا ہے کہ جہاں تک انسان کا تعلق ہے خدا کا وجود عدم وجود ہونے کے برابر ہے، کیونکہ اس کے وجود (کو) کائنات سے اور بنی نوع انسان سے کوئی تعلق نہیں۔ پس یہ تصور ناقص اور غیر مکمل ہے۔ ہم خدا کے انجیلی تصور کا ذکر باب دوم کی فصل اول میں کر آئے ہیں۔ ناظرین خود بنظر انصاف دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ انجیلی تصور بلند اور اعلیٰ ہے۔ اس غیر مکمل اور ناقص تصور کو انجیل خدا کی ابوت کے اصول سے مکمل کرتی ہے۔

منو کے شاستر میں انسانی اعمال کے لئے کوئی مستند معیار اور قاعدہ کلیہ یا اصول نہیں پایا جاتا۔ جس کو مد نظر رکھ کر ہر زمانہ کے انسان مختلف حالات میں عمل کر سکیں۔ یہ کتاب صرف ایسے معین احکام اور قطعی ہدایات پر مشتمل ہے جو امتداد زمانہ سے بے کار ہو چکے ہیں۔ خصوصاً اب اڑھائی ہزار سال کی مدت طویل گزرنے کے بعد حالات تغیر و تبدل ہو جانے کی وجہ سے وہ نہ صرف ناکارہ ہو گئے ہیں، بلکہ سماج کے لئے مضر ثابت ہو رہے ہیں اور افراد اور ملک کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل ہیں۔ اس کے ذات پات کی قیود کی زنجیروں نے کروڑوں افراد کو صدیوں سے آہنی شکنجہ میں جکڑ رکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ ویدوں میں ذات پات کی تعلیم کا وجود سرے سے نہیں ہے۔

(۵)

اپنشدوں (ہندوؤں کی مذہبی کتابیں جن میں ویدوں کا انتخاب درج ہے۔) میں ذات الٰہی کی نسبت یہ تعلیم ہے کہ وہ بلند اور روحانی ہے۔ ہم صداقت کے اس عنصر کو انجیل جلیل میں بدرجہ احسن پاتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ''خدا روح ہے اور ضرور ہے کہ اس کے پرستار روح اور سچائی سے اس کی پرستش کریں'' (یوحنا ۴: ۲۴) ''خداوند ساری امتوں پر بلند و بالا ہے اس کا جلال آسمانوں سے بھی پرے ہے'' (زبور ۹۷: ۹، ۱۱۳: ۴، ۹۹: ۲، وغیرہ) ''خدا تمام کائنات پر واحد حکمران ہے۔ خداوند فرماتا ہے ''میں اول اور میں آخر ہوں اور میرے سوا کوئی خدا نہیں'' (یسعیاہ ۴۴: ۶، ۴۱: ۴، مکاشفہ ۱: ۸، ۱۷)۔ خدا ازلی اور ابدی ہے ''ازل سے ابد تک تو ہی خدا ہے (زبور ۹۰: ۲) وہ عالی اور بلند ہے اور ابدالآباد سکونت کرتا ہے اس کا نام قدوس ہے'' (یسعیاہ ۵۷: ۱۵)۔ اس پاک ذات میں تغیر و تبدیلی واقع نہیں ہوتی ''میں خداوند ہوں میں بدلتا نہیں ہوں'' (ملاکی ۳: ۶، رومیوں ۱۱: ۲۹، یعقوب ۱: ۱۷) وہ نادیدنی غیر مرئی (جس کو دیکھ نہ سکیں) ہستی ہے (عبرانیوں ۱۱: ۲۷) جو فہم و ادراک سے بالا ہے (ایوب ۱۱: ۷) وہ عالم کل ہے (عبرانیوں ۴: ۱۳) قادر مطلق (مکاشفہ ۱۹: ۶) ہمہ جا حاضر و ناظر ہے (یرمیاہ ۳: ۲۳) گو وہ کائنات اور انسان کے اندر موجود ہے (افسیوں ۴: ۶) تاہم ان سے بلند و بالا ہے (۱۔ سلاطین ۸: ۲۷)۔ پس اپنشدوں میں جو تعلیم خدا کے متعلق موجود ہے وہ اعلیٰ ترین حالت میں کتاب مقدس میں موجود ہے، لیکن کتب اہلِ ہنود میں کرم کے عقیدہ اور آواگون (ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق مرنے اور جنم لینے کا سلسلہ) کے باطل عناصر کی وجہ سے دنیا ایک ایسی مشین یا کل قرار دی گئی ہے۔ جو خود بخود قوانین علت معلول (سبب و مسبب) کے مطابق چلتی ہے اور جس کے ساتھ خدا کا کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اس نظریہ میں کائنات کے اخلاقی قوانین میں جن کے ذریعہ دنیا کا کارخانہ چلتا ہے خدا کا ہاتھ نہیں رہتا۔ اس باطل عقیدہ کو مسیحیت نے مردود قرار دے دیا ہے۔ بائبل مقدس کی یہ تعلیم ہے کہ خدا ایک اخلاقی ہستی ہے اور اس کی ذات نیک ہے وہ نیکی اور راستی کا خدا ہے اور اس میں بدی کا سایہ تک نہیں۔ وہ سراسر نور، حق اور نیکی ہے۔ وہ کائنات اور انسان کا پروردگار ہے اور اخلاقی قوانین کا جو کائنات میں اور انسان کی ضمیر میں ہیں خالق سرچشمہ اور منبع ہے۔ جس طرح کائنات، فطرت کے قوانین علت و معلول کی ذات کے مظہر ہیں اسی طرح اخلاقی قوانین بھی اس کی پاک اور قدوس ذات کے مظہر ہیں (یسعیاہ ۵۱: ۶؛ ۵۷: ۱۵؛ استثنا ۳۲: ۴؛ زبور ۱۱: ۷؛ ۳۳: ۴۔۵؛ ۹۷: ۱۔۲؛ ۳۶: ۵؛ ۱۱۹: ۱۴۲؛ ۳۳: ۱۴۔۱۵؛ ایوب ۱: ۵؛ پیدائش ۱: ۲۶ وغیرہ)۔

پس ذات الٰہی کی نسبت جو صداقت کے عناصر ہندو مذہب میں ہیں وہ بدرجہ احسن اصول کے طور پر موجود ہیں لیکن وہ تمام باطل عناصر سے پاک اور مبرا ہے۔

(۶)

ویدانت (ہندووں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) کی تعلیم کے مطابق انسانی روح اور خدا میں کوئی تمیز نہیں۔ اس تعلیم میں صداقت کا عنصر یہ ہے کہ انسانی روح نہایت بیش قیمت شئے ہے اور انسانیت کے وجود کے اعلیٰ ترین پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ یہ صداقت کلمۃ اللہ کی تعلیم میں بطرز احسن موجود ہے۔ جنابِ مسیح نے یہ تعلیم دی ہے کہ ہر شخص خدا کا فرزند ہے اور خدا کی صورت پر خلق کیا گیا ہے پس جس طرح بیٹا باپ کے ساتھ رفاقت رکھتا ہے اسی طرح ہر انسان خدا کے ساتھ رفاقت رکھ سکتا ہے پس ویدانت میں جو صداقت کا عنصر ہے وہ مسیحیت میں محفوظ ہے لیکن مسیحیت اس کے باطل عناصر کو رد کر دیتی ہے اور وہ اس میں جگہ نہیں پاتے مثلاً مسیحیت کے مطابق یہ عقیدہ غلط ہے کہ خدا اور انسان میں تفریق و تمیز نہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مسیحیت نے انسان کو اعلیٰ ترین مرتبہ عطا کیا ہے لیکن ساتھ ہی خدا اور انسان میں حفظِ مراتب (مرتبے کا لحاظ، پاسِ ادب) موجود ہے۔ اگر خدا اور انسان میں کوئی تمیز نہیں تو انسان کا گناہ اور بداخلاقی کوئی معنی نہیں رکھتے اور نیکی اور بدی محض الفاظ ہی رہ جاتے ہیں۔ ایک ہندو مصنف لکھتا ہے کہ

"کسی انسان کو گنہگار کہنا ہی سب سے بڑا گناہ ہے"۔

اس لحاظ سے دعا، عبادت اور رفاقت الٰہی وغیرہ ناممکن اور بے معنی ہو جاتے ہیں، پس یہ باطل اجزا مسیحیت کی تعلیم سے خارج ہیں۔

(۷)

ہندو دھرم میں اوتاروں (ہندووں کے عقیدے میں خدا کا کسی جنم میں داخل ہو کر مخلوق کی اصلاح کے لیے دُنیا میں آنا) کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ اس عقیدہ میں صداقت کا یہ عنصر ہے کہ انسانی فطرت کسی غیر شخص خدا کے مجرد تصور پر قناعت نہیں کر سکتی بلکہ خدا کی صفات کو زمان و مکان کی قیود (قید کی جمع، پابندیاں) کے اندر دیکھنا چاہتی ہے۔ خدا کی ذات ہے۔

لامکانے فوق وہم سالکان

لیکن انسان کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ کامل ذات زمان و مکان کی قیود میں اس کو دکھائی دے جس کے خیالات جذبات اور کردار کے نمونے وہ اپنے پیش نظر رکھ سکے۔ مسیحی مذہب میں صداقت کا یہ عنصر اپنی کاملیت میں موجود ہے۔ چنانچہ انجیل شریف میں وارد ہے" ابتدا میں کلام میں تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔ کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔ اس کی معموری میں سے ہم سب نے فضل پر فضل پایا۔ خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا (یعنی جنابِ مسیح) جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا"۔ (یوحنا پہلا باب؛ ۱۔یوحنا ۱: ۱؛ ۴: ۴؛ کلسیوں ۱: ۱۶۔۱۷؛ مکاشفہ ۱: ۴، ۸، ۱۷؛ ۳: ۱۴؛ ۲۱: ۶؛ ۲۲: ۱۳؛ رومیوں ۱: ۳؛ ۸: ۳؛ گلتیوں ۴: ۴؛ فلپیوں ۲: ۷؛ ۱۔ تیمتھیس ۳: ۱۶؛ عبرانیوں ۲: ۱۴؛ متی ۱۱: ۲۷ وغیرہ) لیکن مسیحیت میں رام اور کرشن جیسے اوتار اور مجسم خدا نہیں پائے جاتے ہیں۔ جن کی کہانیاں تاریخ پر مبنی نہیں ہیں۔ وہ شاعرانہ تخیل اور قصص سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ وہ اوتار جنگجو بادشاہ تھے، وہ مذہبی لیڈر تک بھی نہیں تھے ان کے مرنے کے تین سو سال بعد ان کو اوتار دیا گیا۔ بعض ہندو گوتم بدھ کو اوتار مانتے ہیں اگرچہ گوتم ہندوستان کا مذہبی لیڈر تھا لیکن وہ خود تجسم کے عقیدے کا مخالف تھا۔ اس کی موت کے پانچ سو سال تک اس کی پیروؤں کو یہ جرات نہ

ہوئی کہ وہ گوتم بدھ کے نام کے ساتھ ایک خدا کا تصور متعلق کریں اور اس کو اوتار بنائیں۔ پس ہندو مذہب کے تمام اوتار کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتے جس طرح مسیحیت کا بانی رکھتا ہے۔

یہ اوتار نہ صرف کوئی تواریخی حیثیت نہیں رکھتے اور ان کے افسانے (جیسا ہم لکھ چکے ہیں) مخرب (بگڑا ہوا) اخلاق ہیں، بلکہ وہ حقیقی اوتار بھی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ شاستر پرانوں سے ظاہر ہے کہ مچھ (مگر مچھ)، کچھ (کچھوا)، نرسنگھ، رام کرشن وغیرہ وہ، اوتار بنی نوع انسان کی بہبودی اور ترقی کے کام کے نہیں ہو سکتے۔ حق تو یہ ہے کہ ان کے اوتار بننے کی یہ غرض ہی نہ تھی کہ نوع انسانی کا بھلا ہو۔ چنانچہ مچھ (مگر مچھ) کے اوتار بننے کی یہ غرض تھی کہ چاروں ویدوں کو سمندر سے ڈھونڈھ نکالے کچھ (کچھوا) براہ ڈگمگاتی دھرتی کو تھامنے کے لئے اوتار ہے۔ نرسنگھ نے ہرناکشب کا پیٹ پھاڑنے کے لئے اوتار لیا۔ دامن اوتار بنا تاکہ راجا بل کو فریب دینے کے لئے۔ پرسرام اوتار بنا تاکہ چھتریوں کو ہلاک کرے۔ رام راون کو اور کرشن کنس کو ہلاک کرنے کے لئے اوتار بنے۔ دسواں اوتار کلکی اوتار کل جگ میں ہو گا جو گنہگاروں کو ہلاک و برباد کرنے کو آئے گا۔ تب ہر گنہگار اپنے گناہوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بجائے ہلاک کر دیا جائے گا۔

علاوہ ازیں جیسا ہم سطور بالا میں لکھ چکے ہیں ان نام نہاد اوتاروں کے چلن اور خصائل ایسی ہیں کہ وہ اوتار کہلانے کے مستحق ہی نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ ہر قسم کی بدی، زناکاری، جھوٹ اور دغا وغیرہ سے متصف (صفت رکھنے والا) ہیں۔ حقیقی اوتار کے اوصاف ان نام نہاد اوتاروں میں سے کسی میں بھی نہیں پائے جاتے۔ ان پر یہ کہاوت صادق آتی ہے کہ ''لوبھ گرولا لچی چیلا'' دونوں نرک میں ٹھیلم ٹھیلا'' ان اوتاروں کے گناہوں کا نمونہ دیکھ کر اور ان کے احوال کو دیکھ کر انسان بھی دیدہ دلیری سے گناہ پر گناہ کرنے کی زندگی پر آمادہ ہو جاتا ہے، چنانچہ یہ دوہا (دو مصرعوں کا ہندی شعر) مشہور ہے:۔ مورکھ کیا سمجھایئے، گیان گانٹھے کا جائے۔ کوئلہ نہ ہووے اجلا، نو من صابن لائے۔

چونکہ ہم آئندہ باب میں اس عقیدہ پر شرح اور بسط (وضاحت) کے ساتھ بحث کریں گے ہم اس جگہ صرف اس قول پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہندو مذہب کے اس عقیدہ میں جو صداقت کا عنصر ہے وہ بدرجہ احسن ابن اللہ (یعنی جنابِ مسیح) کی شخصیت میں موجود ہے لیکن یہ قدوس ہستی تمام باطل عناصر سے پاک ہے۔

(۸)

ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا مذہب وہ فلسفیانہ نظریہ جات ہیں جو اپنشدوں اور بھگوت گیتا اور ویدک لٹریچر میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا لب لباب یہ ہے کہ ''اوم'' نام کا جپنا زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ بھگوت گیتا قریباً دو ہزار سال ہوئے لکھی گئی اور اپنشد وغیرہ کی کتابیں سن ایک ہزار قبل از مسیح سے آٹھ سو سال قبل از مسیح لکھی گئیں۔ سنسکرت کا فاضل میکس ملر اپنشدوں کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جہاں ان میں اعلیٰ اور پاکیزہ خیال پائے جاتے ہیں وہاں بیسیوں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو طفلانہ ہیں اور جن کو پڑھ کر انسان کی طبیعت نہ صرف اکتا جاتی ہے بلکہ نفرت کرنے لگ جاتی ہے (Sacred Books of The East Vol.1.p.1 xviii)

بھاگوت گیتا ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں وہی جگہ رکھتی ہے جو مسیحیت میں انجیل شریف کو حاصل ہے۔ اس کتاب کے بعض حصص میں اعلیٰ تعلیم موجود ہے اور دھیان کی حالت کو افضل قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ مجرد فلسفیانہ تصورات جذبات کو متاثر نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ رامانجو نے شنکر آچاریہ کے فلسفیانہ خیالات کے خلاف آواز بلند کی اور تعلیم دی کہ خدا شخصیت رکھتا ہے اور بھگتی کے ذریعہ اس کا علم ہم کو حاصل ہے۔ سولہویں صدی میں کبیر اور گورو نانک نے اور ان کے بعد چیتا نیا نے اور برہمو سماج نے ہندو فلسفیانہ خیالات کے خلاف اپنی آواز بلند کی لیکن ہمہ اوستی نقار خانے میں ان طوطیوں کی آواز کون سنتا ہے؟

(۹)

ہندو مذہب کی تاریخ پر غور کرو تو تم پاؤ گے کہ ہندو مذہب میں جتنے پسندیدہ دلکش عناصر ہیں وہ سب کے سب اپنی پاکیزہ اور خوبصورت ترین حالات میں مسیحیت میں پائے جاتے ہیں مثلاً بھگتی مارگ کے تمام روشن پہلو مسیحی ایمان اور انجیل میں موجود ہیں، لیکن اس کی خامیاں مسیحیت میں زائل ہو جاتی ہیں۔ جن صحیح اصولوں پر گورونانک یا کبیر یا راجہ رام موہن رائے یا سوامی دیانند نے اصلاح کی خاطر زور دیا ہے وہ سب کے سب اصول اپنی بہترین اور درخشاں صورت میں کلمۃ اللہ کی تعلیم میں موجود ہیں۔ جن باتوں کو ان مصلحین نے رد کیا ہے وہ مسیحیت کی روشنی میں ہی رد کی گئی ہیں کیونکہ وہ مسیحیت کے نزدیک مردود اور ناقابل قبول ہیں۔

مسیحیت کے مطابق خدا مجرد تصور نہیں ہے بلکہ شخصیت رکھتا ہے۔ خدا کی ذات کوئی خلا نہیں جس میں روح نروان حاصل کرے بلکہ اس کی ذات محبت ہے جس کی وجہ سے وہ کل نوع انسانی کا باپ ہے پس کرشن مت میں جو صداقت کا عنصر ہے وہ بطرز احسن مسیحیت میں موجود ہے۔

(۱۰)

علی ہذاالقیاس (اسی طرح) مادہ کا فانی ہونا ایک ایسا عقیدہ ہے جس کا مسیحیت ببانگ دہل اعلان کرتی ہے (۲۔کرنتھیوں ۴:۱۸؛ ۵:۷ وغیرہ)۔ ہم کو تعلیم دیتی ہے کہ بقا صرف روح کو حاصل ہے۔ لیکن مایا کے عقیدہ کا غلط پہلو مسیحیت میں دخل نہیں پاتا، کیونکہ مسیحیت کی یہ تعلیم ہے کہ ہر شئے کے وجود کی علت نمائی ہے اور مادہ وجود رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسیحیت تجسم کی قائل ہے اور مانتی ہے کہ جنابِ مسیح کلمۃ اللہ خدائے مجسم تھا "جو ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال"۔ (یوحنا ۱:۱۸)

(۱۱)

ہندوؤں کے فلسفیانہ عقائد کے مقابلہ میں مسیحیت کا پیغام نہایت سادہ ہے۔ ہندو فلسفہ کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اس کے پاس انسانی زندگی اور دنیا اور کائنات کے مسائل کا عقلی حل موجود ہے لیکن یہ خام خیالی ہے۔ ہندو فلسفیانہ نظریوں کا یہ حال ہے کہ ع

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زوند۔

حق تو یہ ہے کہ کائنات کے مسائل کے حل عقل کے ذریعہ نہیں ہوتے اور نہ عقل مذہب کی بنیاد ہے، کیونکہ "علم ناقص اور نا تمام" ہوتا ہے (۱۔کرنتھیوں ۱۳:۹) تاریخِ فلسفیانہ یہ بتلاتی ہے کہ ع

نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا

عقل کا زندہ اخلاقیات کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا۔ ہندو فلسفہ محض مذہب عقلی ہے جس کا تمام انحصار ازابتدا تا انتہا خالص عقل پر ہے۔ اس میں صداقت کا یہ عنصر موجود ہے کہ ہم کو انسان، دنیا اور کائنات کے مسائل حل کرنے میں اپنی خداداد عقل استعمال کرنی چاہئیے۔ مسیحیت میں یہ صداقت بہترین حالت میں پائی جاتی ہے۔ (یوحنا ۷:۱۷؛ ۸:۳۱؛ ۱۶:۱۲؛ یرمیاہ ۹:۲۴؛ دانی ایل ۱۲:۱۳؛ ہوسیع ۶:۳؛ ۱۔تھسلنیکوں ۵:۲۱؛ افسیوں ۵:۱۰؛ ۱۔کرنتھیوں ۱۲:۱۰؛ ۱۴:۲۹؛ امثال ۲۴:۳؛ ۳:۲۱؛ ۳:۲؛ ۱۵:۱۴؛ زبور ۱۱۹:۶۶؛ امثال ۲:۱۰؛ ۱۔کرنتھیوں ۸:۲؛ ۱۴:۲۰ وغیرہ) چونکہ مسیحیت میں صداقت کا یہ عنصر موجود ہے لہٰذا بعض لوگ اور بالخصوص تھیوسوفٹ یا تھیوسوفی (یہ عقیدہ یا اصول کہ ہر شخص بلاواسطہ خدا کی معرفت وجدان سے حاصل کر سکتا ہے) یہ گمان کرتے ہیں کہ ہندو فلسفہ اور مسیحیت میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ لیکن جہاں مسیحیت عقل کے استعمال کرنے کا حکم دیتی ہے وہاں وہ ہندو فلسفہ کے باطل عناصر کو اپنے اندر جگہ نہیں دیتی اور یہ تعلیم دیتی ہے کہ خدا ایک زندہ اخلاقی ہستی ہے جس

میں قوت ارادی ہے جو ہماری اخلاقی قوتِ ارادی کو نئی راہ پر چلانا چاہتی ہے۔ مسیحیت ایسا مذہب نہیں جس کا دار و مدار صرف عقل پر ہی ہو اور وہ انسان کی زندگی کے دیگر پہلوؤں کو فراموش کر کے نظر انداز کر دے۔ وہ ایک اخلاقی مذہب ہے جس کا نصب العین رضائے الٰہی کو حاصل کرنا ہے۔ جہاں ہندومت کی اخلاقیات صرف الفاظ و تصورات پر ہی مبنی ہیں وہاں مسیحی مذہب کی اخلاقیات کی بنیاد ارادہ اور عمل پر ہے۔

حکمت وفلسفہ کارے ست کہ پایا نش نیست

سیلی عشق ومحبت بہ دبستانش نیست

(۱۲)

ہندو فلسفہ مذہبِ محبت نہیں۔ اس کی بنا عقلیات پر ہے۔ اس کے فلسفہ کے مطابق روح کا خدا میں فنا ہو جانا محبت کی وجہ سے نہیں ہے۔ لیکن مسیحیت کی تعلیم میں خدا اور انسان کا باہمی رشتہ کامل محبت پر مبنی ہے۔ ہندو فلسفہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہمیں ہر جاندار کے ساتھ رحم کے ساتھ پیش آنا چاہئیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان کو ہر طرح کے جذبات سے خالی ہونا چاہئیے۔ یہاں تک کہ نیکی کرنے کے جذبہ پر بھی ہم کو غالب آنا چاہئیے۔ اس میں جو صداقت کا عنصر ہے وہ مسیحیت میں کامل طور پر موجود ہے، کیونکہ اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ''اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ "لیکن اس تعلیم کے باطل عناصر کہ انسان کو نیکی کے جذبہ سے خالی ہونا چاہئیے مسیحیت میں جگہ نہیں پاتے کیونکہ ع۔

زندگی درجستجو پوشیدہ است

اصل اور در آرزو پوشیدہ است

حق تو یہ ہے کہ جس طرح بعض اوقات بادل برسنے کی بجائے گرم ہوا میں زائل ہو جاتا ہے اسی طرح ہندو فلسفہ میں اخلاقی عنصر عقلیت کی فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ مسیحیت میں محبت کی تعلیم ایسی نہیں کہ اس سے بنی نوع انسان سے محبت رکھنے کا جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ اس کی علتِ غائی (حاصل، فائدہ) ہی یہ ہے، کہ وہ ایسی صورتِ حالات پیدا کر دے جس سے بنی نوع انسان سے محبت کرنے کا جذبہ ہمیشہ مشتعل (بھڑکتا ہوا) رہے۔ ہندومت میں اس کے نظریہ کی وجہ سے اس مذہب میں رحم ترس ہمدردی وغیرہ کے جذبات محض زبانی جمع خرچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پس ان کا اثر روزمرہ کی زندگی پر رتی بھر نہیں پڑتا۔ ایسا مذہب کسی طرح بھی محبت کا مذہب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ''عالم روحانیت'' محبت کے جذبہ کے ساتھ متعلق نہیں ہے، لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ روحانیت کا اصلی تعلق اخلاقیات کے ساتھ ہے اور روحانی نصب العین اخلاقی زندگی کے ذریعہ ظہور میں آتا ہے۔ یہ نظریہ کہتا ہے کہ تم دنیا میں اسی طرح زندگی بسر کرو کہ گویا تم مر گئے ہو اور اس کے ساتھ تمہارا کسی قسم کا واسطہ نہیں رہا۔ لیکن کلمۃ اللہ کی انجیل کہتی ہے کہ ''دنیا میں تم اپنے نفس پر قابو پا کر ایسی زندگی بسر کرو جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو''۔ ہندو فلسفہ اپنے اس باطل نظریہ کی وجہ سے افلاس زدہ مذہب ہے لیکن مسیحیت محبت کے اصول کی تعلیم کی وجہ سے ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔

اسلام کے اصول اور مسیحیت

جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ہم پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس میں جتنی خوبیاں موجود ہیں وہ سب کی سب بائبل مقدس میں اعلیٰ ترین شکل میں پائی جاتی ہیں۔ اس فصل میں ہم احادیث کو نظر انداز کر کے صرف قرآن شریف کی تعلیم پر نظر کریں گے اس مطالعہ سے ہمارے اس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے کہ کل ادیانِ عالم میں صداقتوں کے جتنے عناصر ہیں وہ تمام کے تمام اپنی اعلیٰ ترین اور پاکیزہ ترین صورت میں کلمۃ اللہ کی تعلیم میں پائے جاتے ہیں۔ قرآن کو خود کہتا ہے کہ اس کی تعلیم میں جو صداقت ہے وہ سابقہ کتب مقدسہ سے ماخوذ ہے چنانچہ لکھا ہے

کہ ''بیشک یہ قرآن جہان کے رب کا اتارا ہوا ہے تیرے دل پر تا کہ تو ڈرانے والوں میں ہو جائے۔ فصیح عربی زبان میں ہے اور بے شک یہ قرآن اگلے پیغمبروں کی کتابوں میں مذکور ہے۔ کیا اہل مکہ کے لئے یہ (اس کی صداقت کی) نشانی نہیں کہ اس قرآن کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں (شعرا آیت ۱۹۲)۔ قرآن بار بار صاف الفاظ میں اقرار کرتا ہے کہ جو صداقت اس میں پائی جاتی ہے وہ محض کتبِ سابقہ سے ماخوذ ہے اور اس حقیقت کو اپنی صداقت کی دلیل میں پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآن عربی میں صرف اس واسطے آیا ہے تا کہ سابقہ کتب مقدس کی صداقتوں کو اہل عرب کے لئے سلیس عربی زبان میں پیش کرے تا کہ اہل عرب پر اتمام حجت (آخری دلیل) ہو جائے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ ''قرآن ہم نے نازل کیا اس لئے کہ تم نہ کہو کہ ہم سے پہلے صرف دو ہی فرقوں (یعنی یہود اور عیسائیوں) پر کتاب نازل ہوئی تھی اور ہم ان کتابوں کی عبرانی اور یونانی زبانوں کی وجہ سے ان کے پڑھنے سے غافل تھے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب (عربی میں) نازل ہوتی تو ہم یہودیوں اور عیسائیوں سے زیادہ ہدایت پر ہوتے۔ سو اب تمہارے رب سے تمہارے پاس (عربی میں) حجت آگئی ہے اور ہدایات اور رحمت ہے سو اس سے زیادہ ظالم کون جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلا یا'' (سورہ انعام آیت ۱۵۶) پھر قرآن تاکیداً فرماتا ہے ''تم کہو کہ ہم مانتے ہیں جو اترا ہم پر اور جو اترا تم پر ہمارا خدا اور تمھارا خدا ایک ہی ہے'' (عنکبوت) نیز دیکھو سورہ نحل آیت ۱۰۵، سورہ حم سجدہ ۲۰، ۴۴؛ یوسف آیت ۳، سورہ رعد آیت ۳۷، سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۲، سورہ زمرہ آیت ۲۹، سورہ شوریٰ آیت ۵، سورہ زخرف آیت ۲، سورہ احقاف آیت ۱۱ وغیرہ)۔ دورِ حاضر کے مسلم علما اس حقیقت کے معترف ہیں چنانچہ مرحوم مولوی خدا بخش اس مضمون پر بحث کر کے کہتے ہیں

> ''اسلام درحقیقت یہودیت اور مسیحیت کی محض ریوائزڈ (نظر ثانی) ایڈیشن ہے۔ حضرت محمد نے کبھی جدت کا دعویٰ نہیں کیا۔ آپ کا مذہب دیگر ادیان کا انتخاب تھا''

(A Mohammedan View of Islam and Christianity Muslim World For Oct 1926)

سر سید احمد مرحوم بھی فرماتے ہیں کہ

> ''اسلام اصول اور عقائد متفرقہ اور منتشرہ مذاہب سابق کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے۔ ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہو گی کہ یہ مشابہت اور مماثلت اصول اور عقائد مذہب اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول و عقائد سے مذہب اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے''

(خطبات احمدیہ ص ۲۲۳)

پس قرآن اور علمائے اسلام اس بات کے معترف ہیں کہ قرآن کی تمام صداقتیں کلمۃ اللہ کی تعلیم میں پائی جاتی ہیں۔ ہم انشاءاللہ یہاں یہ ثابت کریں گے کہ وہ صداقتیں قرآن میں صرف غیر مکمل حالت میں موجود ہیں وہ انجیل جلیل میں وہ کامل ترین اور پاکیزہ ترین شکل میں موجود ہیں۔

(۲)

سب سے بڑا دعویٰ جو اسلام کا ہے وہ شرک کی مذمت اور وحدتِ الٰہی کی دعوت ہے (سورہ بقرہ ۱۵۸، سورہ نحل ۱۳، سورہ نساء ۴۰ اور ۱۱۶ وغیرہ)۔ لیکن کتاب مقدس کے ناظرین جانتے ہیں کہ جیسا اوپر چکا ہے یہ صداقتیں حضرت رسول عربی نے یہودیت اور مسیحیت سے حاصل کیں۔ (مرقس ۱۲: ۲۹؛ یوحنا ۱۷: ۳؛ ۱۔کرنتھیوں ۸: ۴۔۶؛ یسعیاہ ۴۴: ۶؛ خروج ۲۰: ۳۔۵؛ حزقی ایل ۱۴: ۳؛ ۱۔یوحنا ۵: ۲۱؛ اعمال ۷: ۲۹؛ ۱۱۵: ۴۔۸؛ رومیوں ۱: ۲۱۔۲۳ وغیرہ وغیرہ)

لیکن اسلامی مجرد توحید کا تصور خلافِ قیاس اور ہر قسم کی محتویات (گھیر لینا، شامل) سے خالی اور از روئے منطق و فلسفہ یہ تصور خاص ہے۔ لہٰذا توحید کے اس تصور کو مسیحیت میں دخل نہیں۔ یہ ایک لمبی بحث ہے، جو اس رسالہ کے حقیقی موضوع سے خارج ہے۔ ہم ناظرین کی توجہ پادری عمادالدین صاحب مرحوم و پادری عبدالحق صاحب مرحوم، پادری فنڈر صاحب اور ڈاکٹر برخوردار خان صاحب کی کتب کی جانب دلا کر یہاں اس قول پر اکتفا کرتے ہیں کہ اسلام کا یہ عقیدہ اپنی پاکیزہ ترین حالت میں بائبل مقدس میں موجود ہے۔

(۳)

خدا اور انسان کے باہمی رشتہ اور تعلقات کے متعلق جو تعلیم قرآن اور اسلام میں ہے ان میں جو صداقت کے پہلو ہیں وہ تمام کے تمام مسیحیت میں بوجہ احسن موجود ہیں۔ مثلاً قرآن کی تعلیم ہے کہ خدا خالق ہے۔ مالک ہے، پروردگار ہے وغیرہ وغیرہ (سورہ انعام آیت ۱۰۱ اور ۱۰۲، سورہ نحل آیت ۱۳ اور ۱۷ وغیرہ) یہ تمام باتیں بائبل مقدس میں بطرز احسن موجود ہیں۔ (پیدائش ۱: ۱؛ نحمیاہ ۹: ۶؛ اعمال ۴: ۱۵؛ زبور ۱۴۸: ۵؛ اعمال ۱۷: ۲۴ وغیرہ۔) لیکن قرآنی تعلیم میں بعض ایسے پہلو ہیں جو انجیل میں پائے جاتے "کہ خدا ایسی جابر ہستی ہے جو اپنے قہر سے گناہ گار انسان کو فنا کر دیتی ہے اور دوزخ میں ڈال کر خوش ہوتی ہے" (سورہ نحل ۲۵، سورہ احقاف ۱۹، سورہ جاثیہ ۷ اور ۲۰۔ سورہ مومن ۳۷، سورہ یسین ۸؛ سورہ انعام ۱۳۸ وغیرہ)۔ ان مقامات کی سی تعلیم انجیل میں نہیں ملتی کلمۃ اللہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا کی ذات محبت ہے اور وہ گناہ گار کی خاطر ہر قسم کا ایثار اور قربانی کرتا ہے (یوحنا ۳: ۱۶؛ ۱۔ یوحنا ۴: ۱۰؛ رومیوں ۵: ۶ وغیرہ)۔ خدا اور انسان کے باہمی تعلق کی بنا خوف اور دہشت نہیں بلکہ محبت ہے۔ انجیل جلیل میں ارشاد ہے کہ "کامل محبت خوف کو دور کر دیتی ہے" (رومیوں ۸: ۱۵؛ ۱۔ یوحنا ۵: ۱۴؛ ۴: ۱۷ وغیرہ)۔

پس مسیحیت میں یہ تمام اصول اپنی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین شکل میں موجود ہیں جو قرآن میں صرف غیر مکمل طور پر ہی پائے جاتے ہیں۔

(۴)

اسلام نے خدا کے متعلق یہ تعلیم دی ہے کہ خدا اپنی مخلوقات سے بلند و بالا ہے (سورہ نحل ۶۲، سورہ نساء ۳۸ وغیرہ) اور اس صداقت کے عنصر پر اس قدر زور دیا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی ہے۔ مسیحیت میں بھی یہ تعلیم موجود ہے کہ خدا کائنات سے بلند و بالا ہے (زبور ۸۳: ۱۸؛ اعمال ۷: ۴۹ وغیرہ) لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے خدا اور انسان میں کوئی خلیج پیدا نہیں کی، چنانچہ لکھا ہے کہ "وہ جو عالی اور ارفع ہے اور ابدالآباد تک قائم ہے جس کا نام قدوس ہے فرماتا ہے کہ میں بلند اور مقدس مقام میں رہتا ہوں اور اس کے ساتھ بھی جو شکستہ دل اور فروتن ہے تاکہ فروتنوں کی روح کو اور شکستہ دلوں کو زندگی بخشوں (یسعیاہ ۵۷: ۱۵؛ زبور ۱۱۳: ۲۔۷) خدا کے بلند و بالا ہونے اور اس کے حاضر و ناظر ہونے میں جو صداقت کے پہلو ہیں وہ مسیحیت میں نہایت دلکش ہیں اور پسندیدہ حالت میں موجود ہیں۔

اسلام نے خدا اور انسان کے درمیان خلیج پیدا کر کے یہ تعلیم دی ہے کہ خدا فرشتوں کے ذریعہ انسان سے کلام کرتا ہے۔ اور یوں اپنی مرضی انسان پر ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن جبرائیل فرشتہ کے ذریعہ رسول عربی پر نازل ہوا۔ لیکن مسیحیت یہ تعلیم دیتی ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے جس کی ذات محبت ہے لہٰذا اس میں اور انسان میں کوئی خلیج واقع نہیں اور خدا کا کلام خود مجسم ہوا اور اس نے مسیح میں ہو کر اپنے آپ کو بنی نوع انسان پر ظاہر کیا۔ (یوحنا پہلا باب؛ عبرانیوں ۱: ۱۔۸)۔ اسلام میں انسان خدا کے ساتھ حقیقی رفاقت نہیں رکھ سکتا کیونکہ قرآن کے مطابق خدا "بے نیاز" ہے (سورہ اخلاص وغیرہ) بے نیازی اور محبت دونوں ایک جگہ اکٹھے ہو نہیں سکتے۔ محبت ایک رشتہ ہے جو محب اور محبوب کے درمیان ہوتا ہے، لیکن جہاں بے نیازی ہو وہاں نہ کوئی محب ہو سکتا ہے اور نہ محبوب نہ محبت کی رفاقت کا امکان ہو سکتا ہے۔

پس خدا کے بلند و بالا ہونے اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کے متعلق جو تعلیم قرآن میں پائی جاتی ہے وہ کامل طور پر انجیل جلیل میں موجود ہے۔

(۵)

قرآن کے مطابق خدا رحمان اور رحیم ہے جو ہمارے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے (سورہ مائدہ ۴۴ وغیرہ)۔ صداقت کا یہ پہلو اپنی بہترین شکل اور پاکیزہ ترین صورت میں انجیل جلیل کی تعلیم میں پایا جاتا ہے۔ (مرقس ۱۱: ۲۵؛ افسیوں ۴: ۳۲؛ کلسیوں ۳: ۱۳ وغیرہ) لیکن اسلامی تعلیم میں خدا کی رحمت کا اخلاقیات سے تعلق نہیں، کیونکہ اس رحمت میں اخلاقی عنصر موجود نہیں، خدا کا رحم کرنا اور گناہوں کا بخشنا اس کی مطلق العنان مرضی پر موقوف ہے، لیکن مسیحیت میں اس تصور کو جگہ نہیں ملتی۔ کلمۃ اللہ نے خدا کی رحمت کے تصور کو اخلاقیات کے ساتھ ایسا وابستہ کر دیا ہوا ہے، کہ خدا کی رحمت اور مغفرت اس کی ذات کا (جس کا جوہر محبت ہے) قدرتی نتیجہ ہے۔ چونکہ خدا بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہے لہٰذا اس کی ذات اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کرے اور تائب گناہ گار کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے (لوقا ۱۵ باب وغیرہ)۔
پس کلمۃ اللہ کی تعلیم قرآنی تعلیم کے صادق پہلو کو کامل طور پر پیش کرتی ہے ایسا کہ اس کا غیر مکمل پہلو انجیل میں پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

(۶)

قرآن کے مطابق ''خدا گناہ کا بانی ہے'' (سورہ اعراف آیت ۱۷۸، بنی اسرائیل ۱۷، سورہ شوریٰ ۴۵، سورہ ہود ۳۶ اور ۱۲۰ وغیرہ) کلمۃ اللہ کی تعلیم اس عقیدہ سے پاک ہے۔

(۷)

قرآن میں نماز اور دعا کا حکم ہے لیکن یہ احکام زمان و مکان کی قیود سے آزاد نہیں (سورہ نساء ۴۶، سورہ روم ۱۷ اور ۱۸، سورہ ہود ۱۱۶، سورہ بنی اسرائیل ۸۰، سورہ طٰہٰ ۱۳۰، سورہ بقرہ ۱۲۹) چنانچہ حکم ہے کہ نماز خاص اوقات پر اور ایک خاص جگہ کی طرف رخ کر کے پڑھی جائے لیکن مسیحیت میں یہ حکم زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ ہر وقت دعا مانگتے رہنا چاہیے۔ (لوقا ۱۸: ۱؛ افسیوں ۶: ۱۸؛ ۱۔ تھسلنیکیوں ۵: ۱۷؛ ۱۔ تیمتھیس ۲: ۸ وغیرہ) آپ نے کسی خاص جگہ کو قبلہ نہ بنایا (یوحنا ۴: ۲۰۔۲۵)۔ اسلام میں دعا سے پہلے وضو اور ظاہری رسمی پاکیزگی پر زور دیا گیا ہے (سورہ مائدہ ۸ اور ۹، سورہ بقرہ ۱۸۳ وغیرہ) لیکن کلمۃ اللہ کی تعلیم میں ظاہری تکلفات کا پہلو دور کر دیا ہے۔

دل کہ پاکیزہ بود جامہ ناپاک چہ سود
سر کہ بے مغز بود نغزی دستار چہ سود

کلمۃ اللہ (یعنی جنابِ مسیح) نے ارشاد فرمایا ''خدا روح ہے اور ضرور ہے کہ اس کے پرستار روح اور سچائی سے اس کی پرستش کریں'' (یوحنا ۴: ۲۳۔۲۴) پس کلمۃ اللہ کی تعلیم میں دعا اور عبادت کے اصول درخشاں ہو کر چمکتے ہیں (متی ۷: ۷۔۱۱؛ ۲۱: ۲۲؛ مرقس ۱۱: ۲۴؛ متی ۶: ۵۔۸؛ یوحنا ۹: ۵۔۹؛ ۱۸: ۱۰۔۱۴ وغیرہ)۔ مسیحیت کے اصول زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہیں لہٰذا عالم گیر ہیں۔

(۸)

قرآن میں روزہ کا حکم ہے اور اس کے لئے مفصل احکام اور تفصیلات موجود ہیں جو زمان و مکان کی قیود میں ہیں (سورہ بقرہ ۱۷۹ الخ) لیکن کلمۃ اللہ کی تعلیم میں روزہ ظاہری تکلفات پر مبنی نہیں اور نہ محض رسم پرستی ہے (متی ۶: ۱۶۔۱۸؛ یسعیاہ ۵۸: ۵۔۸؛ متی ۹: ۱۴۔۱۷ وغیرہ)۔

(۹)

قرآن میں حج کا حکم ہے جو زمان و مکان کی قیود سے متعلق ہے (سورہ آل عمران ۹۰، سورہ بقرہ، ۹۴، ۹۵، ۱۹۲، ۱۹۳ وغیرہ) یہودیت اور اسلام میں یہ مماثلت ہے کہ جو جگہ اہل یہود کے مذہب میں یروشلیم کو دی گئی ہے وہی جگہ اسلام میں مکہ کو حاصل ہے۔ جس طرح یروشلیم خدا کا شہر تھا اسی طرح مکہ ام القریٰ ہے جس طرح یہوواہ (پروردگار کا خاص نام) یروشلیم کی ہیکل میں رہتا تھا اسی طرح اسلام کا ربِ کعبہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ انبیائے یہود ایسی تعلیم بھی دیتے تھے جو اس تصور سے بلند و بالا تھی (یسعیاہ ۶۶: ۱۔۲؛ ۱۔سلاطین ۸: ۲۷؛ ۲۔تواریخ ۶: ۱۸؛ یرمیاہ ۲۳: ۲۴؛ ۲۔تواریخ ۲: ۶ وغیرہ) اور اسلام میں خدا رب العالمین ہے، لیکن اسلام کی تعلیم ہمیشہ زمان و مکان کی حدود میں رہی۔ انجیل جلیل کی تعلیم اس قسم کی حدود سے بالا ہے (یوحنا ۴: ۶؛ اعمال ۷: ۴۸؛ ۱۷: ۲۴؛ متی ۵: ۳۴۔۳۵ وغیرہ)۔

(۱۰)

اسلام میں قربانی کا حکم پایا جاتا ہے (سورہ حج ۲۸ تا ۳۸ وغیرہ) ہندو مذہب میں بھی کالی کے سامنے بکریاں قربان کی جاتی ہیں۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم اور نمونہ نے ان مذاہب کے قربانی کے تصور کو ایسا کامل کر دیا ہے کہ لفظ قربانی کے وہ معنی ہی نہیں رہے جو دیگر مذاہب میں تھے (زبور ۵۰: ۹۔۱۵؛ ۵۱: ۱۶۔۱۷)۔ اب قربانی کا مطلب ایثار نفسی اور خود فراموشی اور دوسرے کے فائدہ کو مقدم جاننا ہوا (افسیوں ۵: ۱۔؛ عبرانیوں ۷: ۲۷؛ ۹: ۱۴؛ خروج ۱۰: ۱۰۔۱۲) کلمۃ اللہ کے کامل قربانی کے تصور کی وجہ سے ادیانِ عالم کے تصورات جو ان مذاہب میں خدا اور انسان کے متعلق اس لفظ سے وابستہ تھے وہ یا تو دنیا جہان کے لوگوں کے ذہنوں سے کلیتہً (مکمل طور پر) مٹ گئے ہیں یا ان تصورات کے معنی مسیحیت کی روشنی میں بدل گئے ہیں (زبور ۴۰: ۶)۔

بعض مذاہب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قربانیاں چڑھانے سے ہم خدا کے ارادوں کو بدل سکتے ہیں۔ قربانیاں گویا ایک رشوت خیال کی جاتی تھیں۔ یہ گمان تھا کہ جس طرح دنیاوی حکام رشوت سے قابو آجاتے ہیں اسی طرح ہم قربانیوں کے وسیلے خدا پر قابو پالیتے ہیں اور اس کو خوش کر کے جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن کلمۃ اللہ کی تعلیم اور زندگی نے ایک طرف قربانی کے تصور کو کامل کر دیا اور دوسری طرف اس لفظ کے ناقص اور باطل مفہوم کو نوع انسانی کے اذہان سے خارج کر دیا۔

(۱۱)

قرآن میں حرام اور حلال خوراک میں تمیز کی گئی ہے (سورہ مائدہ ۹۰، ۹۷، سورہ انعام ۱۴۶، وغیرہ) اس قسم کی تعلیم ہم پر عیاں کر دیتی ہے کہ قرآن صرف خاص ممالک و اقوام پر ہی حاوی ہو سکتا ہے۔ لیکن کلمۃ اللہ نے اس قسم کی تعلیم کے نقص کو رفع کر دیا اور فرمایا کہ کوئی شئے بذاتہ حرام نہیں (متی ۱۵: ۱۱۔۱۹؛ رومیوں ۱۴: ۱۴؛ ۱۔تیمتھیس ۴: ۴ وغیرہ) انجیل میں ارشاد ہے کہ "خدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی، محبت اور اتفاق اور اس خوشی پر موقوف ہے جو روح القدس کی طرف سے ہوتی ہے۔" مسیحیت اس قسم کے خیالات سے یکسر خالی ہے۔

(۱۲)

اسلام میں نعمائے (برکات) بہشت اور عذاب ہائے دوزخ کی تعلیم موجود ہے اس تعلیم میں صداقت کا جو عنصر ہے وہ مسیحیت میں اپنی پاکیزہ ترین صورت میں پایا جاتا ہے (یوحنا ۱۴: ۲۔۳؛ مکاشفہ ۲: ۷؛ لوقا ۲۰: ۲۷۔۳۶؛ متی ۲۲: ۳۰؛ ۲۵ باب وغیرہ) قرآن میں بہشت کی تصویر شراب اور نہروں، عورتوں، غلاموں، وغیرہ پر مشتمل ہے جس سے مسلم سلیم الطبع (دانش مند) اشخاص بھی قبول نہیں کر سکتے، لیکن مسیحیت کے مطابق یہ تمام باتیں ناقص اور غلط ہیں (مرقس ۱۲: ۲۵ وغیرہ)۔ یہ تعلیم صرف ان لوگوں کو ہی بھلی معلوم ہو سکتی ہیں جو ترقی کی ابتدائی منازل پر ہوں، لیکن اس طبقہ کے باہر یہ تعلیم دیگر ممالک واقوام کی راہبری نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے غلط خیالات کو مسیحیت میں جگہ حاصل نہیں۔

(۱۳)

اسلام میں جہاد کی تعلیم موجود ہے (سورہ توبہ ۲۹، ۱۱۲، اور ۱۱ تا ۱۵، سورہ محمد ۴ وغیرہ) جو صرف خاص حالات قوم اور ملک سے ہی متعلق ہو سکتی ہے۔ بذریعہ جنگ وجدل لوگوں کو کسی مذہب میں جبریہ داخل کرنے اور لوٹ کا مال قبضہ میں رکھنے (سورہ انفال ۷۰ وغیرہ) کی تعلیم ہر گز اس قسم کی نہیں جس کا اطلاق کل اقوام اور ممالک عالم پر ہو سکے۔ یہ تعلیم سراسر باطل ہے لہٰذا کلمۃ اللہ کی تعلیم میں دخل نہیں پاتی۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن قصاص وانتقام کی تعلیم دیتا ہے۔ (سورہ بقرہ ۱۹، سورہ مائدہ ۴۹، سورہ شوریٰ ۳۴ تا ۳۸، سورہ نحل ۱۲۷ وغیرہ) لیکن کلمۃ اللہ نے جیسا ہم گزشتہ فصل میں بیان کر چکے ہیں اس قسم کی تعلیم کو غلط قرار دے کر دشمن سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔

(۱۴)

عورات کی حیثیت کے متعلق احکام قرآن میں پائے جاتے ہیں (سورہ نساء ۲۳ تا ۲۸، سورہ بقرہ ۲۲۳ وغیرہ)۔ یہ احکام عرب جاہلیت کو سدھارنے کی خاطر وضع کئے گئے تھے۔ ان میں جو صداقت کے پہلو ہیں وہ بدرجہ احسن انجیل جلیل میں موجود ہیں جیسا کہ ہم اس باب کی فصل اول میں ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن قرآنی تعلیم کے ناقص پہلو مثلاً تعداد ازدواجی، طلاق وغیرہ (سورہ نساء آیت ۳، سورہ بقرہ ۲۳۱، ۲۳۰ وغیرہ) صرف خاص ملک قوم اور طبقہ کے ساتھ ہی تعلق رکھ سکتے ہیں اور ان کے اصول کا اطلاق کل دنیا کے ممالک واقوام پر نہیں ہو سکتا لہٰذا یہ تعلیم عالم گیر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور یہی وجہ ہے کہ مسیحیت ان تمام ناقص غیر مکمل اور باطل عناصر سے پاک ہے۔

(۱۵)

قرآن میں اصول مواخات (بھائی چارہ) صرف مسلمانوں کے دائرہ تک محدود کیا گیا ہے (سورہ حجرات ۱۰) مسیحیت میں اخوت کا اصول بدرجہ احسن موجود ہے (متی ۲۳: ۸۔۹؛ ۲۲: ۴۰ وغیرہ) اس مضمون پر ہم گزشتہ فصل میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ صداقت کا وہ عنصر جو قرآن کی تعلیم اخوت میں ہے اپنی اعلیٰ ترین صورت میں انجیل شریف میں موجود ہے (یوحنا ۱۲: ۳۴۔۳۵؛ ۱۵: ۱۲۔۱۴ وغیرہ) لیکن قرآنی تعلیم میں نقص یہ ہے کہ اخوت کو ایک طبقہ تک ہی محدود کر دیا گیا ہے (سورہ حجرات ۱۰) اور دوسروں سے دوستی رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔ (سورہ فتح ۲۹، سورہ انفال ۷۴، سورہ مائدہ ۶۲، سورہ ممتحنہ ۸ تا ۹ وغیرہ) کلمۃ اللہ کی تعلیم نے اس ناقص اور غیر مکمل حد کو توڑ کر نوع انسانی کی اخوت کا سبق دیا ہے۔ (متی ۵: ۴۳)۔

(۱۶)

ہم نے اسلام اور قرآن کے اہم اصول پر نظر کر کے دیکھا ہے کہ ان اصول میں جو صداقت کے پہلو ہیں وہ سب کے سب مسیحیت میں پاکیزہ ترین صورت میں پائے جاتے ہیں لیکن قرآنی تعلیم کے ناقص، غیر مکمل اور باطل پہلوؤں کو مسیحیت میں کہیں دخل نہیں۔ لہٰذا مسیحیت ان تمام صداقتوں کو اپنے اندر جمع رکھتی ہے جو اسلام کی کامیابی کا باعث ہیں لیکن ان تمام اباطیل سے پاک ہے جو اسلام کی ناکامی کا باعث ہیں۔ ہم نے اس مضمون پر ایک اور کتاب میں مفصل بحث کی اور ثابت کیا ہے کہ اسلام ان ناقص اور غیر مکمل عناصر کی وجہ سے عالم گیر مذہب نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ مسیحی مذہب تمام صداقتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں باطل اصول ہر گز نہیں پاتے لہٰذا صرف وہی عالم گیر مذہب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

مسیحیت کی جامعیت

مختلف مذاہب کے اصول کے مطالعہ سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ مختلف مذاہب حق اور صداقت کے صرف مختلف پہلوؤں پر ہی زور دیتے ہیں اور باقی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً ہندو مذہب ہمہ اوستی عقیدہ کا قائل ہو کر خدا کے رفیع اور بلند و بالا ہونے کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسلام میں خدا کے بلند و بالا ہونے پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ خدا اور انسان میں ایک وسیع خلیج حائل کر دی گئی ہے۔ علی ہذا القیاس اگر اسلام ایک صداقت پر زور دیتا ہے تو دوسری کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر ہندو مذہب ایک قسم کی صداقت کی تعلیم دیتا ہے تو وہ دوسری قسم کی صداقت کو نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن مسیحیت میں صداقت کے مذکورہ بالا دونوں عناصر پہلو بہ پہلو ایک ہی نظام میں منظم پائے جاتے ہیں۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم کے مطابق خدائے قدوس محبت کا خدا ہے جو بنی آدم سے بلند و بالا بھی ہے اور اپنی ازلی محبت کی وجہ سے ہر فرد بشر کے ساتھ رفاقت رکھتا ہے۔ بدھ مت میں عدل اور انصاف پر بے حد زور دیا گیا ہے، لیکن اس مذہب میں محبت کو جو انسان کے دل کو فی الحقیقت بدل دیتی ہے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مسیحیت میں خدا کی محبت اور خدا کا عدل دونوں پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ چین کے کنفوشیس کا مذہب دینوی تعلقات کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ یہ تعلقات ان ازلی تعلقات کا عکس ہیں، جو خدا اور انسان کی ذات سے متعلق ہیں۔ مسیحیت میں ازلی اور دنیاوی تعلقات دونوں پر زور دیا گیا ہے۔ جاپان کا شنٹو مذہب حب الوطنی کا سبق سکھلاتا ہے، لیکن اس مذہب کے نزدیک ملک کی محبت صرف ایک ملک یعنی جاپان تک محدود ہے، لیکن مسیحیت صداقت کے اس عنصر کو کامل کر کے یہ تعلیم دیتی ہے، کہ ہم نہ صرف اپنے ملک اور قوم کے ساتھ بلکہ تمام ممالک و اقوام کے ساتھ محبت کریں۔

بستہ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زبان

نوع انسان قوم ہو میری، وطن میرا جہاں (اقبال)

پس صداقت کے مختلف عناصر مختلف مذاہب میں یہاں اور وہاں اور جگہ بہ جگہ اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں لیکن یہ تمام کے تمام عناصر مسیحیت میں اپنی نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ صورت میں ایک جگہ جمع ہیں۔ یہ سب کے سب عناصر مختلف شعاعوں کی طرح ہیں جن کے ذریعہ ''عالمِ بالا کا آفتاب لوگوں پر طلوع ہو'' (لوقا ۱:۷۸) اور مسیح ''آفتاب صداقت'' ہے۔ (ملاکی ۴:۲؛ افسیوں ۵:۱۴ وغیرہ)۔ جس کے بانی نے فرمایا ہے کہ ''دنیا کا نور میں ہوں، جو میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا۔ (یوحنا ۸:۱۲) حکیم قانی کا شعر آپ پر لفظ بلفظ صادق آتا ہے:۔

توجسم شرع راجانی تودرّ عقل راکانی

توگنج کان یزدانی ۔تو رانی سرّ ما[1] ومالا

(۲)

حق تو یہ ہے کہ ادیانِ عالم کی مختلف صداقتیں صرف مسیحیت میں ہی جمع ہو کر محفوظ رہ سکتی ہیں۔ کیونکہ ان مذاہب میں صداقت کا عنصر بطالت کے عناصر کے ساتھ اس قدر ملا جلا ہوتا ہے، کہ صداقت کے عنصر کی ہستی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے۔ان مذاہب میں صداقت اور بطالت کے عناصر ایک جگہ باہم خلط ملط پائے ہیں، مثلاً اگر کسی الہامی کتاب میں ایک صفحہ پر خدا کی قدوسیت کی تعلیم دی گئی ہو اس کے اگلے صفحہ پر ایسی باتیں ہوں جو مخربِ اخلاق (بگڑا ہوا رویہ) ہیں، تو صداقت کا عنصر انسان کی زندگی کو کس طرح متاثر کر سکے گا؟ ان مذاہب میں غلط تصورات کے بادل اور کالی گھٹائیں صداقت کے عناصر کی شعاعوں کو چھپا لیتی ہیں اور صداقت کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہیں اور روحانی تاریکی چھا جاتی ہے۔ مثلاً ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ اور بت پرستی اور دیگر اوہام (وہم کی جمع، ذہنی تصور) سے بیزار ہے۔ لیکن اس مت (مذہب) میں کروڑوں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بت پرستی پر قائم ہیں۔ ہندو دھرم کے اندر خدا پرست بھی ہیں، ملحد اور دہریہ بھی ہیں۔ ہمہ اوستی اور مادہ پرست دونوں اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ ہندو دھرم مختلف قسم کے عقائد اور متضاد خیالات کا مجموعہ ہے اور کوئی طاقت ان مختلف متضاد خیالات اور اعتقادات کو جو منتشر صورت میں ہندو دھرم میں پائے جاتے ہیں، باہم ایک جگہ نہیں کر سکتی۔ کوئی انسان ہندو دھرم کی صداقتوں پر مضبوطی سے قائم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ وہ اسی دھرم کے باطل عقائد کے ساتھ ایک ہی نظام میں منظم ہیں اور صداقت اور بطالت کے عناصر اس مذہب کے جزو لاینفک (وہ حصہ جو علیحدہ نہ ہو سکے) ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ کی روزمرہ کی زندگی کے معاملات پر صداقت کے عناصر کا اثر نہیں ہوتا اور عملی زندگی میں اچھے اور برے حصص (حصہ کی جمع) کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ صداقت کے عناصر بذاتِ خود قائم نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ باطل عنصروں کے ساتھ بے حد خلط ملط ہو چکے ہیں۔ یہی حال دیگر مذاہب کا ہے۔ان کے بطالت کے عناصر کی آندھیاں صداقت کے عناصر کے ٹمٹماتے چراغ کو بجھا دیتی ہیں۔

دیگر تمام صداقتیں مسیحیت میں قائم اور محفوظ رہتی ہیں، کیونکہ مسیحیت میں حق اور باطل کا تانا بانا نہیں اور نہ اس میں تاریکی کا کوئی نشان ہے (یوحنا ۱:۵) مسیحیت ایک ایسا جامع مذہب ہے، جس میں مختلف مذاہب کی تمام صداقتیں جمع ہو کر زور اور قوت حاصل کرتی ہیں۔ چونکہ اس میں بطالت کا نام تک نہیں، لہٰذا کمزوری اور ناکامی اس کی قسمت میں روز اول ہی سے نہیں۔ تاریخ ممالک مشرق و مغرب ہم کو بتاتی ہے، وہ جس ملک میں گئی غالب آئی اور ادیانِ عالم کو ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود صرف اپنی صداقت کی قوت سے فتح کرتی چلی آئی ہے۔ مسیحیت میں صداقت کے تمام اصول زندہ قائم اور استوار ہو جاتے ہیں اور بنی آدم کو ابدی زندگی کو پہنچاتے ہیں۔ مسیحیت مختلف مذاہب کی صداقتوں کو ان مذاہب کے باطل عنصروں سے مخلصی دلا کر ان کی تمام بیماریوں سے شفا دے کر ان کی مخصوص صداقتوں کو ہلاک ہونے سے بچاتی ہے۔ یہ صداقتیں عقاب کی مانند از سرِ نو جوان ہو جاتی ہیں اور مسیحیت کی آغوش میں پرورش پا کر بنی نوع انسان کو اس قابل بنا دیتی ہیں، کہ وہ خدا کی صورت پر ہو جائیں۔

(۳)

علاوہ ازیں ادیانِ عالم میں ہم حق اور باطل کے عناصر کی جو امتیاز کرتے ہیں وہ مسیحیت کی طفیل اور مسیحیت کی روشنی میں ہی کر سکتے ہیں۔ یہ مذاہب خود اس قسم کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ حق اور باطل کے عناصر میں تمیز کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب کے پیروان کے اچھے اور

---

[1] ۔قرآنی آیت کے الفاظ بمعنی تو نے اپنے بندے سے وہ باتیں کیں جو کیں۔

برے حصص دونوں پر عمل کرتے ہیں۔ مثلاً ہندو دھرم کے اصول کی روشنی میں ذات پات کی قیود اور اچھوت کو برا نہیں کہا جاتا جس طرح اہل ہنود اپنے دھرم کے اچھے اصول پر عمل پیرا ہیں اسی طرح وہ اچھوت کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔ ہندو دھرم اس بات کا اہل نہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرے۔ گاندھی جی نے مسیحیت کی روشنی میں ہی اچھوت کے خیال کو مذموم بات قرار دے کر اس کے خلاف جہاد شروع کیا ہے۔ لیکن خود گاندھی جی بت پرستی کے خلاف نہیں اور ذات پات کے قائل ہیں۔ اسلامی دنیا تعداد ازدواج پر ہمیشہ عمل کرتی آئی ہے اور زمانہ ماضی میں اسلام کی روشنی میں اس کو کبھی مذموم (بُرا) قرار نہیں دیا گیا لیکن مسیحیت کی ضیا پاشی (روشنی پھیلانا) کی وجہ سے اب یہ رسم مذموم خیال کی جانے ہے ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت کے اصول کی ضیا پاشی میں ہی ہم ان مذاہب کے اچھے اور برے پہلوؤں میں تمیز کر سکتے ہیں اور نہ صرف یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان میں کیا کچھ ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ان میں کیا کچھ نہیں ہے۔

کلمۃ اللہ کے اصول کی روشنی میں کل دنیا کے مذاہب اس بات کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنے اصولوں کی اصلاح کریں۔ ہندو دھرم اب وہ نہیں رہا جو دو سو (۲۰۰) سال پہلے تھا۔ اسلامی تعلیم اب وہ نہیں رہی جو پچھلی صدی میں مکتبوں اور مسجدوں میں اور منبروں پر سے دی جاتی تھی۔ دقیانوسی ملانوں کے وعظوں پر اسلامی ممالک مثلاً مصر، ایران، ترکی وغیرہ میں کوئی صحیح العقل شخص دھیان نہیں دیتا۔ چین اور جاپان کے مذاہب کا بھی یہی حال ہے۔ مسیحی تصورات نے ان کے عقائد اور رسوم کی بطالت کو ایسا ظاہر کر دیا ہے، کہ ان کے پیرو مسیحیت سے متاثر ہو کر ان سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں اور انجیل جلیل کے زندہ اصول سے زندگی کا دم لے کر اپنے مذاہب کی بوسیدہ ہڈیوں میں پھونکنے کی بے سود کوشش کرتے ہیں۔ چین کی نئی پود (نسل) اپنے دیوتاؤں کے مندروں کے اندر قدم نہیں رکھتی۔ کنفوشیس اور ٹاؤ مذاہب لاچار کھڑے زمانہ کی نیرنگیاں دیکھ رہے ہیں اور یہ بے دست و پا صلاحیت نہیں رکھتے کہ وہ نئی نسل اور نئی قوم کو شاہراہ ترقی پر چلا سکیں۔

کلمۃ اللہ کی تعلیم نے ہندوستان کو اس قدر متاثر کر رکھا ہے، کہ بیدار مغز ہندو اور مسلمان اپنے مذاہب کی کاٹ چھانٹ کر کے ان کو مسیحی تصورات کے مطابق کرنے کی کوشش میں مشغول ہیں۔ اس پر طرہ (انوکھی بات) یہ کہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ تصورات تو ہمارے مذاہب کا اصلی حصہ ہیں اور مسیحیت کو "بدیشی" مذہب قرار دے کر اپنے ہم وطنوں کے قومی جذبات کو بھڑکاتے ہیں تاکہ کہیں مسیحیت غالب نہ ہو جائے۔

کس نیا موخت علم تیرا از من

کہ عاقبت مرا نشانہ نکرد

لیکن یہ چال کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ جس ملک میں مسیحیت گئی، وہاں کے مذاہب نے یہی وطیرہ (رویہ) اختیار کیا، لیکن چونکہ وہ اپنے اندر زندگی نہ رکھتے تھے بالآخر مغلوب ہوئے اور مسیح فاتح ہوا۔

مسیحیت واحد جہانگیر مذہب ہے

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ مسیحیت دیگر ادیان عالم کی طرح ایک مذہب ہے اور وہ واحد ہمہ گیر اور عالم گیر دین نہیں ہے اور کوئی ایک مذہب عالم گیر نہیں ہو سکتا۔ ہم ان کی توجہ مسیحیت کی خصوصیات کی طرف منعطف (متوجہ ہونا) کرتے ہیں۔

ا۔ مسیحیت کی ایک خصوصیت ہے جو اس کو عالم گیر بنا دیتی ہے اور وہ یہ کہ دیگر ادیان کے اصول و کلام کی قیود سے بالا نہیں ہیں۔ وہ ہر ملک و قوم و نسل اور زمانہ کے انسانوں پر عائد نہیں ہو سکتے۔ وہ نوع انسانی کی تاریخ میں صرف کسی خاص زمانہ، ملک یا قوم و نسل کے لئے ہی وضع کئے گئے تھے اور وہ خاص اسی زمانہ نسل قوم اور ملک تک ہی محدود رہے ہیں اور رہ سکتے ہیں۔ لیکن جیسا ہم باب دوم میں مفصل طور پر بتا چکے ہیں۔ انجیلی

اصول کا اطلاق گزشتہ دو ہزار سال سے نوع انسانی کی ہر نسل و قوم ملک پر ہوتا چلا آیا ہے اور آئندہ زمانہ میں بھی ان کا اطلاق ہوتا رہے گا۔ پس مسیحیت ہی ایک واحد عالم گیر مذہب ہے اور ادیان عالم میں ایک دین نہیں ہے۔ صرف اس کے اصول ہی اعلیٰ ترین، جامع اور مانع اور کامل و اکمل عالم گیر اصول ہیں، جو اقوام عالم کی نشو و نما میں ممد و معاون رہے ہیں۔

۲۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے، کہ مسیحیت کا بانی کلمۃ اللہ اور روح اللہ خدا کا کامل مظہر ہو کر اس دُنیا والوں کے سامنے زندگی کا ایک ایسا نمونہ رکھا جو ہر پہلو سے کامل اور اکمل ہے۔ صرف وہی ایک واحد بے مثال عدیم النظیر کامل انسان ہے انشاءاللہ اس نکتہ پر ہم آئندہ ابواب میں مفصل بحث کریں گے۔

۳۔ مسیحیت کی تیسری خصوصیت جو اس کو ادیان عالم سے ممیز کرتی ہے، یہ ہے کہ دیگر ادیام عالم کے بانی اپنے مذہب کے جزو لاینفک نہیں ہے۔ وہ محض احکام پند و نصائح (نیک مشورے) کا مجموعہ ہیں۔ جن کا تعلق ان کے بانیوں کی شخصیت کے ساتھ محض عارضی، وقتی اور اتفاقی ہے ۔ یہ تعلق عوارض (عارضہ کی جمع، پیش آنے والی چیزیں، مرض، دکھ، بیماریاں) میں سے ہے۔ مثلاً چین کا مذہب کنفیوشس کا مذہب ہے جو اس کے اصول پر مشتمل ہے، لیکن کنفیوشس کی ذات و شخصیت اس کے مذہب کی جزو لاینفک نہیں ہے۔ اسی طرح بدھ مت چند اصولوں پر مشتمل ہے جن کی ہستی اور بقا کا تعلق قطعاً بدھ مت کی ذات سے نہیں ہے۔ اسی طرح بدھ مت ہے یہی حال دیگر مذاہب کا ہے، لیکن کلمۃ اللہ دیگر مذاہب کے بانیوں کی طرح مسیحی مذہب کے بانی نہیں ہیں۔ اور ہستی اور بقا خداوند مسیح کی قدوس ذات سے ایسی وابستہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ خداوند مسیح کی شخصیت کی چٹان پر مسیحیت قائم ہے اور دونوں کا تعلق عارضی اور اتفاقی نہیں بلکہ دائمی اور دوامی ہے۔ دیگر ادیان کسی ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن مسیحی کلیسیا کسی کتاب پر ایمان نہیں رکھتی، بلکہ خداوند مسیح کی قدوس ذات اور شخصیت پر ایمان رکھتی ہے۔ وہ انجیلِ جلیل کو اس لئے مانتی ہے کہ حضرت کلمۃ اللہ وابن اللہ کی تعلیم، زندگی اور موت اور قیامت کے واقعات کا نہ صرف ذکر ہے، بلکہ وہ ان واقعات کی صحیح مفسر اور مستند ترجمان ہے۔ بالفاظ دیگر مسیح مسیحیت ہے اور مسیحیت مسیح ہے۔ انشاءاللہ اگلے باب کی فصل اول میں اس نکتہ پر مفصل بحث کریں گے۔

مسیح کی زندگی کے بغیر انجیل ایک بے حقیقت کتاب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے اصول مسیح کی زندگی کے تحت ہیں اور یہ قدوس پر محبت زندگی ہے ان اصولوں کی بے مثال مثال ہے۔ اناجیلِ اربعہ ابن اللہ کی تعلیم اور ذات وصفات کے نقوش ہیں، جو ''خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کے نقش ہیں (عبرانیوں ۱: ۳)۔ انشاءاللہ ہم اس نکتہ کی اگلے باب کی فصل اول میں توضیح کریں گے۔

باب سوم

جنابِ مسیح ابن اللہ

فصل اول

کلمۃ اللہ بنی نوع انسان کے لئے کامل نمونہ ہیں

کامل نمونے کی ضرورت

ہم نے اس رسالہ کے بابِ اول میں لکھا تھا کہ عالم گیر مذہب کے لئے لازم ہے، کہ اس کا بانی ایک عالم گیر نمونہ ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مجرد تصورات اور اصول اپنے اندر سرے سے یہ صلاحیت ہی نہیں رکھتے کہ انسانی زندگی کو تبدیل کر سکیں دورِ حاضرہ میں علم التعلیم کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ بچے نمونہ سے سیکھتے ہیں۔ محض اصولوں کے صرف سبق سکھانے کار گر نہیں ہوتے۔

ہر بچہ کے والدین اور استاد اس واضح حقیقت کو جانتے ہیں کہ بچے نقال ہوتے ہیں اور ان سے وہی افعال سرزد ہوتے ہیں جو دوسروں سے سرزد ہوتے ہیں۔ اگر باپ شرابی ہے تو وہ خواہ اپنے بچے کو شراب پینے سے کتنا ہی منع کرے بچہ شراب پینے سے ہر گز باز نہ رہے گا۔ کیونکہ شرابی باپ کا نمونہ ہر وقت اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس عالم گیر مذہب کے اصول خواہ کتنے ہی اعلیٰ اور ارفع ہوں وہ اپنے اندر یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ بذات خود نیک افعال کے محرک ہو سکیں۔ اگر مجرد اصول اپنے اندر یہ قوت رکھتے اور کسی شخص کی زندگی کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ تو علما کا شمار مقدسین کے گروہ میں ہوتا۔ چنانچہ یقولون مالایفعلون قرآن میں آیا ہے اور ہر شخص "عالم بے عمل" سے واقف ہے۔ پس جب نیک اصول کسی ایک شخص کی زندگی کو تبدیل کرنے سے عاجز ہیں۔ تو وہ نوع انسان کی کایا پلٹ دینے میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں؟ نوع انسانی کی زندگی کو تبدیل کرنے کے لئے ایک کامل انسانی نمونہ کی ضرورت ہے۔ جہاں عالم گیر مذہب میں اعلیٰ اور ارفع اخلاقی اصول کا ہونا ایک لازمی امر ہے وہاں اس سے بھی زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ عالم گیر مذہب ایک عالم گیر نمونہ پیش کرے جو تمام اقوام و ممالک اور ازمنہ کے کروڑوں افراد کی زندگیوں کو متاثر کر سکے اور ان کو اوج فلک (آسمان کی بلندی) پر پہنچا سکے۔

مسیحیت کے اصول اور جنابِ مسیح کی شخصیت کا تعلق

(۱)

کل ادیانِ عالم میں مسیحیت اکیلا واحد مذہب ہے جو اس صداقت پر زور دیتا ہے کہ عالم گیر مذہب میں ایک کامل نمونہ کا ہونا از حد لازمی اور لابدی امر ہے۔ اسلام اور ہندو مذہب کی کتابوں میں جیسا ہم گزشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن اصول خواہ کیسے سنہرے ہوں بذاتِ خود ایک خوبصورت خواب کی مانند ہی ہوتے ہیں۔ ان میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ بذاتِ خود کسی گناہ گار انسان کو نیک زندگی

بسر کرنے کی قدرت عطا کر سکیں مسیحیت میں یہ ایک کھلی حقیقت ہے، کہ جب ابن اللہ اس دنیا سے آسمان پر صعود فرما گئے، تو آپ ورثہ کے طور پر اپنے پیچھے کوئی کتاب نہ چھوڑ گئے جو اصول پر مشتمل ہو۔ بلکہ آپ نے مسیحی کلیسیا کو ورثہ کے طور پر اپنا کامل اور اکمل نمونہ دیا۔ ابن اللہ کی شخصیت ایک زندہ صحیفہ اور کتاب ہے جس کو ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ ہر زمانہ ملک اور قوم کے افراد اس جیتی جاگتی چلتی پھرتی ہنستی بولتی تصویر کو دیکھ کر کہتے آئے ہیں کہ جس نے اس کو دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔ ابن اللہ کا ترس، رحم، ہمدردی اور محبت بھری زندگی اور مثال دیکھ کر گناہ گار دنیا خدا کی ازلی محبت کا یقین کر سکتی ہے۔ کیونکہ آپ کے خیالات، تصورات، احساسات، جذبات، اقوال اور افعال وغیرہ سب کے سب اس الٰہی محبت کا زندہ ثبوت ہیں۔ ہر معنی میں آپ کی زندگی حقیقی طور پر خدا کا مکاشفہ تھی۔

دیگر مذاہب کسی نہ کسی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس پر ایمان لائیں۔ لیکن مسیحی کلیسیا کسی کتاب پر ایمان نہیں رکھتی اور نہ لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہے وہ زندہ مسیح پر ایمان رکھتی ہے اور انجیل کی کتاب کو اس واسطے مانتی ہے کیونکہ اس میں خدا کی محبت کے اس مکاشفہ کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ جو کلمۃ اللہ وسیلے دنیا پر ظاہر ہوا۔ کلیسیا لوگوں کو زندہ مسیح پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہے۔ جس نے اپنے کلام و عمل زندگی، موت اور ظفریاب قیامت سے خدا کی لازوال پدرانہ محبت کو عالم و عالمیان پر ظاہر کر دیا۔ وہ انجیل جلیل کو دنیا والوں کے سامنے اس واسطے پیش کرتی ہے، تاکہ وہ اس کو پڑھ کر خدا کی محبت کو اس مکاشفہ سے واقف ہو سکیں۔ مسیحیت میں اور دیگر ادیان میں یہ بین اور بنیادی فرق ہے۔ جو کبھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسیحیت کسی کتاب پر ایمان نہیں رکھتی، بلکہ وہ ایک زندہ منجی مسیح کی شخصیت پر ایمان رکھتی، بلکہ وہ ایک زندہ منجی مسیح کی شخصیت پر ایمان رکھتی ہے۔ دیگر مذاہب کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں مثلاً اہل اسلام ایک کتاب (قرآن) پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ رسول عربی کو اس واسطے مانتے ہیں کہ وہ قرآن لائے۔ قران مجید کے مطابق حضرت محمد دیگر انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ لیکن مسیحی کتاب انجیل پر ایمان نہیں رکھتے، بلکہ اسکو اس لئے تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں خدا کا مکاشفہ درج ہے۔ جو مسیح ہے وہ مسیح پر رکھتے ہیں۔ جو دیگر خاطی اور گنہگار انسانوں کی طرح ایک انسان نہیں تھا۔ بلکہ ہر قسم کی آزمائشوں پر غالب آکر بنی نوع انسان کے لئے ایک کامل اور اکمل نمونہ بنا۔ باقی تمام مذاہب اپنی دینی کتب کو پیش کرتے ہیں۔ جو مختلف اصولوں کا مجموعہ ہیں لیکن مسیحیت کسی کتاب یا اصول پر مشتمل نہیں اگرچہ جیسا ہم نے باب دوم میں ثابت کر دیا ہے اس کے اصول اعلیٰ ارفع اور ہمہ گیر ہیں۔ مسیحیت کا تمام دارومدار کلمۃ اللہ کی زندہ شخصیت پر ہے جو مسیحیت کی روحِ رواں ہے

(۲)

ابن اللہ کی زندگی کا انجیل شریف کی اخلاقیات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ابن اللہ کا جو تعلق خدا کے ساتھ تھا وہ لاثانی تھا۔ آپ کی کامل زندگی کو دیکھ کر آپ کے حوارئین پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ خدا کا جو مکاشفہ آپ نے ظاہر کیا ہے، وہ محض آپ کی تعلیم اور الفاظ میں ہی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی کامل زندگی اور اکمل نمونہ میں بھی ہے۔ آپ کی تعلیم لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتی تھی (یوحنا ۷:۴۶ وغیرہ)۔ کیونکہ وہ تعلیم ایک ایسے باقدرت اور با اختیار شخص کے منہ سے نکلتی تھی (مرقس ۱:۲۲؛ متی ۷:۲۸۔۲۹ وغیرہ) جس کی زندگی کامل تھی (۲۔ کرنتھیوں ۴:۴؛ کلسیوں ۱:۲۹؛ عبرانیوں ۱:۳؛ ۲:۱۰ وغیرہ) آپ کی زندگی آپ کی تعلیم کی طرح بے نظیر تھی۔ آپ کی تعلیم کی زندہ بے مثال مثال تھی۔ آپ کی تعلیم میں خدا کی محبت اور انسان کی محبت باہم پیوستہ تھی تو آپ کی عملی زندگی میں بھی لوگوں کو خدا کی محبت اور انسان کی محبت یک جا نظر آتی تھی۔ آپکی زندگی سے یہ سب پر عیاں ہو گیا تھا کہ باپ (پروردگار) کی محبت آپ کے تمام اعمال وافعال کی محرک تھی اور یہ محبت آپ نے بنی نوع انسان کے ساتھ محبت کرنے اور ان کی خدمت کرنے سے ظاہر کی۔ مسیحیت میں جو نرالی بات ہے وہ محض کلمۃ اللہ کی تعلیم ہی نہیں بلکہ

جس طریقہ سے آپ نے زندگی بسر کی وہ دنیا جہاں سے نرالا ہے۔ آپ کی تعلیم کے ہر لفظ کی پشت پر آپ کی مثال اور نمونہ ہے جس نے دنیا کو وِرطہ (بھنور، گرداب) حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

(۳)

دیگر مذاہب کے بانی عمر رسیدہ ہو کر اس فانی دنیا سے رحلت کر گئے۔ جب وہ زندہ تھے مدتِ مدید تک لوگوں کو تعلیم دیتے رہے چنانچہ رسول عربی نے 22 سال اور مہاتما بدھ نے 45 سال تک تعلیم دی۔ لیکن کلمۃ اللہ نے صرف 33 سال کی عمر پائی جس میں آپ نے صرف تین سال کے قریب تعلیم دی۔ ان تین سال میں جو کچھ آپ نے کیا اور کہا وہ زیادہ سے زیادہ سے چالیس صفحوں کے اندر لکھا گیا ہے جس کو ایک معمولی سمجھ کا انسان دو تین گھنٹوں میں باآسانی تمام پڑھ سکتا ہے لیکن آپ کی اس مختصر تعلیم اور زندگی نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ آپ کی تعلیم زندگی اور نمونہ نے کسی ایک ملک یا قوم یا پشت یا زمانہ کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ دو ہزار سال سے دنیا کے ہر ملک کے گوشے گوشے اور ہر قوم کے ہر زمانہ کے کروڑوں افراد کے دلوں کو مسخر کر لیا ہے۔ چنانچہ مورخ لیکی (Lecky) رقمطراز ہے کہ

> ''اگرچہ مسیح نے صرف قریباً تین سال تک تعلیم دی اور خلق خدا کی خدمت کی تاہم اس قلیل مدت میں اس کے پاکیزہ نمونہ اور خصلت کے بے نظیر کرشمہ نے دنیا کو ایسا متاثر کر دیا کہ انسان کی فطرت میں جو وحشت اور سنگدلی تھی اس کی اصلاح ہو گئی اور دنیا میں محبت کا ایسا دور دورہ ہو گیا کہ فلاسفروں کی سینکڑوں سالوں کی تعلیم اور اخلاقیات کے استادوں کی ہزاروں نیک مساعی سے اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔''[1]

دیگر مذاہب کے بانیوں کے برعکس آپ کی پشت پر نہ قوت تھی نہ سطوت (شان و شوکت) نہ سلطنت۔ آپ کے حوارئین نہ صاحب علم و جاہ تھے نہ صاحب ثروت و دولت تھے۔ بلکہ معمولی مچھوؤں اور محصول لینے والے جاہل گنوار اور بے سلیقہ اشخاص تھے۔ (یوحنا ۷: ۵۲؛ ۱: ۴۶؛ ۷: ۴۹؛ متی ۹: ۹؛ مرقس ۱: ۲۰ وغیرہ) اس قسم کے محدود وسائل کے ذریعہ ابن اللہ نے اپنی غیر فانی بادشاہت کو قائم کیا، جس کا وجود بجائے خود اعجازی ہے۔ روئے زمین پر کسی شخص کی سیرت پر بے شمار زبانوں میں اس کثرت سے کتابیں نہیں لکھی گئیں جتنی ابن اللہ کی زندگی پر لکھی گئیں ہیں۔ کلمۃ اللہ کی زندگی میں یہ اعجاز ہے کہ ہر شخص جو آپ کے کلام اور زندگی سے واقف ہو جاتا ہے، آپ کا شیفتہ (عاشق) اور گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خداوند مسیح کا وجود ایک مقبولِ عام ہستی ہے۔ آپ کی مقبولیت مسیحی کلیسیا کے پروپگنڈا پر موقوف نہیں ہے بلکہ آپ کی مقبولیت کا راز آپ کی ہمہ گیر شخصیت میں مضمر ہے۔

خوباں شکستہ رنگ خجل ایستادہ اند
ہر جا تو آفتاب شمائل نشستہ

دیگر مذاہب کے پیرو ہر ممکن طور پر کوشاں ہیں کہ اپنے مذاہب کے بانیوں کی زندگیوں میں سے وہ تمام واقعات کسی نہ کسی طرح سے خارج کر دیں جو ابن اللہ کی زندگی اور نمونہ کے خلاف ہیں۔ اور ان کی زندگیوں میں جو عیوب ہیں وہ کسی نہ کسی طرح ہنر ظاہر ہو جائیں۔
بقول مولانا حالی:

---

[1] . History of European morals vol.2

پوچھا جو کل انجام ترقی بشر

یاروں سے کہا پیر مغاں نے ہنس کر

باقی نہ رہے گا کوئی انسان میں عیب

ہوجائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

غیر مسیحی مذاہب کے پیرو بڑی جدوجہد کرکے اپنے ہادیوں اور نبیوں کی زندگیوں کی دلکش تصویر کھینچتے ہیں (جو عموماً حقیقت کی بجائے ان کی اپنی قوت متخیلہ پر مبنی ہوتی ہے) تاکہ عوام الناس کی نظروں میں ان کے دینی راہنماؤں کی ہستی ایک قابلِ قدر شخصیت متصور ہوسکے لیکن کلمتہ اللہ کی ذات انسان کی قوت متخیلہ اور قلمی مساعی (تحریری کوشش) اور مسحور کرلینے والی تقریروں سے مستغنی (آزاد) ہے۔ کیونکہ

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری

حقیقت تو یہی ہے کہ

زعشق ناکمال ماجمال یار مستغنی است

باب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

بلکہ ہمارے ملک کے غیر مسیحی احباب کی الٹی شکایت یہ ہوتی ہے کہ مبلغین اس بات کے اہل نہیں ہوتے کہ ہندوستانیوں کے سامنے مسیح کی دلآویز تصویر کو ایسے پیرائے میں پیش کریں جو اس کا حق ہے تاکہ ان کے خیالات وجذبات کو کماحصہ متاثر کرے۔

(۴)

مسیحیت کی فتح کا راز ہی یہ ہے کہ مسیحیت مسیح ہے اور مسیح مسیحیت ہے۔ ابن اللہ کی شخصیت اور عالم گیر پیغام میں ایک ایسا بے نظیر تعلق ہے جو کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں۔ یہ تعلق اس قسم کا نہیں جیسا حضرت محمد صاحب کا اسلام کے مذہب کے ساتھ ہے۔ یا مہاتما بدھ کا ہندوستان کے قدیم مذہب کے ساتھ یا حضرت زرتشت کا ایران کے مذہب کے ساتھ ہے۔ ان مذاہب کے بانیوں کی زندگی ان کے پیغام کا حصہ نہیں۔ وہ محض پیغام بر ہیں اور بس۔ لیکن مسیحیت کی یہ حالت نہیں ہے۔ کلمتہ اللہ کی ذات بابرکات آپ کے پیغام یا خوشخبری یا انجیل شریف کا جزولاینفک ہے۔ جس سے وہ جدا نہیں ہے اور نہ ہوسکتی۔ یہ نمایاں حقیقت خود ہمارے مقدس مذہب کے نام یعنی ''مسیحیت'' سے عیاں ہیں کسی دوسرے مذہب میں یہ بات نہیں پائی جاتی کہ اس کے بانی کی شخصیت اس کا جزو ہو۔ مثلاً حضرت محمد کے مذہب کا نام ''محمدیت'' نہیں بلکہ اسلام ہے۔ بدھ مت کی مقدس کتابوں میں اس مت کا نام "بدھ مت'' نہیں۔ حضرت محمد نے اہلِ عرب کو اسلام کے اصول کی تلقین کی، لیکن جنابِ مسیح نے تعلیم دینے کے علاوہ ہر شخص کو یہی فرمایا ''میرے پیچھے چلے آؤ'' (متی ۴: ۱۹) ''تو میرے پیچھے چل'' (متی ۴: ۲۲) ''میرے پیچھے ہولے'' (متی ۹: ۹) ''اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی کا انکا ر کرے او راپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے'' (مرقس ۸: ۳۴) ''اپنا سب کچھ غریبوں کو بانٹ دے اور میرے پیچھے ہولے'' (لوقا ۱۸: ۲۲) ''میرے پیچھے ہولے'' (یوحنا ۱: ۴۳) ''میرے پیچھے ہولے'' (یوحنا ۲۱: ۲۲) ''میری بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں اور میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں اور میں ان کو ہمیشہ کی زندگی دیتا ہوں'' (یوحنا ۱۰: ۲۷) ''اگر کوئی شخص میری خدمت کرنا چاہے تو میرے پیچھے ہولے'' (یوحنا ۱۲: ۲۶) ''دنیا کا نور میں ہوں جو میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا'' (یوحنا ۸: ۱۲) جنابِ مسیح کا تعلق مسیحیت کے ساتھ گہرا اور بے بنیادی لاثانی ہے۔

دیگر مذاہب کی خصوصیت ان کی تعلیم میں ہے ،لیکن مسیحیت کی ابتدا امتیازی خصوصیت اس کی صرف تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ اس طغرائے امتیاز (بزرگی کی نشانی) یہ ہے کہ اس کی زندگی اور ہستی اس کے بانی کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔اس کے پیرو اس کے بانی کی تعلیم پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ اس کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن مسیحی خداوند مسیح پر ایمان رکھتے ہیں۔وہ خدا پر اس لئے ایمان رکھتے ہیں کہ وہ مسیح کی مانند ہے۔وہ انجیل شریف پر اس لئے ایمان رکھتے ہیں کہ اس میں وہ مکاشفہ ہے موجود ہے۔ جس پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ جنابِ مسیح کی ذات کے وسیلے ہم پر ظاہر کیا۔ وہ قیامت پر اس لئے ایمان رکھتے ہیں کہ جنابِ مسیح نے مردوں میں زندہ ہوکر ثابت کردیا کہ ''قیامت اور زندگی میں ہوں (یوحنا۱۱:۵۲)۔ مسیحیت کی بناوہ رشتہ ہے جو جنابِ مسیح اور آپ کے پیروؤں کے درمیان ہے اور رشتہ لاثانی اور بے نظیر ہے۔ مہاتما بدھ کی شخصیت کا بدھ مت کے ساتھ مطلق تعلق نہیں۔ چنانچہ اپنی موت سے پہلے اس نے انند کو کہا ''اے انند جو تعلیم اور قوانین میں تم کو سکھلائے ہیں وہ میری موت کے بعد تمہارے آقا ہوں گے''۔اسی طرح حضرت محمد اسلام نہیں پیغمبر السلام ہے لیکن مسیحیت مسیح ہے اور اس کے بغیر مسیحیت کچھ چیز نہیں۔ رسولِ عرب کی شخصیت سے ذات اسلام کی تعلیم کا کچھ واسطہ نہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ ''محمد اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں کہ وہ ایک رسول ہے اور بس۔اس سے پہلے اور بھی رسول ہو گذر ہیں پس اگر محمد مر جائے یا قتل ہو جائے تو کہا تم اپنے الٹے پیروں کفر کی جانب پھر لوٹ جاؤ گے ''(سورہ آل عمران ۱۳۸)۔اس ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیم حضرت محمد کی ذات سے جدا ہے۔ لیکن مسیحیت کی تعلیم منجی عالمین کی ذات بابرکات سے جدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آپ کی ذات آپ کے پیام کا جزولاینفک ہے اور جز حقیقی ہے۔ مسیحیت کا پیغام جنابِ مسیح کی ذات کو نوع انسانی کے سامنے پیش کرتا ہے اور بس ''خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ابدی زندگی پائے''(یوحنا۳:۱۶)۔ خدا کی محبت اور ہمیشہ کی زندگی جنابِ مسیح پر ایمان لانا ہے۔ نجات آپ کی ذات مبارک کے ساتھ وابستہ ہے۔ دیگر مذاہب مثلاً اسلام وغیرہ کا پیغام ان کے خصوصی عقائد پر مشتمل ہے، لیکن مسیحیت عقائد یا اخلاقی قوانین پر مشتمل نہیں بلکہ اس کی تعلیم کی علت غائی یہی ہے بنی نوع انسان کو جنابِ مسیح کے پاس لائے۔

کیونکہ انجیل کے ''جلال کی روشنی''ابن اللہ خود ہے۔ جو ''خدا کی صورت ہے''(۲۔کرنتھیوں ۴:۴)۔اور جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش ہو کر سب چیزوں کو اپنی قدرت کاملہ کے کلام سے سنبھالتا ہے(عبرانیوں ۱:۳)۔ چنانچہ انجیل جلیل میں وارد ہوا کہ کلمۃ اللہ اندیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے۔اسی میں سب چیزیں قائم رہتی ہیں۔ وہی کلیسیا کا سر ہے۔ وہی ابتدا سے مردوں میں سے جی اٹھنے والوں میں پہلوٹھا ہے۔تاکہ سب باتوں میں اس کا درجہ اول ہو کیونکہ خدا کو یہ پسند ہے کہ الوہیت کی ساری معموری اس میں سکونت کرے اور اس کے خون کے سبب سے جو صلیب پر بہا، صلح کر کے سب چیزوں کا اسی کے وسیلے سے اپنے ساتھ میل کرے خواہ وہ زمین کی ہوں خواہ آسمان کی (کلسیوں ۱:۱۵۔۲۰؛۲:۲؛رومیوں ۳:۲۵؛۸:۲۹؛۱۱:۳۶؛۱۔کرنتھیوں ۸:۶؛۲۔کرنتھیوں ۵:۱۸؛افسیوں ۱:۱۰؛۲:۱۳؛عبرانیوں ۱۱:۲۷؛ ۱۔پطرس ۳:۲۳؛یوحنا ۱:۱۶؛۱۷:۱۔۵؛متی ۲۵:۳۰وغیرہ)۔

جو اقوام یا افراد کسی زمانہ میں بھی جنابِ مسیح کے قدموں میں آگئے ان کے اخلاق خداوند کی روح کے ذریعہ سدھر گئے۔ آپ نے فرمایا''راہ حق اور زندگی میں ہوں''(یوحنا۱۴:۶)۔ کیا کسی دوسرے مذہب کے بانی نے اپنی ذات کو کبھی ''صراط مستقیم، حق اور زندگی ''قرار دیا؟ وہ رسول عربی کے ہم آواز ہو کر یہی کہتے رہے کہ ''اھدنا الصراط المستقیم ''اے خدا ہم کو سیدھی راہ پر ہدایت کر۔ لیکن خداوند مسیح خود زندہ راہ ہے(عبرانیوں ۱۰:۲۰)

جنابِ مسیح کی انجیلی تصویر صحیح اور تواریخی ہے

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ مسیحیت اور دیگر مذاہب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اس کے بانی کی زندگی اس کا جزو لاینفک ہے، لیکن دیگر مذاہب کے بانیوں کی زندگیاں ان مذاہب کے پیغام کا حصہ نہیں ہیں اور اس سے جدا کی جاسکتی ہیں بالفاظ دیگر اگر ان کی زندگیاں بے لوث نہیں تو ان کے پیغام میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا لیکن مسیح کی زندگی اور موت اور ظفریاب قیامت مسیحیت کا حقیقی جزو ہے۔ مسیحیت مسیح ہے اور اس سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی اور نہ رکھ سکتی ہے۔ پس لازم ہے کہ کلمۃ اللہ کی زندگی (جو آپ کے اصولوں کی صحیح تفسیر ہے) نہ صرف بے لوث گناہ سے مبرا اور خطا سے پاک ہو بلکہ روحانیت کے ہر پہلو سے کامل ہو۔ مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا بانی ایک کامل انسان ہے جو کل بنی نوع انسان کے لئے ایک کامل اور اکمل نمونہ ہے۔ مسیحیت اپنے خداوند کے ہم آواز ہو کر دو ہزار سال سے ہر زمانہ ملک اور قوم کو چیلنج کرتی چلی آئی ہے کہ ''تم میں سے کون مجھ پر گناہ ثابت کر سکتا ہے؟'' (یوحنا ۸: ۴۶)۔ ابن اللہ کی عصمت مسیحی ایمان کے ''کونے کا پتھر'' ہے۔

پس سوال اٹھتا ہے کہ کیا جنابِ مسیح کی تصویر جو ہم کو انجیل جلیل کی کتب میں نظر آتی ہے صحیح ہے؟ ہم اپنے رسالہ ''صحت کتب مقدسہ اور قدامت صحت اناجیل اربعہ کی دو جلدوں'' میں ثابت کر چکے ہیں کہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ صفحہ ہستی پر کوئی دوسری کتاب انجیل شریف کی صحت کے معیار کو نہیں پہنچ سکتی اور جو کہ انجیل کی کتابیں ہمارے ہاتھوں میں ہیں وہ در حقیقت وہی ہیں جو ان کے مصنفین نے لکھی تھیں۔

مثلاً یونانی رومی دنیا کے مصنفوں کی تصنیفات کی حالت ملاحظہ کرو۔ یونان کا فلاسفر افلاطون خداوند مسیح سے چار صدیاں پہلے زندہ تھا۔ لیکن اس کی مختلف تصنیفات میں سے کسی تصنیف کا نسخہ ۸۹۵ء سے زیادہ قدیم نہیں ہے یعنی تمام نسخے اس کی موت کے ایک ہزار دو صد سال بعد کے ہیں۔ یونانی شاعر ہومر کی تصنیفات کے نسخے اس کی وفات کے ایک ہزار ایک سو سال بعد کے ہیں یہی حال دیگر قدیم مصنفین اور مورخین مثلاً ہیرودوتس، درجل میسی بس اور یونانی رومی دنیا کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا کہ ان کی تصنیفات کو جو فی زمانہ مروج ہیں شک کی نظر سے دیکھئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انجیل جلیل کے مصنفوں نے جنابِ مسیح کی زندگی کا نقشہ صحیح طور پر بیان کیا ہے یا کہ نہیں؟ از روئے منطق یا تو جنابِ مسیح کی انجیلی تصویر حقیقت پر مبنی ہے یا وہ حوارئین کے تخیل کی شرمندہ احسان ہے اور اس کی وقعت ایک افسانہ سے زیادہ نہیں۔ شقِ اول میں اگر یہ تصویر حقیقت پر مبنی ہے تو وہ ایک کامل انسان کی زندگی کا خاکہ ہے۔ شقِ دوم میں اگر جنابِ مسیح کا احوال جو انجیل میں درج ہے محض ایک خیالی افسانہ ہے تو انجیل نویس اعلیٰ درجہ کی افسانہ نویس، مصور اور نقاش تھے۔ جن کے قوت متخیلہ کا پرواز وہم و گمان سے بھی دار لوری (گفتگو میں میٹھے سُر) تھا۔ جن لوگوں نے حوارئین کے ماحول کا اور ان کی ذہنیت اور ان کے ذہنی ارتقا کا سطحی مطالعہ بھی کیا ہے وہ دوسری شق کو بے تامل رد کر دیں گے۔ حوارئین کی قوت متخیلہ تو ایک طرف رہی جناب مسیح کے اقوال اور افعال کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تھے اور وہ بار بار اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں (متی ۱۶: ۸۔۱۱؛ ۱۵: ۱۵۔۱۶؛ مرقس ۴: ۱۳؛ یوحنا ۱۶: ۱۶۔۱۸؛ ۱۸: ۲۲۔۲۳؛ ۳: ۲؛ ۱۲: ۱۶؛ وغیرہ۔ حق تو یہ ہے کہ وہ ایماندار اور دیانتدار مورخوں کی طرح آپ کے اقوال اور افعال کو کماحقہ سمجھنے کے لئے بغیر احاطہ تحریر میں لے آتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انجیل میں ایک ایسی شخصیت کا ذکر ہے جو ہر پہلو سے کامل ہے۔ انجیل نویس خود گناہ گار تھے اور ان کی قوتِ متخیلہ ایک کامل شخص کا نقشہ پیش کرنے سے عاجز تھی جس طرح پانی اپنے منبع اور سرچشمہ کی سطح سے اونچا نہیں ہو سکتا۔ بفرض محال اگر انجیل نویسوں کی قوت متخیلہ پرواز کر کے ایک کامل انسان کا تصور باندھ سکی تو ایسے انسان کو وہ روز مرہ کی زندگی کے واقعات اور اپنے گرد و پیش کے ماحول میں رکھ کر اور مختلف قسم کے واقعات اور حوادث میں اس زندگی کو ڈال کر ہر پہلو سے اس کو کامل بنانے میں کس طرح کامیاب ہو گئے اور کامیاب بھی ایسے ہوئے کہ اس تصویر میں دو ہزار سال سے کسی شخص کو تصنع (بناوٹ) کے نشان تک نظر نہیں آئے؟ جنابِ مسیح جیسی شخصیت گھڑنے کے لئے شیکسپیئر ہے۔ پایہ

کے ڈرامانویس سے بھی اعلیٰ دماغ کی ضرورت ہے۔انجیل شریف میں جس سیرت کا خاکہ کھینچا گیا ہے اگر وہ حقیقت پر مبنی نہیں تو اس قسم کی سیرت کا ذہنی اختراع ہونا بجائے خود اس دنیا کا عظیم ترین معجزہ ہوگا اور اناجیل کی مرقع نگاری اعجازی شے ہوگی۔لیکن انجیل جلیل کا سطحی مطالعہ بھی اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ کلمۃ اللہ کی انجیلی تصویر ایک عکسی تصویر ہے، جس میں تخیل کی قوت کو رتی بھر دخل نہیں۔اناجیل اربعہ میں نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ اور سلیس عبارت میں جنابِ مسیح کے خیالات و تصورات،احساسات وجذبات اور افعال و کردار وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اور انجیل نویس کہیں اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ مبالغہ آمیز الفاظ میں ایک ایسی مصنوعی ہستی کو پیش کریں جو حقیقی اور تواریخی نہ ہو۔ان کی تحریرات سے عیاں ہے کہ وہ اپنے آقا کی تعلیم اور اپنے مولا کی زندگی کے چند واقعات بیان کرکے اس کی عظیم الشان شخصیت کا خاکہ کھینچتے ہیں (لوقا ۱:۱۔۴؛۱۔یوحنا ۱:۱۔۴؛یوحنا ۲۱:۲۴۔۲۵)۔انگلستان کا مشہور فلاسفر جان سٹوارٹ مل (مسیحی نہیں تھا) کہتا ہے

''یہ کہنا خرافات (فضول بکواس) میں شامل ہے کہ جس مسیح کا ذکر اناجیل میں ہے وہ تواریخی شخص نہ تھا۔ذرا خیال کرو کہ مسیح کے شاگردوں میں کون اس قابل تھا جو مسیح کے اقوال اختراع کر سکتا یا اسکی طرح کی زندگی اور کیریکٹر (کردار) کو اپنے دماغ سے پیدا کر سکتا۔یہی فلاسفر ایک اور مقام میں لکھتا ہے ''مسیحیت نے اخلاق کا معیار مسیح کی زندگی کو ٹھہرا کر اور ایک قدوس شخص کا نمونہ بنی آدم کے سامنے پیش کرکے اس امر کو لازم کر دیا ہے کہ تمام دنیا کے انسان (خواہ وہ مسیح پر ایمان رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں) اس کے نمونہ پر چل کر اپنے اخلاق کو سدھاریں مسیحی کلیسیا خدا کو نہیں بلکہ اس کے مظہر مسیح کو بنی نوع انسانی کے سامنے پیش کرتی بلکہ مسیح کی صورت، خصائل، عادات واخلاق کو نوع انسانی کے سامنے پیش کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ خواہ ہم خدا کی ہستی کے قائل ہوں یا دہریہ ہوں مسیح کا نمونہ ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہتا ہے اور یہ بے نظیر نمونہ ہے اور نہ کسی ایسے شخص کی مانند ہے جو مسیح کے بعد پیدا ہوا یا مسیح کا رسول اور جانشین ہوا تھا۔اس کی بے مثال اور لاثانی زندگی ایسی ہے کہ بنی آدم کو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مسیح کی انجیلی تصویر کوئی تواریخی تصویر ہو سکتی ہے !لیکن کوئی یہ تو بتائے کہ مسیح کے رسولوں اور متبعین یا ابتدائی مریدوں میں سے کس شخص میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ ایسی تصویر کو قوت متخیلہ پر زور لگا کر ایجاد کر لیتا یا اس کی سی تعلیم کی تلقین کر سکتا یا اس کی سی زندگی کا نمونہ پیش کر سکتا جو اناجیل میں مسیح سے منسوب ہیں۔کیا گلیل کے مچھوے اس بات کے اہل تھے ؟کیا پولوس میں یہ اہلیت تھی ؟پولوس کے خطوط سے ظاہر ہے کہ اس کی سیرت وخصلت مسیح کی سیرت اور خصلت سے مختلف قسم کی تھی۔ان رسولوں اور مریدوں میں سے ہر شخص یہی اقبال کرتا ہے کہ اگر ان میں کوئی نیکی ہے تو مسیح کے طفیل ہے مسیح کی زندگی اور تعلیم اور نمونہ سے اس کی طبع زاد جدت اور بالغ نظری ہر عاقل پر عیاں ہے۔

ہم جو ناصرت کے نبی پر ایمان نہیں رکھتے یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کو بنی نوع انسان میں وہ درجہ دیں جو کسی دوسرے فرزند آدم کو حاصل نہیں۔جب ہم اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہیں کہ ایسی بلند اخلاق اور ارفع زندگی رکھنے والا انسان روئے زمین پر سب سے بڑا اخلاقیات کا استاد، معلم، مصلح اور شہید ہو گزرا ہے، تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ بنی نوع انسان کا اعلیٰ ترین راہنما ہے جس کی قیادت کا ہم کو چار و ناچار اقبال کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ہم کو (جو اس پر ایمان نہیں رکھتے) مسیح سے بہتر نمونہ چار وانگ عالم میں نہیں ملتا۔یہ نمونہ اس

شخص کا ہے جس نے خود اپنی اعلیٰ تعلیم پر چل کر اور اس پر عمل کر کے بنی نوع انسان کو زبردست اور بے نظیر نمونہ دیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس کا نمونہ ہم کو اس بات پر چار و ناچار مجبور کر دیتا ہے کہ ہم ایسی زندگی بسر کریں جو مسیح کی نظروں میں مقبول ہو"1

فرانس کے نامور عقل پرست غیر مسیحی مصنف روسو(Rousseau)نے درست کہا ہے کہ

"اگر مسیح کی انجیلی تصویر حقیقت پر مبنی نہیں تو اس تصویر کا مصور مسیح سے بھی بڑی اور زیادہ حیرت انگیز شخصیت ہے"۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح کی زندگی کا جو خاکہ اناجیل اربعہ میں موجود ہے وہ ایسا اعلیٰ اور ارفع ہے جو انسانی تخیل اور انسانی دماغ کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ یہی اٹھارھویں صدی کا نامور مصنف ایک اور جگہ ملتا ہے "سقراط کی زندگی اور موت ایک اچھے فلاسفر کی زندگی اور موت تھی، لیکن مسیح کی زندگی اور موت خدا کی شان کے شایاں تھی۔ جب کبھی میں کسی سے یہ سنتا ہوں کہ اس کو انجیل کی صحت پر شک ہے تو میں اس شخص کی عقل پر حیران رہ جاتا ہوں۔ اگر مسیح کی انجیلی تصویر کسی انسانی دماغ کی اختراع ہوتی تو وہ اناجیل اربعہ کی تصویر سے کلیۃً مختلف ہوتی۔ مجھے اس بات پر تعجب آتا ہے کہ کوئی شخص بھی سقراط کی زندگی اور تعلیم سے شک نہیں کرتا حالانکہ اس کی زندگی کی خارجی شہادت اناجیل اربعہ کی خارجی شہادت کی طرح زبردست شہادت نہیں ہے۔ یہ ناممکن امر ہے کہ چار مختلف مصنفوں نے مختلف مقامات و اوقات میں اس قسم کی زندگی کا محض قیاس و تخیل کی بنا پر خاکہ کھینچا ہو۔ یہودی مصنفین کی طرز تحریر اناجیل کی سی نہ تھی اور نہ ان کے اخلاق انجیلی پایہ کے بلند اور افضل اخلاق تھے۔ انجیل کا سطحی مطالعہ بھی یہ صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ مسیح ایک حقیقی زندہ انسان تھا۔ جس کی چلتی پھرتی جیتی جاگتی بولتی تصویر چاروں انجیلوں میں پائی جاتی ہے۔ اگر یہ انجیلی بیانات کسی انسان کو قوت متخیلہ کے مرہون منت ہوتے تو ایسا انسان مسیح سے بھی زیادہ عظیم ہستی ہوتا۔2

اناجیلِ موضوعہ ہم پر ظاہر کر دیتے ہیں کہ اناجیل اربعہ کے لکھنے والے اپنے دماغ سے کام لیتے تو کس قسم کی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے اور انسانی تخیل کا رجحان کس طرف ہوتا۔ ان موضوعہ اناجیل میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ جنابِ مسیح کی نسبت ایسی کہانیاں بیان کی جائیں جو اس زمانہ کے لوگوں کے لئے دلچسپی کا موجب ہو سکتی تھیں۔ لیکن وہ پشت گذر گئی اور اس پشت کے ساتھ ہی وہ مذاق بھی جاتا رہا اور اب جو شخص بھی ان قصے کہانیوں کو پڑھتا ہے، وہ طفلانہ باتیں سمجھ کر ان کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً ان میں لکھا ہے کہ ایک گائے اور گدھی نے جونہی خداوند مسیح کو دیکھا انہوں نے آپ کو سجدہ کیا۔ شیر اور چیتے تک آپ کو حضور سرنگوں ہو کر سجدہ کرتے تھے۔ جب آپ کے والدین آپ کو مصر لے گئے تو آپ طفل ہی تھے، لیکن جس طرف بھی آپ چلتے وہاں آپ کے قدموں کے نیچے گلاب ہی گلاب پیدا ہو جاتے۔ مصر کے بُت آپ کو دیکھ کر دھڑام سے گر پڑتے۔ جب آپ واپس ناصرت آئے تو ایک دفعہ آپ گلی میں جا رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکا بھاگتا بھاگتا آپ سے ٹکرا گیا۔ آپ نے اس کے حق میں بد دعا کی تو وہ وہیں مر گیا۔ آپ نے مٹی سے ایک درجن پرندے خلق کئے جو آسمان کی جانب اڑ گئے۔ ایک استاد کی جو شامت آئی تو اس نے آپ کو برا بھلا کہا اس کی سزا وہیں اس کو مل گئی اور ملک الموت نے اس کو آدبوچا۔ گاؤں گاؤں آپ کی اعجازی قدرت سے خائف و لرزاں تھے۔ آپ نے ایک مردے

---

1 . J.S. Mill, Three Essay.s On Religion,

2 . (Emile) Book vol.4

کو زندہ کیا۔ زندہ ہوتے ہی اس کا قد اتنا بڑا ہو گیا کہ اس کا سر بادلوں کے ساتھ جا ٹکرایا وغیرہ وغیرہ۔ 1 اس طرح کے قصے تیسری اور چوتھی صدی کے ہیں جب اناجیل موضوعہ لکھی گئی تھیں۔ ان کہانیوں میں سے چند ایک نے قرآن میں بھی دخل حاصل کر لیا ہوا ہے مثلاً جنابِ مسیح کا مٹی کے پرندوں کا بنا کر ان کو اڑانا وغیرہ۔ یہ افسانے اساطیر الاولین ہیں اور اسی قسم کے ہیں جو دیگر اقوام کے مذاہب میں بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ مختلف صدیوں میں مختلف اقوام نے کوشش کی ہے کہ اپنے مذاہب کے بانیوں کی ایسی دلکش تصویر پیش کریں جو لوگوں کے لئے دلچسپی کا موجب ہو جائے مثلاً پرانوں میں کرشن کے قصص وغیرہ لیکن جو تصویر ایک قوم یا ملک یا پشت کے لئے دلآویز ہوتی ہے وہ آنے والی پشتوں اور دیگر ممالک واز منہ اور اقوام کی نظر میں معیوب ہو جاتی ہے، لیکن کلمۃ اللہ کی زندگی کا جو خاکہ اناجیل اربعہ میں موجود ہے وہ ایسا قدرتی اور نیچرل ہے کہ اس کے اصلی ہونے میں کسی صاحب عقل کو شک نہیں ہو سکتا۔ جرمن نقاد ڈاکٹر آٹو بورفرٹ (Borchert) نے اپنی کتاب (The Original Jesus) اور فرنچ عالم ڈاکٹر گوگل (Goguel) نے اپنی کتاب (Jesus The Nazarene Myth or History) میں اس موضوع پر فاضلانہ بحث کی ہے کہ

> ''اب تمام مسیحی اور غیر مسیحی علمائے مغرب اور نقاد اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ کلمۃ اللہ کی انجیلی تصویر حقیقت پر مبنی ہے''۔

چنانچہ سٹراس (Strauss) جو راس الملاحدہ (بے دین لوگوں کی میراث) تھا یہ اقبال کرتا ہے کہ

> ''مسیح کی ہستی قوتِ متخیلہ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی انجیلی تصویر گوشت پوست رکھتی ہے اور ایک تاریخی حقیقت ہے۔ وہ مذہب کا اعلیٰ ترین معلم اور افضل ترین نمونہ ہے۔ اگر مذہب کوئی حقیقت رکھتا ہے تو حلقہ مذہب میں مسیح سے بڑھ کر کسی ہستی کا تصور ناممکنات میں سے ہے۔ عالم مذاہب میں کمالات کی جس طرح بلند منزل پر مسیح پہنچا ہے وہاں تک کسی فرد بشر کی رسائی ناممکن ہے۔''

ابن اللہ کی تصویر خود اپنی بہترین اور صادق ترین گواہ ہے اور آپ کی زندگی کا جلال اپنی صداقت کی خود ہی گارنٹی ہے۔

تجلی ہاست حق را در نقابِ ذات انسانی
شہودِ غیب اگر خواہی وجوب این جاست امکانی

انسانِ کامل کا تصور

مختلف ممالک واقوام کے فلاسفروں اور ہادیوں نے انسانِ کامل کے تصور پر بحث کی ہے۔ مثلاً ارسطو کہتا ہے کہ

> ''کامل انسان وہ ہے جو افراط اور تفریط (کوتاہی، کسی چیز میں کمی) سے پرہیز کرے اور اعتدال اور میانہ روی پر اپنی روش کو قائم رکھے''۔

ستویقی فلاسفر کہتے ہیں کہ

> ''کامل انسان وہ ہے جو اپنے اوپر ضبط رکھے''۔

چین کا کنفوشیس اس مضمون پر بحث کے دوران میں کہتا ہے کہ

---

[1] . Apacryphal Gosples.

"کامل انسان وہ ہے جو خاندانی تعلقات میں پاکیزگی کو اختیار کرے"۔

ہندو مذہب کے مطابق "کامل انسان وہ ہے جو دنیا سے الگ تھلگ رہ کر خدا کا نام جپتا رہے اور بھگتی میں مشغول رہے"۔ لیکن امتدادِ زمانہ (طویل مدت) نے ان تصورات کو غیر مکمل ثابت کر دیا ہے۔ ہر شخص یہ بات قبول کرنے کو تیار ہو گا کہ ارسطو کا معیار محض ایک مجرد تصور ہے لہٰذا وہ ناکام ثابت ہوا ہے۔ ستویقی فلاسفہ کا خیال جو انہوں نے انسانِ کامل کی نسبت پیش کیا ناقص ثابت ہوا۔ کیونکہ انسانی جذبات اور احساسات کو دبانا ایسا ہی ہے جس طرح ایک چشمہ جس کے پانی سے انسان اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں دبا دیا جائے۔ کنفوشیس کا تصور ایک گھریلو تصور ہے جو قدیم زمانہ کے لئے موزوں تھا۔ جب حالاتِ زندگی سادہ تھے اور دورہ حاضرہ کی زندگی کے پیچیدہ تعلقات معرض وجود میں نہ آئے تھے۔ پس دورہ حاضرہ کی زندگی پر قدیم چین کے معیارِ زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ہندو مذہب کا تصور غلط ثابت ہوا ہے اور کلمۃ اللہ کی تعلیم و زندگی کے نمونہ نے تقدس کے معیار کو بدل دیا ہے۔ اب وہ شخص مقدس شمار نہیں کئے جاتے جو پہاڑوں کی غاروں میں الگ تھلگ زندگی بسر کریں۔ بلکہ وہ ہستیاں مقدس شمار کی جاتی ہیں جو اس دنیا میں رہ کر خلق خدا کی خدمت کرنا سعادتِ دارین کا موجب خیال کرتی ہیں۔

اسلامی فلسفہ اور انسانِ کامل کا تصور

جب ہم اسلامی کتبِ فلسفہ پر نظر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں فلاسفہ نے انسان کامل کے لئے چند شرائط مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ مولانا جامی علیہ الرحمتہ فصوص الحکم کی شرح میں فرماتے ہیں کہ "شیخ الکبیر کتاب الفلوک میں لکھتے ہیں کہ

> "حقیقی انسان کامل وہ ہے جو وجوب (ضروری ہونا) اور امکان میں برزخ ہو اور صفاتِ قدیمہ اور حادثہ کا آئینہ ہو یہی حق اور خلق کے درمیان واسطہ ہے۔ اسی لئے اور اسی کے آئینہ سے خدا کا فیض تمام مخلوقات پر علوی (اعلیٰ درجہ کا) ہو یا سفلی (پستی کا) پہنچتا ہے اور یہی جزذات حق کے تمام مخلوقات کی بقا کا سبب ہے اگر یہ برزخ جو وجوب اور امکان کا مغایر (ناموافق) نہیں ہے نہ ہوتا تو دنیا کی مدد حاصل نہ ہوتی بہ سبب نہ ہونے مناسبت اور ارتباط (آشنائی) کے"۔

پھر صوفی عبدالکریم جیلانی اپنی کتاب الانسان الکامل کے حصہ دوئم میں یوں لکھتے ہیں

> "جاننا چاہیے کہ انسان کامل وہ ہے جو اسماء ذاتیہ اور صفات الٰہیہ کا اصلی اور ملک (قبضہ) کے طور پر مقتضائے ذاتی (حقیقی وجہ) کے حکم سے مستحق ہو۔ کیونکہ وہ ان عبارات کے ساتھ اپنی حقیقت سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان اشارات کے ساتھ اپنے لطیفہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے وجود میں سوائے انسان کامل کے کوئی مستند (سہارا ٹیکنے کی جگہ) نہیں۔ پس اس کی مثال حق کے لئے ایسی ہی جیسے ایک آئینہ کہ اس میں کوئی شخص اپنی صورت بغیر اس آئینہ کے نہیں دیکھ سکتا اور نہ بغیر اللہ کے اسم کے اپنے نفس کی صورت دیکھنا اس کو غیر ممکن ہے پس وہ اس کا آئینہ ہے اور انسان کامل بھی حق کا آئینہ (مظہر) ہے کیونکہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے نفس پر یہ امر واجب کر لیا ہے کہ اپنے اسما و صفات کو بغیر انسان کامل کے نہیں دکھاتا"۔[1]

---

[1] ۔الانسان الکامل (اردو ترجمہ مولوی ظہیر احمد سہوانی حصہ دوئم صفحہ ۱۰۵ تا ۱۰۶)

پس برزخ کبریٰ اور انسانِ کامل اور مظہر جامع صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو کہ کامل خدا اور کامل انسان ہو صفاتِ قدیمہ الٰہیہ اور صفاتِ ممکنہ انسانیہ کے ساتھ متصف (موصوف: جس کے ساتھ کوئی صفت لگی ہو) ہو۔ کیا اہلِ اسلام آنحضرت میں ان صفات کا وجود مانتے ہیں؟ ہر گز نہیں کیونکہ نبی اسلام کو مظہر ذات خدا قرار دینا اصولِ اسلام کو بدلنا ہے۔ لیکن ربنا المسیح ان تمام اوصاف سے متصف ہیں اور وہ آپ میں انسب اور اکمل طور پر موجود ہیں (یوحنا ۱۰: ۳۰؛ ۱۷: ۱۱۔ ۲۲؛ ۱: ۱۴؛ ۱۴: ۱۱؛ ۱: ۱؛ کلسیوں ۱: ۱۵؛ ۲: ۹ وغیرہ وغیرہ)۔

ہم اہل اسلام کی توجہ شیخ الاکبر امام محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم بالخصوص فص عیسوی اور باب انجیل اور مولوی انور علی صاحب پانی پتی کی کتاب شرح سائیں بلھے شاہ اور سید عبدالکریم جیلانی کی کتاب انسان کامل کی طرف مبذول کرتے ہیں تاکہ آپ دیکھیں کہ حقیقت عیسوی کے متعلق ان مسلمان فلاسفہ اور صوفیاء نے کیا فرمایا ہے۔ حقیقت عیسوی ایک ایسی حقیقت ہے جس کہ کنہ تک پہنچنے میں عقلِ انسانی ورطہ حیرت میں پڑی رہی ہے بقول امام محی الدین ابن العرب "عیسیٰ پر نظر کرنے والے کے نزدیک اسی گمان کے موافق ہوں گے جو اس کے ذہن میں غالب ہے"۔ چنانچہ "جب عیسیٰ مردوں کو زندہ کرتے تھے تو کہا جاتا تھا کہ عیسیٰ بشر ہیں اور بشر نہیں ہیں اور ہر عاقل کو ان کی طرف نظر کرنے میں حیرت واقع ہوتی تھی جس وقت ناظر دیکھتا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ حالانکہ مردوں کو زندہ کرنا خصوصیت الٰہیہ میں سے ہے۔ کیونکہ آپ مردوں کو اس طرح زندہ نہیں کرتے تھے کہ صرف حیوان متحرک ہوں بلکہ مردے زندہ ہو کر کلام بھی کرتے تھے۔ پس ناظر اس معاملہ میں حیران رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ صورت بشری کو اثر الٰہی کے ساتھ ملبس دیکھتا ہے۔ پس بعض اہل عقل کی نظر فکری نے ان کو عیسیٰ کے حق میں کچھ سمجھا یا اور وہ حق تعالیٰ کے آپ میں حلول ہونے کے قائل ہو گئے اور یہ کہنے لگے کہ عیسیٰ خود ہی اللہ تعالیٰ ہیں"۔

پس مسیحیوں نے فرداً فرداً اور کونسلوں کے ذریعہ اور مسلمانوں نے قرآن و فلسفہ کے ذریعہ حقیقتِ عیسوی کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن

کسی کی چلتی نہیں یہاں کچھ

پکارتے سب ہیں ماعر فناوہ

فخر رازی ہوں یا فلاطوں، جلال رومی ہوں یا غزالی۔ آخر سب نے یک زبان ہو کر یہی اقرار کیا کہ

ماعر فناک حق معرفتک

کلمۃ اللہ کامل انسان ہیں

(۱)

اگرچہ کامل انسان ہونے کے لئے معصوم ہونا ایک لازمی اور ضروری شرط ہے تاہم "عصمت" کمالیت کے مفہوم کو کماحقہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ "عصمت" یا بے گناہی محض ایک منفی صفت ہے۔ لیکن کامل انسان نہ صرف بے گناہ ہوتا ہے بلکہ وہ کامل طور پر راستباز ہوتا ہے (فلپیوں ۳: ۱۳)۔ مسیحیت کے نزدیک کامل انسان کا معیار نہایت بلند ہے۔ ہم کو نہ صرف یہ حکم ہے کہ "تم پاک ہو اس لئے کہ خدائے قدوس پاک ہے" (۱۔ پطرس ۱: ۱۵) بلکہ کلمۃ اللہ نے فرمایا ہے "تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے" (متی ۵: ۴۸)۔ خدا محبت ہے پس کامل طور پر راستباز وہ شخص ہے جو "خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھے" اور کل بنی نوع انسان سے "اپنے برابر محبت رکھے (متی ۲۲: ۳۷) کامل انسان محبت مجسم ہوتا ہے (متی ۵: ۴۵)۔ اس کی زندگی محبت کے افعال پر مشتمل اور محبت کے جذبات اور خیالات میں سرشار ہوتی ہے۔ کامل زندگی محبت اور اس کے ظہور یعنی ایثار کی زندگی ہے (متی ۱۹: ۲۱) کامل انسان فنافی اللہ اور فنافی

الانسان ہوتا ہے جو شخص ایسی زندگی بسر کرتا ہے وہ اس دنیا کو فردوس بنا دیتا ہے اور ایسے شخص کے وجود کے طفیل خدا کی مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہوتی ہے۔

یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ جنابِ مسیح اس دنیا میں پہلے اور اکیلے معلم ہیں۔ جنہوں نے دنیا کو یہ تعلیم دی کہ خدا محبت ہے اور یہ بتایا کہ محبت مذہب کا اصل الاصول ہے۔ آپ نے یہ سکھایا کہ محبت اصول ایک واحد کلید ہے، جس سے ہم (۱) خدا کی ذات اور (۲) خدا اور انسان کے باہمی تعلقات اور (۳) انسان اور انسان کے باہمی تعلقات کے تمام پیچیدہ اور مشکل مسائل اور سوالات کو حل کر سکتے ہیں (مرقس ۱۲:۲۸)۔ آپ نے نہ صرف یہ تعلیم دی بلکہ اپنی زندگی سے اس نصب العین کو ظاہر کر دیا۔ آپ کی بے مثال شخصیت نے اس اصول کو بنی نوع انسان کے دلوں پر بٹھا دیا۔ آپ کی زندگی محض اعلیٰ ترین اصولوں کی تلقین کرنے پر ہی مشتمل نہ تھی بلکہ آپ نے اس تعلیم پر عمل پیرا ہو کر دنیا جہان کے انسانوں کو ایک کامل نمونہ دیا ہے۔ کلمۃ اللہ کے تمام تعلقات کامل تھے، جو آپ خدا کے ساتھ، اپنے جسم و روح کے ساتھ۔ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اور موجودات کی دیگر اشیاء کے ساتھ رکھتے تھے ۔ چونکہ آپ کا ایمان کامل تھا (عبرانیوں ۲:۱۰؛۷:۲۸) اور آپ کامل طور پر خدا باپ کے فرمانبردار (عبرانیوں ۵:۸۔۱۰) اور رضائے الٰہی کے جویاں تھے (یوحنا ۴:۳۴؛۵:۳۰) لہٰذا آپ کے تعلقات جو خدا کے ساتھ تھے کامل تھے (یوحنا ۱۷:۱، ۲، ۵، ۲۱)۔ آپ کے ان تعلقات سے جو آپ دیگر انسانوں کے ساتھ رکھتے تھے محبت کا ظہور دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے اپنے ماحول کو اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے اس طور پر استعمال کیا، کہ آپ کی شخصیت جامع شخصیت ہو گئی جو ہر دنیا کے فرد بشر کے لئے ایک کامل نمونہ ہے ابن اللہ کی تعلیم اور زندگی نے ایک ایسا معیار قائم کر دیا ہے جو دو ہزار سال سے ہر زمانہ، قوم ملت اور ملک کی مطمع نظر (اصلی مقصد) اور نصب العین رہا ہے۔ دورہ حاضرہ میں تم کو اس دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو یہ چاہتا ہو کہ ابن اللہ کا مطمع نظر دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ اگر اس کو کوئی شکایت ہو گی تو یہ ہو گی کہ دنیا کے اشخاص کما حقہ اس کامل انسان کی پیروی نہیں کرتے۔

(۲)

کامل انسان کی سیرت کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ کامل انسان کے خیالات، تصورات، جذبات اقوال افعال وغیرہ، غرضیکہ اس کی زندگی کے جتنے مختلف پہلو ہیں۔ وہ تمام کے تمام ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں باہم اختلاف اور تضاد نہیں ہوتا۔ ہم کو اس تعلیم کے اصول اس کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتے ہیں اور اس کی زندگی کا ہر پہلو اس کے اصول کی اعلیٰ ترین مثال دکھائی دیتی ہے۔ جو انسان کامل نہیں ہوتا اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے۔ اس کے قول اور فعل میں مطابقت نہیں ہوتی۔ وہ عالم اور بے عمل ہوتا ہے۔ اس کے تصورات و خیالات، جذبات اور اقوال و افعال میں تفاوت (دوری) پائی جاتی ہے۔ اگر ایک پہلو سے وہ قابلِ تقلید ہے تو دوسرے پہلو سے وہ قابلِ نفرین ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی نسبت ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہر پہلو سے راستباز ہے۔ مثلاً اگر وہ کامل طور پر دیانتدار اور امین ہے، تو ہم یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عورتوں کے معاملہ میں بھی پاکیزہ ہو گا۔ یا وہ طاقت کا بیجا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ ایسا شخص کامل نمونہ نہیں ہو سکتا۔ بنی نوع انسان کے لئے کامل نمونہ نہ صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اختلاف، تفاوت اور تضاد نہ ہو اور جس کی زندگی کے سب پہلو کامل ہوں۔

کلمۃ اللہ کی زندگی کا مطالعہ ہم پر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں کسی قسم کی تفاوت نہیں تھی۔ آپ کے تصورات جذبات اقوال اور افعال میں باہم مطابقت پائی جاتی ہے۔ آپ کی زندگی آپ کے اصولوں کی زندہ مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسا ہم تعریف ذکر کر آئے ہیں کہ مسیحیت مسیح ہے اور مسیح مسیحیت ہے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم آپ کی زندہ شخصیت سے جدا نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ کامل

مطابقت کی وجہ سے فی الحقیقت دو نہیں بلکہ ایک ہیں۔ چونکہ آپ کے خیالات اور جذبات، اقوال اور افعال میں کسی طرح کا بھی تضاد نہیں، لہٰذا ہم آپ کی نسبت یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ آپ جیسے انسان سے فلاں فلاں حالات کے اندر فلاں فلاں قسم کے خیالات جذبات یا افعال صادر ہوں گے اور انجیل شریف کا مطالعہ ہمارے قیاس کی تصدیق کر دیتا ہے اور اس بات پر مہر کر دیتا ہے، کہ آپ فی الحقیقت ایک کامل انسان ہیں۔ روئے زمین کی کسی دوسری ہستی کی نسبت ہم کامل وثوق کے ساتھ یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ فلاں فلاں حالات کے اندر اس سے فلاں فلاں قسم کے جذبات، خیالات اور افعال صادر ہوں گے کیونکہ گو اس کی زندگی کا ایک پہلو تعریف اور تحسین کے لائق ہوتا ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو مذمت کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن کلمۃ اللہ کی زندگی کو بیس صدیوں سے ہر قوم، ملک اور زمانہ نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھ کر کامل پایا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک واقوام نے آپ کی پاکیزہ زندگی کو اپنا معیار بنایا ہے اور اپنی قومی، ملی اور انفرادی زندگی کی اصلاح اس معیار کے مطابق کی ہے۔

ہر قوم وملک کی آنے والی پشت نے صدیوں سے آپ کی زندگی کو اپنے خصوصی زاویہ نگاہ سے دیکھا لیکن آپ کی زندگی ہر پہلو سے کامل نکلی۔ چنانچہ تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ہر زمانہ کے خصوصی مسائل آپ کی زندگی کی روشنی میں حل ہو گئے۔ آپ کے ارفع اصول اور کامل نمونہ کی روشنی میں ہر زمانہ ملک اور قوم کا انسان خیال کر سکتا ہے کہ اگر ابن اللہ میری جگہ ہوتے تو اندریں حالات وہ کیا خیال کرتے یا کیا فرماتے یا کرتے؟ چونکہ جنابِ مسیح کی تعلیم جامع اور مانع ہے اور آپ کا نمونہ عالم گیر ہے لہٰذا ان کا اطلاق ہر زمانہ کے افراد کی زندگی اور ہر قوم وملک کی تاریخ اور ہر شخص پر آپ کا نمونہ عالم گیر ہے۔ لہٰذا ان کا اطلاق ہر زمانہ کے افراد پر ہو سکتا ہے۔ دنیا کے ہر انسان کے لئے آپ کی ارفع تعلیم اور کامل نمونہ معیار کا نام ہے۔

مثلاً اگر کسی شخص کا کوئی جانی دشمن ہو اور وہ یہ جاننا چاہتا ہو کہ میں اپنے خون کے پیاسے کے ساتھ کیا سلوک کروں تو وہ یہ خیال کر سکتا ہے کہ اگر ابن اللہ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ اگر وہ میری جگہ ہوتے تو میرے جانی دشمن سے اس طریقہ سے پیار کرتے کہ اس کی بدی محبت کے ذریعہ مغلوب ہو جاتی (متی ۵: ۴۴؛ لوقا ۲۳: ۳۴)۔ پس مجھ پر فرض ہے کہ میں بھی ایسا طریقہ اختیار کروں جس سے میرا دشمن محبت کے ذریعہ پیار کرنے والا شخص بن جائے۔

(۳)

کامل نمونہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ کامل انسان ہر زمانہ، ملک اور قوم کے ہر فرد بشر کی زندگی کی ہر ادنیٰ تفصیل میں سے خود گزر چکا ہو۔ کوئی انسان زمان ومکان کی قیود سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ ایک ناممکن امر ہے۔ پس وہ ان قیود کے اندر ہی ایک کامل زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لیکن ہمارے بعض مسلمان بھائی اسی قسم کی اہم غلطی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً آنجہانی خواجہ کمال الدین قادیانی کلمۃ اللہ کے مجرد رہنے کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ مسیحیت میں ''زن ومرد کے متعلق کم وبیش تعلیمات تو ہیں لیکن اس کے بانی کی زندگی ہمارے لئے اس معاملہ میں راہ ہدایت نہیں ہو سکتی'' (ینابیع المسیحیت صفحہ ۱۶۰)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حضرت کلمۃ اللہ اپنی تمام عمر مجرد رہے، لہٰذا آپ کی زندگی ایک شادی شدہ شخص کے لئے نمونہ نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنی کتاب (''دینِ فطرت اسلام یا مسیحیت'' کی فصل سوم صفحہ ۴۹) پر وجہ بتا چکے ہیں کہ کلمۃ اللہ نے تجرد کیوں اختیار کیا اور کہ آپ نے تجرد اختیار کر کے محبت، ایثار ونفسی اور خود فراموشی کا اعلیٰ ترین نمونہ بنی نوع انسان کو دیا۔

سطور بالا میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ کامل نمونہ ہونے کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ کامل انسان اعلیٰ ترین روحانی اصول پر اپنی زندگی کی ہر حالت اور ہر ماحول میں کاربند رہا ہو اور اس کی زندگی کے مختلف پہلو ایک دوسرے کے متضاد نہ ہوں۔ جیسا ہم کہہ چکے ہیں یہ امر ناممکنات میں سے ہے کہ ایک واحد شخص مختلف ممالک وازمنہ اور اقوام اور مختلف خیالات اور طبائع (طبیعت کی جمع) کے لوگوں کے لئے ان کی زندگی کی ہر ادنیٰ تفصیل کے

لئے اپنی فانی زندگی کے مسودے چند سالوں کے اندر آنے والی نسلوں کے ہر فرد کے واقعات زندگی میں نمونہ ہو سکے۔ مثلاً بفرض محال اگر ہم اس غیر ممکن معیار اور مفہوم کو تسلیم کر لیں پھر بھی رسول عربی اس مفروضہ معیار پر پورے نہیں اتر سکتے۔ مثلاً متاہل (سوچنے والا) زندگی کے لئے بھی آپ نمونہ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام قیود سے آزاد کر دیا تھا، جو عورتوں کے حقوق، تعداد اور مساوات کے متعلق تھیں (سورہ احزاب ۴۹۔ ۵۱ وغیرہ) پھر چونکہ آپ شادی شدہ شخص تھے آپ مجرد اشخاص کے لئے نمونہ نہیں ہو سکتے۔ چونکہ آپ بچپن ہی سے یتیم ہو گئے تھے اور والدین کا سایہ سر پر سے اٹھ گیا تھا اور والدین کی خدمت کا موقعہ کا آپ کو نہیں ملا تھا۔ لہٰذا دنیا کے انسانوں کے لئے جن کے سر پر بچپن میں ہی والدین کا سایہ نہیں اٹھا والدین کے اطاعت کا نمونہ نہیں ہو سکتے۔ علیٰ ہذا القیاس چونکہ آپ کا کوئی بیٹا نہیں تھا لہٰذا کسی والد کے لئے اس کے بیٹے کے معاملہ میں نمونہ نہیں ہو سکتے وغیرہ وغیرہ۔ اس ایک مثال سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ معترضین کے ذہن میں کامل نمونہ کا جو مفہوم ہے وہ سراسر غلط ہے کامل نمونہ کا صرف وہی مفہوم درست ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

ہوا ہے مدعی کا فیصلہ اچھا مرے حق میں
زلیخا نے کیا خود پاک دامن ماہِ کنعاں کا

بعض اشخاص کامل نمونہ کے امکان کا انکار کر کے کہتے ہیں کہ کوئی انسان مکان وزمان کی قیود میں خدا کو کامل طور پر ظاہر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خدا ایک لامحدود ہستی ہے لیکن انسان ایک محدود ہستی ہے جو محدود زمانہ میں ایک مدت تک اپنی زندگی گزارتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اعتراض کی بنا غلط ہے۔ جب ہم لفظ "لامحدود" اطلاق خدا کی ذات پر کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں لیتے کہ خدا ایک ایسی ہستی ہے جو زمان و مکان میں نہیں آسکتا۔ اگر لامحدود سے یہ مراد ہو سکتی تب اعتراض صحیح ہو سکتا کہ کسی شئے کا کوئی جز کامل طور پر کل کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ لیکن خدا روح ہے اور زمان و مکان اور مادہ کی تمام قیود سے بلند و بالا ہے (یوحنا ۴: ۲۳۔ ۲۴)۔ پس خدا کی ذات میں جز اور کل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خدا کی لامحدودیت کا وہ مطلب ہی نہیں جو معترض کے خیال میں ہے چونکہ خدا روح ہے اور روح ان معنوں میں لامحدود کہتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گو وہ مکان وزمان کی قیود سے بلند و بالا ہے تاہم کی صفات یعنی محبت، پاکیزگی، رحم وغیرہ زمان و مکان کی قیود اور حدود میں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ اور رضائے الٰہی پر کامل طور پر چلنے والا انسان ان صفات الٰہی کو کامل طور پر اپنی محدود زندگی کے دائرے کے ذریعہ ظاہر کر سکتا ہے۔ اور مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ کلمۃ اللہ نے کماحقہ طور پر ذات الٰہی کو فی الحقیقت اپنی ذات کے ذریعہ دنیا جہان پر ظاہر کر دیا اور آپ نے فرمایا "جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ (یعنی پروردگار) کو دیکھا" (یوحنا ۱۴: ۹)۔

عصمتِ مسیح کا مفہوم

(۱)

اس بات میں کسی صحیح العقل شخص کو کلام نہیں کہ منجی عالمین کی آمد نے دنیا کی کایا کو پلٹ دیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر علت کا معلول ہوتا ہے اور جتنا عظیم واقعہ ہو اتنا ہی بڑا اور عالی قدر اس واقعہ کا سبب ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ واقعہ تو عظیم الشان ہو، لیکن اس کا سبب نہایت خفیف ہو۔ پس اگر دنیا کی کایا پلٹ گئی ہے تو ظاہر ہے کہ جس چیز نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے وہ شخصیت خود نہایت عظیم القدر اور بے نظیر ہو گی۔ جاہل سے جاہل شخص بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ جنابِ مسیح کی آمد نے دنیا کی تاریخ کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ یعنی دنیا کا وہ زمانہ جو قبل از مسیح گزرا اور دوسرا وہ زمانہ جو آپ کی بعثت (رسالت) کے بعد آیا۔ ہر شخص جو دنیا کی اخلاقیات سے واقف ہے جانتا ہے کہ کلمۃ اللہ کی شخصیت نے

اخلاقیات میں ایک ایسی عظیم اور زبردست تبدیلی پیدا کر دی ہے جس کی نظیر روئے زمین کی کسی اور شخصیت میں نہیں ملتی اور جس کی وجہ سے دنیا کی تاریخ دو حصوں میں بٹ گئی۔ آپ کی تعلیم اور آپ کی زندگی سے نمونہ نے دنیا کے پہلے دور کو ختم کر دیا اور دوسرا دور آپ کے اصول آپ کی زندگی کے روح رواں تھے اور ان دونوں میں کوئی خلیج حائل نہ تھی۔ آپ کی زندگی آپ کے اصولوں کی زندہ مثال ہے (یوحنا۵:۳۶؛۱۰:۳۷)۔ پس دنیائے اخلاقیات کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے، کہ جس طرح آپ کی تعلیم بے نظیر ہے اسی طرح آپ کی شخصیت بے گناہ معصوم لاثانی اور یکتا ہے۔

(۲)

جب ہم زبردست اس شخصیت پر نظر کرتے ہیں کہ جس کا خاکہ اناجیلِ اربعہ میں پایا جاتا ہے تو ہم پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ آنخداوند ایک معصوم اور بے گناہ ہستی تھے۔ عصمتِ مسیح سے ہماری مراد یہ ہے کہ منجی عالمین "ساری باتوں میں ہماری طرح آزمائے گئے تاہم بے گناہ رہے" (عبرانیوں ۴:۱۵) آپ کی ذات "پاک" تھی اور آپ تمام عمر "بے ریا اور بے داغ" رہے۔ آپ گناہ گاروں کے رفیق تھے، لیکن ان کے ساتھ رفاقت رکھنے کے باوجود آپ ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرتے تھے جو "گناہ گاروں سے جدا" تھی (عبرانیوں ۷:۲۶)۔ ابن اللہ "گناہ سے واقف" نہ تھے (۲۔کرنتھیوں ۵:۲۱)۔ آپ کی "ذات میں گناہ نہیں تھا (۱۔یوحنا۳:۵)۔ آپ نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا" (۱۔پطرس ۲:۲۲)۔ اس حقیقت کا آپ کے دشمنوں اور جان لیواؤں تک کو اعتراف تھا (لوقا۲۳:۴)۔

(۳)

اگرچہ آپ مریم بتول کے بطن اطہر سے پیدا ہوئے، لیکن آپ کی معجزانہ پیدائش آپ کی عصمت اور بے گناہی کا باعث نہ تھی۔ بلکہ آپ فاعل خود مختار ہونے کی وجہ سے معصوم تھے۔ کلمۃ اللہ کا تجسم آپ کے معصوم ہونے کا باعث نہ تھا بلکہ آپ خود اپنی ذات کے معصوم ہونے کا باعث تھے۔ جیسا ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ آپ کے سامنے دیگر انسانوں کی طرح عالمِ طفولیت اور عالمِ شباب میں آزمائشیں آئیں۔ لیکن آپ ان پر غالب آکر "حکمت اور قد و قامت میں اور خدا کی اور انسان کی مقبولیت میں ترقی کرتے گئے" (لوقا۲:۵۲)۔

(۴)

جب ہم دیگر اولیا، اتقیا (تقی کی جمع: پرہیز گار لوگ) اور مقدسین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زندگیوں میں اور کلمۃ اللہ کی زندگی میں ایک عظیم اور حیرت انگیز فرق پاتے ہیں۔ دیگر صالحین اپنی نفس کشی کی خاطر اپنے بدنوں کو ہر قسم کا آزار (دکھ) دیتے ہیں اور اپنی خواہشات کو مغلوب کرنے کے لئے اور تزکیہ نفس کی خاطر ہر قسم کے وسائل اور آلات استعمال کرتے ہیں، تاکہ ان کو اپنے نفس پر فتح حاصل ہو سکے اور ان کی جسمانی خواہشات ان کے قابو میں آجائیں۔ لیکن کلمۃ اللہ کی زندگی میں ہم ان باتوں کو کہیں نہیں پاتے۔ آپ ہم کو ہمیشہ "خدا کی گود" میں نظر آتے ہیں۔ (یوحنا۱:۱۸) خدا کی حضوری ابن اللہ کے چاروں طرف خیمہ زن رہی۔ آپ کو خدا کی رفاقت کا ہر وقت احساس تھا۔ آپ کی تعلیم آپ کی زندگی کے افعال و کردار سے یہ عیاں ہے، کہ خدا نے ایک انسان کی زندگی کے ذریعہ اپنی ذات کو ہم پر منکشف کیا ہے۔ آپ کے ذریعہ ہم کو یہ علم حاصل ہو گیا ہے کہ خدا کس قسم کا خدا ہے کیونکہ "الویت کی ساری معموری اس میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے" (کلسیوں ۲:۹)۔ الوہیت کا کمال انسانیت کے کمال میں ظاہر ہے۔ الوہیت اور کامل انسانیت آنخداوند کی شخصیت میں یک جا نظر آتی ہیں۔ جب ہم آپ کی شخصیت پر ایک پہلو سے نظر کرتے ہیں تو ہم جان سکتے ہیں، کہ خدا کس کو کہتے ہیں؟ اور جب دوسرے پہلو سے نظر کرتے ہیں تو ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کامل انسان کس کو کہتے ہیں؟

جنابِ مسیح کی آزمائشیں

ابن اللہ (خداوند مسیح) اپنے کامل ایمان اور کامل فرمانبرداری کی وجہ سے ان تمام آزمائشوں پر غالب آئے جو وقتاً فوقتاً آپ کے سامنے آتی تھیں۔ انجیل مقدس کے متعدد مقامات میں ان آزمائشوں کا کنایۃً (اشارۃً) ذکر ہے (لوقا ۴:۱۳؛ ۱۲:۵۰؛ یوحنا ۱۲:۲۷؛ لوقا ۲۲:۲۸؛ عبرانیوں ۲:۱۸ وغیرہ)۔ لیکن وضاحت کے ساتھ تین آزمائیشوں کا ذکر کیا گیا ہے (متی ۴:۱۔۱۲)۔

(۱)

جب ہم ان آزمائشوں پر غور کرتے ہیں کہ تو پہلی بات جو ہم کو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان آزمائشوں کا جسمانی لذات، جنسی جذبات اور نفسانی خواہشات کے ساتھ (جن کو ہم عموماً گناہ سے تعبیر کرتے ہیں) کوئی تعلق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان آزمائشوں کو مختلف قسم کی آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کی آزمائش اس کے چال چلن خود خصلت اور کیرکٹر پر منحصر ہوتی ہے۔ ایک شخص کے سامنے چوری کرنے کی آزمائش آتی ہے، وہ اس قسم کی آزمائشوں پر غالب آتا ہے اور اس کی خصلت اس قسم کی ہو جاتی ہے کہ چوری کی خواہش اس کے لئے آزمائش نہیں رہتی۔ لیکن اب اسی شخص کے سامنے زناکاری کی آزمائش آتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور گر جاتا ہے۔ دوسرے شخص کے سامنے جھوٹ بولنے کی آزمائش آتی ہے اور وہ اس قسم کی آزمائشوں پر غالب آکر راست گفتار ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی اور قسم کی آزمائش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ابن اللہ اپنی جسمانی اور نفسانی خواہشوں پر غالب آچکے تھے اور آپ کی خصلت اس قسم کی بلند ہو چکی تھی کہ نفسانی خواہشوں کی آزمائشیں آپ کے سامنے اپنی طاقت کھو چکی تھیں۔ پس ابن اللہ کے لئے روحانی جنگ کا محاذ بدل چکا تھا۔ آپ کی آزمائشیں اندرونی عادات و حالات کی وجہ سے نہیں بلکہ بیرونی اور خارجی حالات کی وجہ سے آپ کے سامنے آتی ہیں، جن کا تعلق آپ کے اعجازی قواء، روحانی پیغام زندگی کے مقصد کے ساتھ ہے۔ جس کی خاطر باپ نے آپ کو دنیا میں بھیجا تھا۔

(۲)

پہلی آزمائش ایسی ہے جس میں دنیا کی نامور ہستیاں گر گئی ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی خداداد قابلیتوں کو اپنی ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر استعمال کیا۔ ابن اللہ کو یہ احساس تھا، کہ آپ میں اعجازی قوت ہے۔ پس آزمائش آتی ہے کہ اس اعجازی قوت کو اپنی ذاتی اغراض اور فوائد کی خاطر استعمال کر۔ یہ ایک ایسی آزمائش ہے جس نے تاریخ کے اوراق کو خونین (خون آلود) بنا دیا ہے۔ دیگر مذاہب کے نامور اشخاص نے اپنی ذاتی ہوس کو پورا کرنے کی خاطر ہزاروں انسانوں کو میدان جنگ میں قربان کر دیا ہے۔ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ جس زمانہ میں ابن اللہ کی بعثت ہوئی، وہ خاص طور پر خود غرضی کا زمانہ تھا۔ قیاصرہ روم سے لے کر ادنیٰ انسانوں تک لوگ اپنی ذاتی اغراض پر قومی اور ملکی مفاد کو بے دریغ قربان کر دیتے تھے۔ اہل یہود کے سردار کاہن اور صدوقی ہر بات میں ملی مفاد (قومی مفاد) کو اپنی ذاتی اغراض پر قربان کر دیتے تھے (یوحنا ۱۱:۴۸)۔ اس قسم کی فضا میں جنابِ مسیح خداوند نے پرورش پائی۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اس آزمائش کو ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ اس قسم کا لائحہ عمل خدا کی پاک مرضی کے خلاف ہے۔ ”آدمی صرف روٹی ہی سے نہیں بلکہ ہر بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے جیتا ہے“ (متی ۴:۴)۔ آپ نے شاگردوں کو فرمایا کہ ”دنیا کی اقوام اس قسم کی باتوں کی تلاش میں رہتی ہیں۔ تم پہلے خدا کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو“ (متی ۷:۲۲)۔ اس فیصلہ نے جنابِ مسیح کی مبارک زندگی کے مستقبل کو کلیتہً بدل دیا۔ آپ کے قبضہ میں اعجازی قوت تھی لیکن آپ نے اس کو ”قبضے میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی اور اپنے آپ کو پست کر دیا اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا

کی"(فلپیوں ۲:۶)۔ آپ نے صلیب جیسی ہولناک موت کو قبول کیا لیکن اس اعجازی قوت کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر استعمال نہ کیا (متی ۲۶:۵۲۔۵۳)۔ جس طور پر آپ نے اس اعجازی قوت کو استعمال کیا وہ بذاتِ خود اعجازی ہے اور ایک ایسا عظیم الشان معجزہ ہے جس کا ثانی روئے زمین کی تاریخ میں ہم کو نہیں ملتا۔

(۳)

پہلی آزمائش پر غالب آکر جنابِ مسیح نے فیصلہ کر لیا کہ آپ کی زندگی میں خودی کا اظہار نہیں ہوگا، بلکہ صرف خدا کی مرضی کا اظہار ہوگا۔ اب آزمائش آتی ہے کہ دنیا کس طرح معلوم کرے گی کہ ایسی زندگی جو تو نے اختیار کی ہے خدا کی طرف سے ہے؟ تو کوئی ایسا نشان دکھلا جو تیرے متعلق ہر طرح کی غلط فہمی کو دور کر دے اور دنیا تجھ کو فی الواقع مسیح موعود مان لے۔ تو ہیکل (بیت اللہ) کے کنگرے پر کھڑا ہو کر اپنی قوم کی آنکھوں کے سامنے اپنے آپ کو نیچے گرا دے کیونکہ لکھا ہے کہ "خدا تیری بابت اپنے فرشتوں کو حکم دے گا جو تجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر کی ٹھیس لگے (متی ۴:۶) ابن اللہ نے اس آزمائش کو بھی ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ حقیقی ایمان خدا پر بھروسہ رکھنے کا نام ہے۔ خدا کو ازارہِ تحکم کسی خاص بات کے لئے مجبور کرنا اور اس کی آزمائش کرنا در حقیقت اس کی محبت پر شک کرنا ہے۔ حقیقی ایماندار خدا کو یہ نہیں کہتا کہ جس طرح میں چاہتا ہوں میرے ذریعہ تو اپنی قدرت دکھلا۔ بلکہ وہ کامل طور پر بھروسا رکھ کر انتظار کی آنکھوں سے اس بات کی جانب ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہتا ہے کہ پردہِ غیب سے رضائے الٰہی کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ خیال نہیں کرتا کہ دنیا پر میرا اثر کس طرح قائم رہے گا بلکہ وہ ہر دلعزیزی کو پس پشت پھینک کر خدا کی مرضی پر عمل کرتا ہے۔ اَدیانِ عالم کی تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ دنیا کے بہترین انسان اس قسم کی آزمائش میں گرفتار ہو کر گر پڑے۔ لیکن ابن اللہ ایسی سخت آزمائش پر بھی غالب آئے۔

اس آزمائش کی طاقت کو وہ شخص خوب سمجھ سکتا ہے جو اہل یہود کے مجنونانہ جوش سے واقف ہے۔ اہل یہود جو قیصر روم کے مطیع تھے۔ یہ خیال کرتے تھے، کہ جب مسیح موعود آئے گا تو قوم اسرائیل کو رومی قیاصرہ کی غلامی سے رہائی دے کر ایک آزاد اور خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالے گا۔ جب جنابِ مسیح کی بعثت ہوئی تو اسرائیل میں ایسے سرفروشوں کی ایک پارٹی تھی جو "زیلوتیس" یعنی "غیور" یہود پر مشتمل تھی۔ اگر جنابِ مسیح اپنی قوم پر اپنا اثر قائم کرنا چاہتے تو شمالی کنعان اور گلیل کا صوبہ بغاوت اختیار کر لیتا۔ (اعمال ۵:۳۶۔۳۷) اور آپ پر جانیں نثار کرنے کو تیار ہو جاتا۔ آپ خود گلیلی تھے اور حضرت داؤد کی شاہی نسل سے تھے۔ آپ کی شہرت ابتدا ہی سے گلیل میں اس قدر پھیل گئی تھی کہ یروشلیم تک قوم کے سرداروں کو اطلاع ہو چکی تھی (لوقا ۵:۱۷)۔ اگر ابن اللہ ہر دلعزیز ہونا چاہتے اور عوام الناس پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا چاہتے، تو آپ کو ہر طرح کی آسانی مہیا تھی۔ لیکن آپ نے باپ (پروردگار) کی مرضی پر چلنا اپنا مقدم فرض سمجھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہی ہجوم جو آپ پر اپنی جانیں نثار کرنے کو تیار تھی (متی ۲۱:۸) اور آپ کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی (یوحنا ۶:۱۵) آپ کی دشمنِ جان ہو گئی (مرقس ۱۵:۱۱) کیونکہ آپ نے ان کے اشاروں اور ان کی مرضی پر چلنے کا نہیں بلکہ رضائے الٰہی پر چلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

(۴)

ایک اور آزمائش آتی ہے کہ تو نے اچھا کیا جو اپنی اعجازی قوت کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر استعمال نہیں کیا۔ تو صرف خدا کی بادشاہت کا قیام چاہتا ہے اور تو اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہونا چاہتا ہے۔ لیکن جو طریقہ تو استعمال کرنا چاہتا ہے وہ درست نہیں، کیونکہ تو چاہتا ہے کہ محبت، خدمت، ایثار اور قربانی کے ذریعہ یہ بادشاہت قائم ہو (متی ۱۶:۲۱؛ ۲۰:۲۸؛ یوحنا ۱۵:۱۳)۔ لیکن یہ طریقہ کبھی کارگر ثابت نہ ہوگا۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے بھلا کب مانتے ہیں؟ بہتر یہی ہے کہ تو دنیا کے سامنے اپنی اعجازی قوت اور طاقت کا مظاہرہ کر کے تو ان پر جبر کر اور تلوار کے

ذریعہ دنیا میں خدا کی بادشاہت کو قائم کردے۔ اہلِ یہود ایک خونین جنگجو مسیح اور فاتح کی آمد کے منتظر بھی ہیں۔ زیلوتیس پارٹی کے شریک تیرے شاگرد بھی ہیں (لوقا ۶: ۱۵) خدا تیری مدد کرے گا۔ کیونکہ لکھا ہے "اے پہلوان اپنی تلوار کو جو تیری حشمت اور بزرگواری ہے حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔ تیرا دہنا ہاتھ تجھے مہیب کام سکھلائے گا۔ تیرے تیر تیز ہیں لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے اور یوں سارے لوگ ابدالآباد خدا کی ستائش کریں گے (زبور ۴۵: ۳-۶)۔ لیکن کلمۃ اللہ اس سخت آزمائش پر بھی غالب آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسا خیال محبت کرنے والے خدا کی طرف سے نہیں بلکہ دنیاداروں کا ہے (متی ۱۶: ۲۳)۔ پس آپ فرماتے ہیں کہ میں صرف خدا اور اس کی رضا کو ہی اپنی نظروں کے سامنے رکھوں گا اور صرف اسی کو سجدہ کروں گا (متی ۴: ۱۰)۔ تلوار کا استعمال اور جبر و طاقت کا مظاہرہ شیطانی اوزار ہیں۔ میں ایسے وسائل کا ہرگز استعمال نہ کروں گا۔ اگر ایسی نوبت آئے کہ مجھے اپنی جان بھی فی سبیل اللہ خدا کی بادشاہت کے قیام کی خاطر دینی پڑے تو میں بخوشی خاطر منظور کروں گا۔ لیکن نیکی کو قائم کرنے کے لئے بدی کی طاقتوں کو ہرگز استعمال نہیں کروں گا اور ان کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہ کروں گا۔

ابن اللہ کے سامنے جو آزمائش آئی ہے، وہ دنیا کے مصلحین اور انبیائے کے سامنے بھی آئی۔ لیکن جس آزمائش پر منجی عالمین غالب آئے دیگر مصلحین اور انبیائے اس میں گر پڑے۔ جب ان ہادیانِ دین نے دیکھا کہ محبت اور صلح کے ساتھ ان کا پیغام نہیں مانا جاتا تو انہوں تلوار کے ذریعہ اپنے مذہب کے اصول کی اشاعت کی۔ جو شخص ان کے مذہب میں داخل نہ ہوا وہ تہ تیغ کر دیا گیا اور جو ایک دفعہ داخل ہو کر پھر مرتد ہو گیا وہ بے دریغ قتل کر دیا گیا۔ بظاہر یہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے، لیکن اس طریقہ کار نے ان کی زندگیوں کو داغدار اور ان کے مذاہب کے اصولوں کو کھوکھلا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے مشن میں درحقیقت کامیاب نہ ہوئے اور نہ ان کے مذاہب عالم گیر ہونے کے اور کل دنیا میں اشاعت پانے کے قابل رہے۔ یوں ان انبیاء اور مصلحین کی آمد کی علتِ غائی فوت ہو گئی۔

(۵)

کلمۃ اللہ نے تین سال تک اپنی اعجازی قوت کا استعمال بنی نوع انسان کی بہبودی کی خاطر کیا۔ جہاں آپ نے کسی اندھے، گونگے، بہرے، کوڑھی یا کسی قسم کے بیمار کو دیکھا آپ کی محبت جوش میں آئی اور وہ شفایاب ہو گئے۔ آپ نے بیوہ کے اکلوتے بیٹے جو اپنی ماں کے بڑھاپے کا آسرا تھا اور لعزر کو جو اپنی بہنوں کی روزی کا وسیلہ تھا، اپنی لازوال محبت کی وجہ سے مردوں میں سے زندہ کیا۔ آپ نے ہمیشہ اپنے خیال، قول اور فعل میں الٰہی محبت کا ظہور دکھلا دیا۔ جو تمام انسانوں کے لئے ایک نمونہ ہے (۱۔ پطرس ۲: ۲۱)۔ لیکن اعجازی قوت کا بے جا استعمال نہ کرنے کی وجہ سے آپ کی قوم اور قوم کے رؤسا اور علمائے دین آپ کی جان کے پیاسے ہو گئے اور آپ کے قتل کے درپے تھے (لوقا ۹: ۱۷؛ ۱۴: ۱ وغیرہ)۔ صلیب آپ کو سامنے دکھائی دیتی تھی (مرقس ۸: ۲۱) آپ کو اس بات کا علم تھا کہ آپ کے محبت کرنے والے آپ کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ آپ کا ایک حواری آپ کو پکڑوائے گا۔ آپ اس دنیا میں اکیلے بے یار و مددگار رہ جائیں گے (متی ۲۶: ۳۱؛ یوحنا ۱۳: ۲۱)۔ ایسے آڑے وقت میں یونانی کلمۃ اللہ کے پاس آئے (یوحنا ۱۲: ۲۱) کہتے ہیں کہ انہوں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ ہجرت کر کے کنعان چھوڑ کر ہمارے ہاں یونان میں آجائیں تاکہ صلیب جیسی خوفناک موت سے بچ جائے (یوحنا ۵: ۳۷)۔ جنابِ مسیح کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کے لئے یہ آزمائش بڑی زبردست آزمائش تھی۔ آپ نے فرمایا "میری جان گھبراتی ہے پس میں کیا کہوں؟ اے باپ (پروردگار) مجھے اس گھڑی سے بچا؟ لیکن میں اسی سبب سے تو اس گھڑی کو پہنچا ہوں۔ پس میں کہوں گا اے باپ اپنے نام کو جلال دے۔ وہ وقت آگیا ہے کہ ابنِ آدم جلال پائے (یوحنا ۱۲: ۲۷-۲۸)۔ یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ ہجرت کی آزمائش سخت آزمائش تھی۔ ایک طرف دردناک موت کھڑی تھی اور دوسری طرف آرام حفاظت اور عزت کی زندگی نظر آتی

تھی۔ لیکن آپ جانتے تھے کہ ''جب تک گیہوں کا دانہ زمین پر گر کے مر نہیں جاتا اکیلا رہتا ہے لیکن جب مر جاتا ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اسے کھو دیتا ہے او رجو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھے گا''(یوحنا۱۲:۲۴۔۲۵)۔جنابِ مسیح صلیب کو اذیت کی شکل میں نہیں دیکھتے بلکہ اس کو''جلال'' کا وسیلہ خیال فرماتے ہیں (یوحنا۱۲:۲۵؛۱۲:۱۶؛۷:۳۹)آپ نے صلیب کے نورانی اور جلالی پہلو کو دیکھا اور ہجرت کرنے سے انکار کر دیا۔ کلمۃ اللہ رضاے الٰہی کے یہاں تک فرمانبردار رہے کہ موت بلکہ صلیبی موت بھی گوارا کی(فلپیوں ۲:۸) یہاں نہ صرف فرمانبرداری ہے بلکہ ''خدا کے خیالوں'' کے ساتھ (متی ۱۶:۲۳) کامل تعاون ہے ،تاکہ خدا کی مرضی پوری ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے صلیب پر اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ '' پورا ہوا''(یوحنا۱۹:۳۰)۔

دیگر مذاہب کے نامور اشخاص کی زندگیوں میں بھی ایسے واقعات رونما ہوئے کہ لوگ ان کے پیغام کی وجہ سے ان کی جان کے پیاسے ہو گئے اور ان کے سامنے بھی ہجرت کرنے کی آزمائش آئی، لیکن جب موت ان کی نظروں کے سامنے آئی تو وہ اس آزمائش کا مقابلہ نہ کر سکے اور گر گئے۔ انہوں نے چند سالہ زندگی اور اپنے مستقبل کا خیال کیا۔ لیکن ابن اللہ کی مانند رضائے الٰہی کے جویاں نہ ہوئے۔

(۶)

انجیل نویسوں نے مذکورہ بالا آزمائشیں بطور مشتے نمونہ از خروارے (تھوڑے سے نمونے سے کل چیز کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے)بیان کی ہیں۔ انجیل جلیل سے یہ ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس کا کامل انحصار خدا پر ہے۔ آپ کی زندگی کا مرکز خودی نہ تھی بلکہ رضائے الٰہی تھی۔ آپ ہمیشہ ہر بات میں خدا کے فرمانبردار بیٹے تھے۔ آپ کا ہر قول اور فعل باپ کی مرضی کا ظہور تھا۔

آپ کی خدا سے ہمیشہ یہی دعا تھی ''میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو''(لوقا۲۲:۴۲)۔ خودی کا عنصر آپ کی زندگی میں مفقود ہے اور عالمِ خیال میں بھی آپ کبھی خدا سے جدا نہ ہوئے۔ آپ کی تمام زندگی میں ہم کو اس قسم کی جدائی نظر نہیں آتی۔ آپ نے فرمایا''میں اکیلا نہیں بلکہ میں ہوں اور باپ جس نے مجھے بھیجا ہے۔ نہ تم مجھ کو جانتے ہو نہ میرے باپ کو۔ اگر مجھے جانتے تو میرے باپ کو بھی جانتے''(یوحنا ۸:۱۶۔۱۹؛۱۶:۳۲)۔

(۷)

مذکورہ بالا آزمائشوں سے ناظرین پر ظاہر ہوا ہو گا، کہ حضرت کلمۃ اللہ اپنی خارق (کرامت) عادت پیدائش کی وجہ سے بے گناہ نہ تھے ۔آپ کی ''بے گناہی'' سے یہ مراد نہیں کہ آپ گناہ کر ہی نہیں سکتے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گو دیگر انسانوں کی طرح آپ میں بھی گناہ کرنے کی اہلیت موجود تھی، لیکن اس اہلیت کے باوجود آپ بے داغ رہے۔ آپ کی کاملیت کسی بھی خواہ ہم آپ کی زندگی کو کسی زاویہ سے بھی دیکھیں ہم پر یہ عیاں ہو جائے گا، کہ جن نامساعد (غیر معاون) حالات میں بھی آپ گزرے۔ بعینہ جب ان حالات میں دنیا کو اور مذاہب عالم کی ہستیاں گزریں تو وہ داغ دار ہو گئیں۔ لیکن آپ تاریخ میں واحد انسان ہیں جو کسی حالت میں بھی داغ دار نہ ہوئے اور ہمیشہ بے داغ رہے۔

یہ درست ہے کہ کوئی انسان اپنی محدود زندگی میں ہر ممکن آزمائش میں سے نہیں گزر سکتا۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ جب ہم کسی شخص کو مثلاً دیانت دار کہتے ہیں تو ہمارا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس کے سامنے ہر قسم کی بددیانتی کی آزمائش پیش آئی تھیں پر وہ ان پر غالب ہو کر دیانت دار رہا۔ بلکہ ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کی زندگی میں ایسے حالات پیش آئے تھے، جن میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ آزمائش میں گر کر بددیانت ہو جائے گا۔ لیکن وہ دیانت دار ثابت ہوا۔ پس ہم اس کو دیانت دار کہتے ہیں۔ اسی طرح جب انجیل ہم کو بتاتی ہے کہ حضرت ابن اللہ سب

باتوں میں ہماری طرح آزمائے گئے تو بھی بے گناہ رہے (عبرانیوں ۴:۱۵)۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شیطان نے آپ پر بہتری قسم کے حملے بار بار کئے۔ لیکن وہ ہر قسم کے حملے میں شکست کھاتا رہا اور حضرت روح اللہ فاتح اور بے داغ رہے۔ ابلیس نے ہر ممکن کوشش کی کہ ابن اللہ اس کی زد میں آجائیں اور وہ آپ پر کوئی فاتح ضرب لگا سکے۔ لیکن وہ ہر دفعہ ناکام و نامرادی رہا۔ آنخداوند کی تمام زندگی میں اس کی ضربوں کے کہیں نشان نظر نہیں آتے۔ ہر آزمائش پر غالب آکر ابن اللہ کی زندگی روحانیت کی بلند ترین چوٹیوں پر پہنچ چکی ہیں۔ جن کو دیکھ کر انسان کی نظر وغیرہ اور چکا چوند ہو جاتی ہے۔

در تو باجتا رو نظر کئے تواں رسید

صد شبہ در ہست قیاس ودلیل را (نظیری)

چنانچہ خداوند نے خود فرمایا ہے "جو اوپر سے آتا ہے وہ سب سے اوپر ہے۔ جو زمیں سے ہے وہ زمیں ہی سے ہے اور زمیں ہی کی کہتا ہے"۔ تم نیچے کے ہو میں اوپر کا ہوں۔ تم دنیا کے ہو میں دنیا کا نہیں ہوں اسی لئے میں نے تم سے کہا ہے کہ تم اپنے گناہوں میں مرو گے" (یوحنا۳:۳۱؛۸:۲۲۔۲۴)۔ آپ نے تمام عمر گنہگار مردوں اور عورتوں کے درمیان گزاری۔ لیکن گناہ کی آلائش نے آپ کے دامن کو بھی تر تر نہ کیا۔ آپ ان گنہگاروں کو بے بانگ وہل دعوت دیتے رہے کہ "ابن آدم" کھوئے ہوئے گنہگاروں کو ڈھونڈنے اور نجات دینے آیا ہے۔ اے محنت اٹھانے والو اور شیطان سے ہزیمت (شکست کھانا) خوردہ لوگو اور گناہ کے بوجھ سے دبے ہوئے لوگو، تم سب میرے پاس آو میں تم کو اطمینان قلب عطا کروں گا اور بخشوں گا کہ ابن آدم کو گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بلانے آیا ہوں (متی ۱۱:۲۸؛لوقا۱۹:۱۰؛مرقس ۲:۱۷) گزشتہ وہ دو ہزار سال سے ہر اقلیم وملک و نسل اور زمانہ کے گنہگار منجی عالمین کے پاس آتے رہے ہیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کر کے اور قربت الٰہی پاکر نئی زندگیاں بسر کر کے کلمۃ اللہ کے ان دعووں کی تصدیق کرتے چلے آئے ہیں۔

غیر مسیحی آپ کی الوہیت کے منکر ہوں تو ہوں لیکن کسی کی یہ مجال نہ ہوئی کہ آپ کی روحانیت کا اوج انسانیت کی اونچائی اور گہرائی کا پتہ دیتا ہے۔ انسان کی حیرت زدہ عقل چکرا جاتی ہے جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ انسانیت کا اوج کمال اکتسابی تھا۔ ابن اللہ دکھ اٹھا کر اور آزمائشوں پر غالب آکر کمال ہوئے اور ہماری نجات کے بانی بنے۔ آپ کی زندگی میں ایک طرف انسانیت کا کمال پایا جاتا ہے اور دوسری طرف الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ کامل انسان تھے۔ آپ میں الوہیت کی ساری معموری سکونت کرتی ہے (کلسیوں ۲:۹)۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

(۱)

سطور بالا میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ حضرت کلمۃ اللہ اپنی خارق عادت پیدائش کی وجہ سے بے گناہ اور معصوم نہ تھے اور کہ آپ کی معصومیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ گناہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کے برعکس آپ دیگر انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ لیکن آپ نے گناہ کی اہلیت رکھنے کے باوجود کبھی گناہ نہ کیا۔

(۲)

ہم اس حقیقت کو بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت کلمۃ اللہ کی معصومیت ابوالبشر آدم کی سی نہ تھی۔ آدم باغ عدن میں پہلے پہل بے گناہ تھے۔ لیکن تب بھی کامل نہ تھے۔ کیونکہ آپ کے سامنے کوئی آزمائش نہ آئی تھی۔ لیکن شیطان نے ان کو آزمایا تو وہ پہلی آزمائش نہ تھی۔ مقابلہ کی

تاب نہ لا سکا اور گر گیا۔ لیکن منجی عالمین نے شیطان کو کچل کر (پیدائش ۳:۱۵) اور یوں کامل بن کر اپنے تمام فرمانبردار لوگوں کے لئے ابدی نجات کا باعث ہوا (عبرانیوں ۵:۱۰) ابن اللہ کی اس قدوس زندگی کی وجہ سے مقدس پولس حضرت ابن اللہ کو "آدم ثانی" کا نام دیتا ہے۔

(۳)

ہم نے سطور بالا میں لکھا ہے کہ خداوند مسیح میں ایک طرف انسانیت کا معراج پایا جاتا ہے اور دوسری طرف "الوہیت کی ساری معموری آپ میں سکونت کرتی تھی۔ اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے، کہ خداوند مسیح انسانی قدوسیت کا درجہ کرنے کی وجہ سے الوہیت کے درجہ پر نہیں پہنچے تھے بلکہ وہ دنیا میں آنے سے پہلے الوہیت کا درجہ رکھتے تھے (عبرانیوں ۱:۲۔۴؛۵:۹؛۱۰:۵۔۷) اور بالفاظ مقدس پولوس آپ نے اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ اس نے انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا اور فرمانبردار رہا (فلپیوں ۲:۷)۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہوں" (یوحنا ۵:۳۰)۔ "میں باپ سے محبت رکھتا ہوں اور جس طرح باپ نے مجھے حکم دیا ہے میں ویسا ہی کرتا ہوں" (یوحنا ۱۴:۳۴؛۱۲:۴۹)

رضائے حق اور رضائے حق قضائے او قضائے حق

دلش ازماسوائے حق گزیدہ عزلت عنقا

ابن اللہ کی قدوسیت کا سرچشمہ "قدوس باپ" تھا۔ انجیل جلیل میں یہ تعلیم نہیں دیتا کہ کوئی انسان ضعیف البنیان اخلاقی کاملیت کا درجہ کفر ہے اور کلیسیائے جامع نے بھی ہمیشہ ایسے خیالات کو کفر، بدعت قرار دے کر رد کر دیا۔ ابن اللہ نہ تو خدا ہونے کی وجہ کامل انسان تھے اور نہ کامل انسان ہونے کی وجہ سے خدا تھے۔ آپ کامل انسان تھے کیونکہ انسانیت کا کمال (جو الوہیت کی صورت پر تھا (پیدائش ۱:۲۷)۔ آپ کی قدوس ذات میں پایا۔ آپ کامل خدا تھے کیونکہ "ابتدا میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا تھا اور کلام مجسم ہوا" اور اس نے کامل انسانیت کا درجہ حاصل کیا اور سب خاص و عام نے اس کا جلال دیکھا جو ابن اللہ ہی کے شایاں ہو سکتا تھا (یوحنا ۱:۱۔۱۸)

(۴)

اس مقام پر ہم ناظرین پر یہ تاریخی حقیقت بھی آشکارا کر دینا چاہتے ہیں کہ معصوم بے گناہ انسان کا تصور نہ تو بت پرست یونانی رومی دنیا کا مذہبی یا فلسفیانہ کتب میں موجود تھا اور نہ ایسا تصور یہودی قوم کی کتب میں اور صحائف انبیا میں پایا جاتا تھا۔ اہل یہود کی کسی کتاب میں کسی نبی کو بے گناہ معصوم ہستی نہیں کہا گیا ہے اور نہ عصمت کو نبوت کا لازمی جزا مانا گیا ہے۔ وہ عصمت انبیا کے قائل ہی نہ تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی کسی بے گناہ انسان یا معصوم نبی کے وجود کا تصور نہ آتا تھا۔ وہ تمام انبیا کو دیگر انسانوں کی طرح خاطی اور گنہگار مانے چلے آئے تھے۔ کلمۃ اللہ کے ہم عصر یہود بھی کسی انسان ضعیف البنیان کو معصوم اور بے گناہ نہیں جانتے تھے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ میں پہلی دفعہ اہل یہود نے ایک ایسے انسان کو دیکھا جو ان کی طرح آزمایا گیا مگر بے گناہ تھا۔ کلمۃ اللہ کے رسولوں نے پہلی دفعہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک ایسے عجوبہ روزگار کا ذکر کیا جو گناہ سے واقف نہ تھا۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوران حالانکہ نہ یونانی رومی دنیا اور نہ اہل یہود ایک بے گناہ انسان کے وجود کے قابل عمل تھے۔ تو اناجیل اربعہ کے مصنفوں اور دیگر انجیلی تحریرات کے لکھنے والوں کو ایسے معصوم اور انسان کامل نہ تھے تو آپ کے تبعین کو ایسے شخص کی ہستی اور وجود کا پتہ کیسے لگا؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، کہ انجیلی تحریرت کے لکھنے والوں کو ایک حقیقی زندگی تو تاریخی معصوم اور کامل ہستی کا ذاتی تجربہ تھا۔ جس کو انہوں نے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا اور اپنے ہاتھوں سے چھوا۔ (یوحنا ۱:۱؛اعمال ۴:۲۰؛یوحنا ۱۹:۴۵؛۱:۱۴؛۲۰:۲۷؛۱۔یوحنا ۴:۱۴؛لوقا ۲۲:۸؛وغیرہ)۔

اور جو ابن اللہ کی آزمائشوں میں برابر آپ کے ساتھ رہے (لوقا ۲۲: ۸؛ عبرانیوں ۲: ۱۸؛ ۴: ۱۵ وغیرہ) اور وہ خوب دیکھ بھال کر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ابن اللہ اس لئے ظاہر ہوا تھا کہ وہ گناہوں کو دور کرے۔ اس کی ذات میں گناہ نہ تھا جو کوئی اس کی مانند ہونے کی امید رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو ایسا ہی پاک کرتا ہے جیسا وہ پاک ہے (۱۔ یوحنا ۳: ۳۔ ۵)۔ مقدس پطرس آپ کی روحانی عظمت اور عصمت کی شہادت دیتا ہے (۱۔ پطرس ۲: ۲۱۔ ۲۲) اور کہتا ہے "اگر تم نیکی کر کے دکھ پاتے اور صبر کرتے ہو تو یہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اور تم اسی لئے بلائے گئے ہو کیونکہ مسیح بھی تمہارے واسطے دکھ اٹھا کر تم کو ایک نمونہ دے گیا ہے تاکہ اس کے نقش قدم پر چلو۔ نہ اس نے کبھی گناہ کیا نہ اس کے منہ سے کبھی مکر کی کوئی بات نکلی۔ نہ وہ گالیاں کھا کر گالی دیتا تھا اور نہ دکھ پا کر کسی کو دھمکاتا تھا۔ بلکہ اپنے آپ کو سچے انصاف کرنے والے کے سپرد کرتا تھا (۱۔ پطرس ۲: ۱۹۔ ۲۵)۔

عبرانیوں کے خط کا مصنف بھی لکھتا ہے کہ وہ "پاک بے ریا۔ بے داغ اور گنہگاروں سے جدا تھا (عبرانیوں ۷: ۲۶)۔ ہم مذکورہ بالا اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ جن کا ایک ایک لفظ اس بات کا شاہد ہے کہ لکھنے والے ایک ایسی بلند اور ارفع روحانی ہستی کا ذکر کرتے ہیں جس کا ان کو ذاتی تجربہ حاصل تھا۔ انہوں نے خود اس حقیقت کا مشاہدہ کیا تھا کہ ابن اللہ کی زندگی خدا کی فرمانبرداری کے کمال کا نمونہ ہے۔ آپ کی زندگی کا لائحہ عمل اسی فرمانبرداری پر ہی مبنی تھا۔ آپ کے تصورات جذبات اور افعال اسی فرمانبرداری کا نتیجہ تھے۔ یہی ایک اصول آپ کے اقوال و افعال اور تمام زندگی پر حاوی تھا۔ آپ کی شخصیت میں کوئی شے نہ تھی جو اس انحصار کا نتیجہ نہ تھی۔ آپ کا کوئی خیال یا قول و فعل ایسا نہ تھا، جو خدا سے الگ ہو کر عمل میں آیا ہو (یوحنا ۵: ۷)۔ آپ نے فرمایا "میں تم سے اصلی اور حقیقی بات کہتا ہوں کہ بیٹا آپ سے کچھ نہیں کر سکتا سوا اس کے جو باپ کو کرتے دیکھتا ہے۔ کیونکہ جن کاموں کو وہ کرتا ہے ان کو بیٹا بھی اسی طرح کرتا ہے (یوحنا ۵: ۱۹)۔ اگرچہ آپ نے فضا میں صبر کر جہاں یہ ہمیشہ ایسی آزمائشوں پر غالب آئے اور منشائے الٰہی میں تصادم واقع موجد کے لیکن آپ ہمیشہ ایسی آزمائشوں پر غالب آئے اور رضائے الٰہی کے جویاں رہے۔ جس کا نتیجہ یہ کہ آپ کے ارادے میں اور رضائے الٰہی میں کبھی تا زیست تصادم واقع نہ ہوا اور آپ انسان کامل بنے۔

ابن اللہ (جنابِ مسیح) کی عصمت

(۱)

انجیل جلیل کا مطالعہ ہم پر ظاہر کر دیتا ہے کہ کلمۃ اللہ خلوت کی زندگی بسر نہیں کرتے تھے۔ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ لوگوں کی نظروں کے سامنے گزرتا تھا (یوحنا ۱۸: ۲۰؛ متی ۱۵: ۳۲؛ مرقس ۵: ۳۱؛ لوقا ۱۲: ۱)۔ آپ کے حوارئین شب و روز آپ کی رفاقت میں رہتے تھے (متی ۱۷: ۱) ان کے باہمی تعلقات ایسے تھے جس طرح ایک خاندان کے شرکاء کے تعلقات ہوتے ہیں (یوحنا ۱۵: ۱۲؛ لوقا ۲۲: ۱۴ وغیرہ)۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جو روزمرہ کے مشاہدہ میں آتی ہے کہ جو اشخاص ایک دوسرے کے ساتھ شب روز نشست و برخاست رکھیں وہ ایک دوسرے کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ آپ کے حواری آپ کی "آزمائشوں میں برابر کے آپ کے ساتھ رہے" (لوقا ۲۲: ۲۸) وہ آپ کی رفتار و گفتار، مذاق طبعیت، اندازِ گفتگو، طرز زندگی، طریق رہائش، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے رونے غرضیکہ آپ کی زندگی کی ایک ایک ادا سے بخوبی واقف تھے (۱۔ یوحنا ۱: ۱)۔ لیکن حیرت کی یہ بات ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے آپ کی خصلت کو "غور سے دیکھا" وہی آپ کی تعریف میں رطب اللسان (مدح) ہیں اور بے اختیار کہتے ہیں کہ "اس کی ذات میں گناہ نہ تھا" (۱۔ یوحنا ۳: ۵)۔ وہ اس کو بے گناہ اور کامل سمجھتے ہیں اور بے تامل کہتے ہیں کہ "ویسا ہی مزاج رکھو جیسا خداوند یسوع مسیح کا تھا" (فلپیوں ۲: ۵)۔ "مسیح تم کو ایک نمونہ دے گیا ہے تاکہ اس کے نقش

قدم پر چلو۔ نہ اس نے گناہ کیا اور نہ اس کے منہ سے کوئی مکر کی بات نکلی۔ نہ وہ گالیاں کھا کر گالی دیتا تھا اور نہ دکھ پاکر کسی کو دھمکاتا تھا"(۱۔پطرس ۲:۲۱)۔"ہمارا ایسا سردار کاہن (یعنی امامِ اعظم) نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد نہ ہو سکے بلکہ ساری باتوں میں وہ ہماری طرح آزمایا گیا تاہم بے گناہ رہا"(عبرانیوں ۴:۱۵)"ہمارا سردار کاہن پاک، بے ریا اور بے داغ گناہ گاروں سے جدا اور آسمانوں سے بلند تھا"(عبرانیوں ۷:۲۶)"صرف خداوند ہی قدوس ہے اور ساری قومیں آکر اس کے سامنے سجدہ کریں گی"(مکاشفہ ۱۵:۴)"ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال (یوحنا ۱:۱۴) وہ خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش ہے"(عبرانیوں ۱:۳)۔

(۲)

حوارئین کا کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی ابتدا ہی سے اپنے منجی اور آقا کو بے گناہ مانتے تھے۔ انجیل کے تمام مصنفین میں سب سے زیادہ مقدس پولوس گناہ کی عالم گیری اور اس کے خوفناک نتائج اور نجات کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں۔ لیکن وہ کسی جگہ بھی جنابِ مسیح کی عصمت اور بے گناہی کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ عصمت مسیح کا تصور دوازدہ رسولوں کی اولین تقریروں کا جزو لاینفک تھا۔ جس کا مفصل ذکر ہم اپنی کتاب "قدامت اصلیت اناجیل اربعہ کی پہلی جلد میں کر چکے ہیں۔ پس یہ عقیدہ ایسا تھا جو پولوس رسول کے مسیحی ہونے سے پہلے کلیسیا میں موجود اور مروج تھا۔ تمام مسیحی شروع سے اس بات پر متفق ہیں۔ خواہ وہ اہل یہود میں سے تھے یا غیر یہود سے مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوئے تھے۔ پس پولوس رسول کی تحریرات اس کے زمانہ کے عقائد کا آئینہ ہیں۔ جس میں ہم کو ان لوگوں کے خیالات نظر آتے ہیں۔ جو منجی عالمین کے حوارینؑ اور تابعین تھے (۱۔کرنتھیوں ۳:۱۵)۔ چنانچہ حضرت پولوس فرماتے ہیں کہ ابن اللہ میں "الوہیت کی ساری معموری مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے"(کلسیوں ۲:۹)۔"وہ غیر مرئی خدا کی صورت ہے"(کلسیوں ۱:۱۵)۔وہ گناہ سے واقف نہ تھا (۲۔کرنتھیوں ۴:۴)"مسیح نے اپنی خوشی نہ کی"(رومیوں ۱۵:۳) رسول مقبول آپ کی کامل فرمانبرداری کا بار بار ذکر کرتا ہے (رومیوں ۵:۱۹؛۲۔کرنتھیوں ۱۰:۶ وغیرہ) اور کہتا ہے کہ "ویسا ہی مزاج رکھو جیسا یسوع مسیح کا تھا۔ اس نے اگرچہ خدا کی صورت پر تھا خدا کے برابر ہونے کو غنیمت خیال نہ کیا بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا۔ اس نے انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت بھی گوارا کی۔ اسی واسطے خدا نے بھی اسے بہت سربلند کیا اور اسے وہ نام بخشا جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے، تاکہ مسیح کے نام پر ایک گھٹنا ٹکے خواہ آسمانیوں کا ہو خواہ زمینیوں کا خواہ ان کا جو زمین کے نیچے ہیں اور خدا باپ کے جلال کے لئے ہر ایک زبان اقرار کرے کہ خداوند یسوع مسیح خداوند ہے"(فلپیوں ۲:۵۔۱۱)۔

(۳)

ابن اللہ کی عصمت کے قائل صرف آپ کے حوارئین اور تابعین ہی نہ تھے بلکہ آپ کے معاصرین اور مخالفین تک آپ کی بے گناہی کا اقرار کرتے تھے۔ جس غدار شاگرد نے آپ کو پکڑوادیا وہ اپنی موت اور خون سے اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ آپ "بے قصور تھے (متی ۲۷:۴)۔ جس شاگرد نے آپ کا انکار کیا وہ آپ کی پاکیزہ زندگی کے آئینہ میں اپنے گناہوں کو دیکھ کر اقرار کر کے کہتا ہے "اے خداوند میں گناہ گار انسان ہوں"(لوقا ۵:۸) مصلوب ڈاکو تائب ہو کر اقرار کرتا ہے کہ "اس نے کوئی بے جا کام نہیں کیا" اور گو وہ منجی عالمین کو مصلوب اور بظاہر مغلوب اور مفتوح دیکھتا ہے تاہم صلیب پر اس کو آپ کی محبت بھری زندگی یاد آتی ہے۔ اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا اور وہ یہ منت کہتا ہے "اے یسوع جب آپ اپنی بادشاہت میں آئے تو مجھے یاد کرنا"(لوقا ۲۳:۴۱) جب رومی صوبہ دار (جس کو بیسوں گنہگار مصلوبوں کا تجربہ تھا) نے جو صلیب کے پاس نگہبان کھڑا تھا دیکھا کہ منجی کونین دم واپسین اپنے خون کے پیاسوں کے لئے دعا مانگ رہے ہیں تو "اس کو یوں دم دیتے ہوئے دیکھ

کر کہا بیشک یہ خدا کا بیٹا تھا" (مرقس ۱۵: ۳۹) آپ کے دشمن جان جورو سائے قوم تھے آپ کی راستبازی کے قائل تھے۔ وہ آپ کی اعلیٰ زندگی کا اقبال طعنہ کی شکل میں کیا کرتے ہیں اور مصلوب کرکے آپ کو کہتے ہیں کہ "اس نے اوروں کو بچایا تھا۔اس نے خدا پر بھروسہ رکھا تھا" (متی ۲۷: ۴۳) آپ کے خون کے پیاسے اقرار کرکے کہتے ہیں کہ "اے استاد ہم جانتے ہیں کہ آپ سچے ہیں اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتے ہیں اور کسی کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ آپ کسی آدمی کے طرفدار نہیں ہے" (متی ۲۲: ۱۶)۔ آپ نے ان جانی دشمنوں کو للکار کر چیلنج دیا تھا کہ "تم میں سے کون مجھ پر گناہ ثابت کر سکتا ہے"؟ (یوحنا ۲۲: ۴۶) لیکن گناہ یا خطا ثابت کرنے کی بجائے وہ "صم بکم" (بہرے گونگے ہو کر) کھڑے رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "آپ سچے ہیں" (متی ۲۲: ۱۶) تو آپ پھر سوال کرتے ہیں کہ "اگر میں سچ بولتا ہوں تو میرا یقین کیوں نہیں کرتے" (یوحنا ۸: ۴۶)۔ پلاطوس مجسٹریٹ ہے۔ وہ مقدمہ کی مثل کو دیکھ کر کلمتہ اللہ کو "راستباز" قرار دیتا ہے (متی ۲۷: ۲۴؛ لوقا ۲۳: ۲۲) اور کہتا ہے کہ "میں اس میں کچھ جرم نہیں پاتا ہے" (یوحنا ۱۹: ۶) اس مجسٹریٹ کی بیوی بھی مصداق "آواز ہ (ناموار ی) خلق کو نقارہ خدا سمجھو" لوگوں سے آپ کی عصمت کا حال سن کر آپ کو "راستباز" کہتی ہے (متی ۲۷: ۱۹)۔

(۴)

نہ صرف جنابِ مسیح کے حوارئین اور مخالفین آپ کی عصمت کے قائل ہیں آپ کے معاصرین بھی آپ کی بے گناہی کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت یوحنا بپتسمہ دینے والا آپ کا نزدیکی رشتہ دار تھا اور بچپن سے آپ سے واقف تھا۔ وہ کھلے بندوں ہر ایک شخص پر اس کے گناہ جتلا دیتا تھا (متی ۳: ۷) اور اس بات کو ایک فرض سمجھ کر بادشاہ تک کو ملامت کرتا تھا۔ لیکن ایسا بے باک شخص جو نبی سے بڑا ہے (متی ۱۱: ۹) آپ کی اعلیٰ روحانیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرکے کہتا ہے "میں آپ تجھ سے بپتسمہ لینے کا محتاج ہوں اور تو میرے پاس آیا ہے"۔ "میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں" (متی ۳: ۱۴؛ لوقا ۳: ۱۶؛ یوحنا ۳: ۱۵، ۲۷؛ ۳: ۳۰۔ ۳۱) آپ کے وقت کی گناہ گار عورتیں اور مرد آپ کی عصمت کا اقرار کرتے ہیں اور آپ سے مغفرت حاصل کرکے راستباز ٹھہرتے (مرقس ۲: ۵؛ لوقا ۷: ۴۸؛ ۸: ۴۸ وغیرہ)۔

شیاطین آپ کی عصمت کا اقرار کرتے ہیں (مرقس ۱: ۲۴؛ لوقا ۴: ۳۴)۔ آپ جس جگہ بھی جاتے تھے شیطانی طاقتیں زائل ہو جاتی تھیں۔ آسمان کے فرشتے تک آپ کی عصمت پر گواہ ہیں (لوقا ۱: ۳۵) ۔خود اللہ تعالیٰ آپ کی عصمت کی گواہی دیتا ہے (مرقس ۱: ۱۱؛ ۹: ۷؛ یوحنا ۱۲: ۲۸ وغیرہ)۔

(۵)

ابن اللہ اپنی بے گناہی کے لئے چاروں عالم میں مشہور ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی موت اور ظفریاب قیامت کے پانچ سو سال بعد صحرائے عرب سے رسولِ عربی نے پکار کر آپ کی عصمت کا اقرار کیا۔ قرآن آپ کی عصمت پر شاہد ہے اور اقرار کرتا ہے کہ اللہ نے آپ کو شیطانِ مردود سے اپنی پناہ میں رکھا (سورہ آل عمران آیت ۳۱ ع ۴)۔ تمام قرآن کو چھان مارو سوائے کلمتہ اللہ کے تم کو کوئی دوسری معصوم ہستی نہیں ملے گی۔ قرآن میں اسلام کے باقی الوالعزم نبی یعنی حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت محمد اپنے اپنے گناہوں کا اقرار کرکے اللہ سے مغفرت کے طالب نظر آتے ہیں (ہود ۴۶؛ ابراہیم ۴۰۔ ۴۱؛ قصص ۱۶؛ مومن ۱۵ اعراف) لیکن کلمتہ اللہ کی طرف نہ صرف کوئی کبیرہ یا صغیرہ گناہ یا گناہ کا اقرار یا استغفار منسوب نہیں کیا۔ بلکہ استثنائی معصومیت کو صریح اور واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

مسلمانوں میں کلام اللہ کے بعد صحیح حدیث کا درجہ ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں رسولِ عربی کا قول ہے کہ

''کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر اس کو پیدا ہوتے وقت شیطان چھولیتا ہے۔ پس شیطان کے چھونے کی وجہ سے پیدائش کے وقت چیخ کر چلاتا ہے۔ مگر مریم اور اسکا بیٹا مسِ شیطان سے محفوظ رہے ہیں''

(مشارق الانوار صفحہ ۱۲۹)۔

یہ حدیث گویا قرآنی سورہ آل عمران کی مندرجہ بالا آیت کی تفسیر ہے اور اس پر صاد کرتی ہے۔ یہ حدیث صحیح میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ ہم کو حجتہ البالغہ میں بتلاتے ہیں کہ

''صحیحین کی بابت محدثین اس امر پر متفق ہیں کہ ان دونوں میں جو حدیث متصل مرفوع (وہ حدیث جس کے راویوں کا سلسلہ رسول اکرم تک پہنچے) ہے وہ قطعاً'' صحیح'' ہے

(جلد اول صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ مصر)

اب یہ حدیث مرفوع ہے اور اس کی سند متصل ہے یعنی اس کی بغیر کسی انقطاع کے خاص رسولِ عربی تک پہنچتی ہے لہٰذا یہ قطعاً صحیح ہے۔ قرآنی آیہ میں جس ''پناہ'' کا ذکر ہے اس میں نہ اغوا کا ذکر ہے نہ مس کا نہ وسوسہ کا۔ کیونکہ یہ سب باتیں جزوی ہیں۔ جو گناہ اور شیطان میں شامل ہیں۔ استعاذہ (یعنی پناہ) مطلق شیطان سے تھا جو اس قدر جامع اور مانع ہے کہ گناہ اور اس کی تمام شاخیں کٹ جاتی ہیں۔ کلمۃ اللہ قرآن اور حدیث کے مطابق حقیقی معنوں میں معصوم تھے۔ آپ کے وجود مبارک کے گرد رحمت الٰہی کا قلعہ بندھ گیا جس کی دیواریں شیطان لعین کے ہر حملہ کو روکنے والی تھیں (سورہ ۲۲:۵۱؛ ۱۴:۱۱؛ ۳۳:۴۔ ۶۶ وغیرہ)۔

پس کلمۃ اللہ کے حوارئین، تابعین، مرسلین، مخالفین، معاصرین، مدنبین، بلکہ شیاطین تک متفق آواز سے پکار کر کہتے ہیں کہ کلمۃ اللہ ایک بے گناہ اور معصوم ہستی ہیں۔ قرآن اور کتبِ احادیث بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔ آسمان سے ملائکہ اور خدا بھی اسی ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہر زمانہ، ملک اور قوم کے لوگ دیگر مذاہب کے بانیوں اور رسولوں کی عصمت کے متعلق اختلاف کرتے چلے آئے ہیں لیکن کلمۃ اللہ ایک واحد ہستی ہے جس کے بے گناہی اور عصمت پر ہر زمانہ، ملک اور قوم کا اتفاق ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ شمال اور جنوب، مشرق اور مغرب آسمان اور زمین کے باشندے اسی کے رطب اللسان ہیں۔

(۶)

کسی شخص نے کیا خوب کہا ہے کہ من آنم کہ من دانم۔ جب ہم اس اصول کی روشنی میں کلمۃ اللہ کی روحانی زندگی کو پرکھتے ہیں کہ تو ہم دیکھتے ہیں، کہ نہ صرف دیگر اشخاص جنابِ مسیح کو بے گناہ جانتے تھے بلکہ آپ کو خود یہ احساس تھا کہ آپ بے گناہ ہیں۔ آپ کے کلمات طیبات آپ کے اندرونی خیالات اور پنہانی جذبات کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ آپ خدا سے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوئے۔ آپ میں اور خدا میں مغائرت (ناموافقت، اجنبیت) نظر نہیں آتی۔ دیگر انبیاء کے سوانح حیات میں ہم کو ایک ایسا وقت نظر آتا ہے جب انہوں نے خدائے قدوس کا نظارہ پاکر اپنے گناہوں کو محسوس کیا۔ حضرت یسعیاہ نے کہا کہ ''ہائے مجھ پر میں ناپاک ہونٹ والا آدمی ہوں'' (یسعیاہ ۶:۵)۔ حضرت یرمیاہ نے کہا کہ ''مجھ پر واویلا۔ اے میری ماں کہ تو مجھے جنی'' (یرمیاہ ۱۵:۱۰)۔ حضرت داؤد نے اقرار کیا کہ ''میں اپنے گناہوں کو مان لیتا ہوں اور میری خطا ہمیشہ میرے سامنے ہے۔ میں نے تیرا ہی گناہ کیا ہے اور تیرے ہی حضور بدی کی ہے'' (زبور ۵۱:۳۔ ۴)۔ کنفوشیس جو چین کا نبی کا ہے کہتا ہے کہ ''مجھے اس بات کا غم ہے کہ میں نیکی پر عمل پیرا نہیں رہا ہوں۔ جو علم میں نے حاصل کیا ہے اس کی میں اپنی زندگی میں صحیح طور پر ترجمانی نہیں کر سکا۔ میں اس کو جو غلط راہ پر تھا صراطِ مستقیم پر نہ لا سکا۔ میں اپنے نیک خیالات کو نیک افعال میں تبدیل نہیں کر سکا''۔

رسولِ عربی کو قرآن میں بار بار حکم ہوا ہے کہ ''اے محمد تو اپنے گناہ کے لئے مغفرت مانگ''(سورہ محمد ۲۱؛مومن ۵۷؛نساء ۱۶۰ وغیرہ) چنانچہ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ نے ایک دفعہ اپنے صحابہ سے کہا'' خدا کی قسم میں ایک دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار اور توبہ کرتا ہوں''(تلخیص الصحاح جلد دوئم صفحہ ۲۱۸ بخاری جلد سوئم صفحہ ۱۶۵، مترجمہ مرزا حیرت)۔ لیکن جنابِ مسیح کی زندگی میں گناہوں کا اقرار یا گناہوں کی مغفرت کے لئے شکر گزاری کا نشان تک نہیں ملتا۔ آپ جانتے ہی نہ تھے کہ گناہ کی وجہ سے خدا اور انسان کے باہمی تعلقات کا ٹوٹنا کس شئے کو کہتے ہیں۔ ہم کو آپ کی رورحانی زندگی میں کسی قسم کے طوفان دکھائی نہیں دیتے۔ شیطان کے ساتھ جنگ کرنے میں آپ نے کبھی زخم نہ کھایا اناجیل اربعہ میں ایسے زخموں کا نشان تک ہم کو نظر نہیں آتا''شقِ صدر''کا سا کوئی واقعہ ہم کو آپ کے سوانح حیات میں نہیں ملتا۔ خدا نے دیگر انبیاء مثلاً رسولِ عربی کو''بھٹکتا پایا پھر راہِ ہدایت دکھائی''(سورہ ضحیٰ ۷)۔ لیکن کلمۃ اللہ کی زندگی میں کبھی ایسا موقعہ پیش نہ آیا جب آپ کے دل کی تبدیلی پیش آئی ہو یا آپ کی زندگی میں روحانی انقلاب واقع ہوا ہو اور آپ نے گناہ کو ترک کر کے خدا کی طرف رجوع کیا ہو۔ آپ کو خدا کے ساتھ گناہ کے بعد دوبارہ میل ملاپ کرنے کا شخصی اور ذاتی تجربہ کبھی نہ ہوا۔ دیگر انبیاء کی زندگی کی انتہائی منزل یہ تھی کہ ان کی زندگی میں منشائے الٰہی میں موافقت پیدا ہو جائے۔ لیکن کلمۃ اللہ کی زندگی کی یہ ابتدائی منزل تھی۔ آپ لوگوں کو توبہ کی دعوت دے کر فرماتے تھے''توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے(متی ۴:۱۷)۔ لیکن آپ نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہ کی کہ خدا کے سامنے گریہ وزاری، بے کسی، لاچاری اور توبہ کا اظہار کریں۔ آپ کے جذبات اور افعال سے ظاہر ہے کہ آپ کو یہ احساس تھا کہ آپ کو خود توبہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ آپ کو رفاقتِ الٰہی اور قربت خداوندی اس درجہ تک نصیب تھی کہ آپ ایسی باتیں فرماتے جو دوسرا انسان کفر کا ارتکاب کئے بغیر زبان پر نہیں لا سکتا (یوحنا ۸:۵۸؛۵:۲۰؛۸:۱۶؛۶:۴۵؛۸:۵۸؛۱۰:۱۵؛۱۴:۹۔۱۳ وغیرہ)۔ دیگر انسان اور نبی جانتے ہیں کہ اگر خدا ان کے گناہوں کو معاف نہ کرتا تو وہ کہیں کے نہیں رہتے اور وہ خدا کے رحم اور فضل کے لئے اس کا شکریہ کرتے ہیں(۱۔ تیمتھیس ۱:۱۶)۔ لیکن جنابِ مسیح کے منہ سے ہم اس قسم کی شکر گزاری کے الفاظ نہیں سنتے۔ ابن اللہ ہر وقت گناہ گاروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ گناہ گار مرد اور بدل چلن عورتیں ہر قسم کے شیطان خصلت انسان جو خدا سے سرکش ہو کر آوارہ بھٹکتے پھرتے تھے۔ آپ کے پاس آتے تھے۔ ایک صحیح حدیث میں لکھا ہے کہ لوگوں نے ایک دفعہ حضرت روح اللہ کو ایک بدچلن عورت کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا یا روح اللہ حضور ادھر کیسے گئے تھے''حضرت نے جواب دیا کہ طبیب مریضوں کے پاس جایا کرتے ہیں۔ انجیل میں آپ نے تعلیم دی کہ خدا محبت و فضل اور رحم کا خدا ہے۔ آپ تمام عمر گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی مغفرت دیتے رہے(مرقس ۴:۵ وغیرہ) آپ نے تمام عمر گراں مایہ ان کو خدا کی بادشاہت میں داخل کرنے میں صرف کر دی (لوقا ۱۵:۱۶)۔ آپ نے فرمایا کہ''میں گناہ گاروں کو بلانے آیا ہوں''(مرقس ۲:۱۷)۔ لیکن آپ نے کبھی اپنے آپ کو گناہ گاروں کے زمرہ میں شمار نہ کیا۔ آپ نے ہر قسم کے گناہ اور گناہ کے سرچشمہ کے خلاف اپنی صدائے احتجاج بلند کی (متی ۵ تا ۸ باب)۔ لیکن خود گناہ سے ناواقف رہے۔ آپ نے تمام عمر ان لوگوں کو جو''اپنے پر بھروسا رکھتے تھے کہ ہم راستباز ہیں''(لوقا ۱۸:۹؛متی ۹:۱۳) ملامت کا نشانہ بنایا لیکن آپ کو خود یہ احساس تھا کہ آپ حقیقی معنوں میں بے گناہ معصوم اور راستباز ہیں(یوحنا ۵:۲۱؛۵:۲۸) اور کوئی شخص انجیل جلیل کا مطالعہ کر کے آپ کے اس احساس کو قابل مذمت خیال نہیں کرتا اور نہ اس کو فریسیانہ ریاکاری اور بے جا فخر یا لاف و گراف پر محمول کرتا ہے۔

کلمۃ اللہ میں انسانیت کے کمال نے ظہور پکڑا۔ آپ کی کاملیت کا بھید یہ تھا کہ آپ اپنی مرضی نہیں بلکہ خدا کی مرضی پر چلنا چاہتے تھے۔ آپ میں''ناراستی''نہ تھی۔ کیونکہ اپنے ہر خیال و قول اور فعل میں آپ اپنے باپ کی عزت و جلال چاہتے تھے(یوحنا ۷:۱۷۔۱۸)۔ دیگر انبیاء کو یہ احساس تھا کہ جس کام کے لئے خدا نے ان کو بھیجا ہے وہ اس کے لائق نہیں(خروج ۳:۱۱؛یرمیاہ ۱:۶)۔ لیکن ابن اللہ کو اس قسم کا احساس کبھی نہ ہوا۔ اس کے برعکس آپ نے بار بار فرمایا''میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہوں''(یوحنا ۵:۳۰)۔''جس نے مجھے بھیجا

ہے وہ میرے ساتھ ہے اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اس کو پسند آتے ہیں" (یوحنا۸: ۴۸)۔ میں باپ کو جانتا ہوں اور اس کے کلام پر عمل کرتا ہوں" (یوحنا۴: ۳۴؛ ۱۹: ۵؛ ۶: ۳۸ وغیرہ)۔ "میں باپ سے محبت رکھتا ہوں اور جس طرح باپ نے مجھے حکم دیا میں ویسا ہی کرتا ہوں" (یوحنا۴: ۳۱؛ ۱۲: ۴۹)۔ مذکورہ بالا آیت سے ظاہر ہے کہ ابن اللہ اور باپ کی رضا میں کامل ہم آہنگی تھی۔ کلمۃ اللہ واپسیں بھی اپنی زندگی کو "ہرا درخت" کہتے ہیں (لوقا ۲۳: ۳۱)۔ یعنی راستباز جو اپنے وقت پر میوہ لاتا ہے جس کے پتے مرجھاتے نہیں اور اپنے ہر کام میں پھولتا پھلتا ہے (زبور ۱: ۴) آپ نے شاگردوں کو مخاطب کر کے فرمایا "دنیا کا سردار (یعنی شیطان) آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ حصہ نہیں" (یوحنا۱۴: ۳۰) یعنی گناہ گاروں کا سردار ابلیس جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ خداوند یسوع مسیح کو یہ احساس تھا کہ "میں دنیا کا نہیں" (یوحنا۱۷: ۱۶) اور فرماتے ہیں کہ "میں اوپر کا ہوں" (یوحنا۸: ۲۳) اور "آسمان سے اترا ہوں" نہ اس لئے کہ اپنی مرضی کے موافق عمل کروں بلکہ اس لئے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں" (یوحنا۶: ۳۸) آپ نے فرمایا کہ "میرا کھانا یہ ہے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں اور اس کا کام پورا کروں" (یوحنا۴: ۳۴)۔ جب آپ کے سامنے موت کھڑی تھی آپ نے تب بھی رضائے الٰہی کا خیال کیا اور دعا میں خدا سے کہا "جیسا میں چاہتا ہوں ویسا نہیں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو" (متی ۲۶: ۳۹) اور دم واپسین صلیب سے اعلان کیا کہ خدا کا مقصد آپ کی تعلیم، زندگی اور موت سے "پورا ہوا" (یوحنا۱۹: ۳۰)۔ خدائے قدوس میں اور آپ میں کسی قسم کی اخلاقی یا روحانی جدائی نہ تھی ۔اس کے برعکس دونوں میں کامل رفاقت تھی (۱۔ پطرس ۲: ۲۲؛ ۱۔ یوحنا۳: ۵) آپ کو یہ احساس تھا کہ آپ کے اصول زندگی اور موت غرضیکہ آپ کی زندگی کی ادنیٰ ترین تفصیل اور واقعہ رضائے الٰہی کا ظہور ہے۔ ہم کو نہ صرف آپ کی شعوری زندگی میں بلکہ آپ کی تحت الشعور زندگی میں بھی گناہ کا شائبہ نہیں ملتا۔ گو آپ گنہگاروں کی دنیا میں چلتے پھرتے تھے۔ لیکن آپ کی روح مثل آئینہ شفاف تھی۔ پس آپ نے حوارئین سے فرمایا "جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا" (یوحنا۱۴: ۹)۔ "جو مجھے دیکھتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو دیکھتا ہے" (یوحنا۱۲: ۴۵) "ابن آدم (خداوند یسوع مسیح) نے جلال پایا اور خدا نے اس میں جلال پایا" (یوحنا۱۳: ۳۱) میرے مخالفوں نے "مجھے اور میرے باپ دونوں کو دیکھا ہے اور دونوں سے عداوت رکھی ہے" (یوحنا۱۵: ۲۴)۔ "میں اپنے باپ میں ہوں" (یوحنا۱۴: ۲۰) باپ مجھے جانتا ہے اور میں باپ کو جانتا ہوں (یوحنا۱۰: ۲۴) "میں اور باپ ایک ہیں (یوحنا۱۰: ۳۰)۔ کیا اس قسم کے دعوے اور کلمے کسی ایسے شخص کے منہ سے نکل سکتے ہیں جس کو اپنے گناہ گار ہونے کا احساس ہو؟۔ یوحنا۱۷ باب کی دعا کے الفاظ ثابت کر دیتے ہیں کہ گناہ کا خیال بھی ابن اللہ کے نزدیک کبھی بھٹکا نہ تھا۔

چنانچہ جب جانکنی کا وقت نزدیک آیا تو آپ نے اپنی زندگی کی آخری شب میں دعا کے وقت خدا کو اپنی زندگی کا حساب ان الفاظ میں دیا "اے باپ وہ گھڑی آپہنچی، میں تیرے پاس آتا ہوں، میں نے تیرا کلام ان کو پہنچا دیا ہے۔ جو کام تو نے مجھے کرنے کو دیا تھا اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر میں نے زمین پر تیرا جلال ظاہر کیا ہے (یوحنا۱۷ باب)۔ اس کے بعد آپ نے اس آخری شب میں دوسرے لوگوں کی نجات، مغفرت اور حفاظت کے لئے دعا مانگی لیکن اپنی نجات اور مغفرت کے لئے ایک لفظ بھی آپ کے منہ سے نہ نکلا۔ جب آپ مصلوب کر دئے گئے آپ نے پکار کر اعلان فرمایا کہ آپ نے سب کچھ پورا کر دیا۔ اپنے آخری لمحوں میں آپ کو یقین تھا کہ آپ باپ کے پاس جا رہے ہیں (یوحنا۱۷: ۱۱) اور آپ کی جگہ فردوس ہے (لوقا ۲۳: ۴۳)۔

بفرضِ محال اگر ایسے کلمات انسانوں کے سامنے نکل بھی سکیں لیکن خدا کے سامنے جو ہر انسان کے اندرونی جذبات اور دل کے پنہانی رازوں سے واقف ہے (زبور ۴۴: ۲۱؛ ۱۳۹: ۱) اس قسم کے کلمات کسی انسان کے منہ سے نہیں نکل سکتے جس طرح کے کلمۃ اللہ کی زبان مبارک سے نکلے۔ آپ اپنی زندگی کی آخری شب خدائے قدوس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں "اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں۔ جو کام تو نے مجھے کرنے کو دیا تھا اس کو پورا کر کے میں نے زمین پر تیرا جلال ظاہر کیا اور اب اے باپ تو اس جلال سے جو میں دنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ

رکھتا تھا مجھے اپنے ساتھ جلالی بنالے۔ تونے بنائے عالم سے پیشتر مجھ سے محبت رکھی (یوحنا ۱۷ باب) کسی انسان ضعیف البنیان کو یہ جرات نہیں کہ خدائے قدوس کے حضور اس قسم کے الفاظ اپنے منہ سے نکالے لیکن جب ہم کلمۃ اللہ کے منہ سے ایسے الفاظ سنتے ہیں تو ایک قدرتی بات معلوم ہوتی ہے اور کوئی صحیح العقل شخص ان کو کفر پر محلول نہیں کرتا۔

پس اناجیل کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ نہ صرف کلمۃ اللہ کے اقوال وافعال میں ہم کو گناہ کا شائبہ تک نہیں ملتا بلکہ اس کے برعکس آپ کو یہ احساس تھا کہ آپ کامل طور پر رضائے الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔ ابن اللہ کے تصورات، جذبات، اقوال اور افعال سے ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی ہمیشہ آپ کی مطمح نظر (اصلی مقصد) تھی (یوحنا ۱۴: ۳۱)۔ آپ نے انسانی قالب میں رہ کر اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو خدا کی ذات اور مرضی کا مظہر بنا رکھا تھا۔ آپ نے ایک ایسی زندگی بسر کی جس میں انسانیت اپنے کمال تک پہنچ گئی اور آپ کے معاصرین نے "اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا خدا کے اکلوتے بیٹے کا جلال (یوحنا ۱: ۱۴)۔ آپ کے تصورات اور جذبات، اقوال اور افعال میں ہم انسانیت کا کمال دیکھتے ہیں، جو در حقیقت رضائے الٰہی پر کامل طور چلنے کا عکس ہے۔ پس الوہیت کا کمال انسانی جسم میں ظاہر ہوا۔ مقدس پولوس رسول "الوہیت کی ساری معموری اسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے" (کلسیوں ۲: ۹؛ ۱: ۱۹؛ یوحنا ۱: ۱۶)۔ جب ہم اس کاملیت کو انسانی پہلو سے دیکھتے ہیں تو ہم انسانیت کے کمال کو دیکھتے ہیں اور ہم جان سکتے ہیں کہ کامل انسان کس قسم کا انسان ہو سکتا ہے اور ہماری انسانیت کمال کے کس درجہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کلمۃ اللہ کی قدوس ذات میں الوہیت اور انسانیت کا کمال یک جا ہیں۔ جب ہم آپ کی زندگی پر الٰہی پہلو سے نظر کرتے ہیں۔ تو اس میں "الوہیت کی ساری معموری" پاتے ہیں اور جب ہم اسی زندگی پر انسانی زاویہ نگاہ سے نظر کرتے ہیں تو اس میں انسانیت کا کمال پاتے ہیں (یوحنا ۱: ۱۔۱۷؛ ۱۰: ۳۰؛ ۱۔ یوحنا ۱: ۱۔۳) ابن اللہ بشر تھے اور فوق البشر بھی تھے (افسیوں ۱: ۲۱۔۲۳) انسان کی قوت متخیلہ مسیح کی انجیلی تصویر میں کچھ ایزاد (اضافہ) نہیں کر سکتی۔ دیگر مذاہب کے بانیوں کی زندگیوں پر نظر کر کے ہر ملک اور قوم کے انسان کہتے ہیں کہ اس میں فلاں فلاں بات ہوتی تو اس کی زندگی قابل تقلید ہوئی۔ لیکن مسیح کی شخصیت کی کاملیت کا یہ ایک بین ثبوت ہے کہ کسی شخص کے وہم گمان میں بھی نہیں آتا کہ وہ کہے کہ کاش مسیح میں فلاں خصوصیت بھی موجود ہوتی۔ جنابِ مسیح کی روشن ضمیر و قلب پر کسی کو میں ایسے حملوں اور زخموں کے نشان نظر نہیں آتے جو آپ نے کبھی شیطان کے ہاتھوں سہے ہوں۔ آپ کی ذات ہر نقطہ خیال سے جامع صفات ہے۔ ابن اللہ میں انسانیت کا کمال موجود ہے آپ نے اپنی انسانیت کے ذریعہ دنیا پر ظاہر کر دیا کہ خدا کی ذات کیسی ہے اور اس نے انسان کو کس مقصد کی خاطر پیدا کیا تھا اور وہ مقصد کس طرح اعلیٰ ترین پیمانہ پر حاصل ہو سکتا ہے۔

(۷)

منجی عالمین نے دیگر انبیاء کی طرح گناہ گاروں کو توبہ کی دعوت دینے پر ہی قناعت نہیں کی۔ آپ نے گناہ گاروں کے گناہوں کو معاف بھی کر دیا (مرقس ۲: ۵؛ لوقا ۷: ۴۸ وغیرہ) دنیا کے لوگوں کا اور دیگر مذاہب کے انبیاء کا یہی خیال تھا کہ "گناہ کون معاف کر سکتا ہے سوا ایک یعنی خدا کے؟" (مرقس ۲: ۷) گناہ خدا کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔ لہٰذا صرف خدا ہی گناہ کو معاف کر سکتا ہے لیکن منجی عالمین نے فرمایا "ابنِ آدم کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے" (مرقس ۲: ۱۰) چونکہ دیگر انبیاء ہماری طرح خاکی اور خاطی انسان تھے وہ اس بات کی جرات ہی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ گناہ کو معاف کرنے کا خیال بھی دل میں لائیں۔ اس کے برعکس کلمۃ اللہ کی قدوس اور پاک ذات کے دل میں گناہوں کے معاف نہ کرنے کا خیال کبھی نہ آیا۔ جہاں آپ نے گناہ اور توبہ کے آثار دیکھے آپ نے گناہ گاروں کے گناہ معاف کئے اور فرمایا "بیٹا خاطر جمع رکھ تیرے گناہ معاف ہوئے" (متی ۹: ۳) "اے عورت تیرے گناہ معاف ہوئے" (لوقا ۷: ۴۸)۔ آج کے دن تو میرے ساتھ فردوس میں ہوگا (لوقا ۲۳: ۴۳؛ یوحنا ۵: ۱۴) جائے غور ہے کہ منجی کونین تمام گناہ گاروں کو معاف کرتے ہیں (مرقس ۲: ۵؛ متی ۱۱: ۲۸؛ یوحنا ۸: ۱۱؛ ۱۱: ۲۵؛ ۱۴: ۲۷

وغیرہ) لیکن آپ کو یہ احساس ہے کہ آپ کو خود مغفرت کی مطلق حاجت نہیں۔ آپ کے مخالف ازراہِ طعنہ آپ کو "گناہ گاروں کا یار" (متی ۱۱:۱۹؛ لوقا ۷:۳۴) کہتے تھے۔ کیونکہ آپ ان کے رفیق، مونس اور ہمدرد تھے۔ ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور اس الٰہی محبت کے ظہور سے ان کو شیطان کی غلامی سے چھڑا کر ان کا میل ملاپ دوبارہ خدا کے ساتھ کر دیتے تھے۔ لیکن اگرچہ آپ کی نشست و برخاست گنہگاروں کے درمیان بھی آپ گناہ سے مبرا اور خطا سے منزہ رہے۔ فریسی گناہ گاروں سے کنارہ کش رہتے تھے تاکہ وہ بھی ان کی مانند گنہگار نہ ہو جائیں۔ لیکن تمام انجیل چھان مارو، تم کہیں یہ نہ دیکھو گے کہ اس قسم کا خدشہ ابن اللہ کو کبھی دامن گیر ہوا ہو۔ آپ کی نیکی اور راستبازی کو کسی مصنوعی حفاظت اور چار دیواری کی ضرورت نہ تھی۔ بدترین گنہگاروں سے ملنے سے آپ کو آلائش کا اندیشہ نہ تھا۔ آپ کو گناہ گاروں کی حالت دیکھ کر "ترس" آتا تھا۔ کیونکہ "وہ ان بھیڑوں کی مانند جن کا چرواہا نہ تھا خستہ حال اور پراگندہ تھے (متی ۹:۳۶) ان کے چرواہے یعنی فریسی اور کاہن "بھیڑیئے (شیطان) کو آتے دیکھ کر بھیڑوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور بھیڑیئے نے ان کو پکڑ کر پراگندہ کر دیا تھا (یوحنا ۱۰:۱۲) لیکن مسیح خداوند نے فرمایا "اچھا چرواہا میں ہوں اچھا چرواہا اپنی بھیڑوں کے لئے جان دیتا ہے" (یوحنا ۱۰:۱۱) آپ نے اپنے کلام اور اپنی زندگی اور موت سے گناہ گاروں کو ان کے گناہوں سے مغفرت عطا کی۔

(۸)

ابن اللہ نہ صرف گناہوں کے معاف کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، بلکہ گناہ گاروں کے عادل منصف ہونے کا بھی دعویٰ کرتے ہیں (متی ۱۳:۴۱ اور ۲۵ باب وغیرہ) آپ نے فرمایا "باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ہے (حضرت یوحنا 5 باب 22 آیت) باپ نے بیٹے کو عدالت کرنے کا اختیار بھی بخشا ہے (یوحنا ۵:۲۲)۔ باپ نے بیٹے کو عدالت کرنے کا اختیار بھی بخشا ہے (یوحنا ۵:۲۷) "میں دنیا کی عدالت کرنے آیا ہوں" (یوحنا ۹:۳۹)۔ "ابن آدم اپنے جلال میں آئے گا اور سب فرشتے اس کے ساتھ آئیں گے اور وہ اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا اور سب قومیں اس کے سامنے جمع کی جائیں گی اور وہ نیکوں کو گنہگاروں سے جدا کرے گا۔ جیسے چرواہا بھیڑوں کو بکریوں سے جدا کرتا ہے (متی ۲۵:۳۱؛۱۹:۲۸؛ لوقا ۳:۱۷؛ اعمال ۱۰:۴۲؛ ۱۷:۳۱ وغیرہ) اس دعویٰ سے ظاہر ہے کہ آپ خود معصوم اور بے گناہ تھے۔ آپ جیسا ضمیر اور کانشنس (وہ انسانی قوت جو انسان کو بھلائی کی طرف متوجہ کرے) رکھنے والا انسان گناہ گار ہو کر دوسروں کی عدالت کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ نے فرمایا "میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کر سکتا جیسا سنتا ہوں عدالت کرتا ہوں اور میری عدالت راست ہے کیونکہ میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہوں" (یوحنا ۵:۳۰)۔ جس شخص کا اپنا دل گناہوں سے تاریک ہو اس میں عدالت کرنے کی روشن ضمیری نہیں آسکتی۔ صرف ایک بے گناہ شخص ہی بنی نوع انسان کی ابدی زندگی اور ابدی موت کا فیصلہ کر سکتا ہے (متی ۲۵:۴۶؛ ۵:۲۴۔۲۹)۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کلمۃ اللہ کی زندگی اور موت ہر ایک شخص کی زندگی کی عدالت کرتی ہے (یوحنا ۱۶:۱۱)۔ جب آپ دنیا میں تھے تو آپ کی بے گناہ اور معصوم زندگی ایک آئینہ تھی جس میں بدکار اپنی بدکرداری کو اس کی عریانی کی حالت میں دیکھتے تھے (یوحنا ۸:۹؛ لوقا ۵:۸ وغیرہ) آپ نے فرمایا تھا "میں نور ہو کر دنیا میں آیا ہوں تاکہ جو کوئی مجھ پر ایمان لائے اندھیرے میں نہ رہے (یوحنا ۱۲:۴۶)۔ آپ کی زندگی کی روشنی میں ہر شخص اپنے تاریک خیالات، ناپاک جذبات، پلید اقوال اور گندے افعال کو دیکھ سکتا ہے۔ آپ کی طفولیت اور شباب کو دیکھ کر ہر ایک شخص اپنی طفولیت اور شباب کی زندگی سے شرماتا ہے۔ آپ کا کلام "دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہراتا ہے (یوحنا ۱۶:۸)۔ اس تاریک دنیا میں صرف آپ کی زندگی ہر پہلو سے کامل ہے اور انسانیت کے تمام روحانی مدارج کو روشن کر دیتی ہے۔ آپ کی قدوسیت کے سامنے ہر شخص کا سرِ تسلیم خم ہے۔ آپ کی زندگی انسانی تاریخ میں ایک معجزہ ہے، جو بے نظیر اور عدیل ہے۔

دنیائے اخلاق میں آپ کا کئی ہمسر نہیں۔ ہر دیگر مذہب کے بانی کی اخلاقی زندگی کو اس زمرہ میں شمار کرتے ہیں، جس میں ہماری اخلاقی زندگیاں ہیں۔ ان کی زندگیاں ہماری زندگیوں کی عدالت نہیں کر سکتیں۔ بلکہ بعض بانیوں کی زندگیاں ایسی ہیں جن کی عدالت ہماری زندگیاں کرتی ہیں۔ اور ان کو ملزم گردانتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ گو وہ مذاہب کے بانی اور مصلح تھے۔ تاہم وہ ہماری طرح خاکی اور خاطی ضعیف البنیان (جس کی بنیاد کمزور ہو) تھے۔ لیکن ابن اللہ کی زندگی ہماری زندگیوں کی عدالت کرتی ہے اور ان کو ملزم قرار دیتی ہے۔ ابن اللہ کی زندگی ایک آئینہ کی مانند ہے (یعقوب ۱: ۲۳)۔ جو شخص اس میں اپنا منہ دیکھتا ہے شرمسار ہو جاتا ہے۔ آپ کی پاکیزہ زندگی ہماری گناہ آلودہ زندگیوں پر ہمیشہ فتویٰ صادر کرتی ہے اور ہم کو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ فتویٰ سچا ہے۔ جو شخص بھی ایک دفعہ مسیح کو دیکھ لیتا ہے وہ اپنی اخلاقی اور روحانی زندگی کی طرف سے ایسا بے چین ہو جاتا ہے کہ اس کو پھر اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہوتا اور وہ حضرت پطرس کی طرح چلا اٹھتا ہے کہ ''اے خداوند میں ناپاک آدمی ہوں'' (لوقا ۵: ۸)۔ پس آپ کی مقدس زندگی کو ہم دیگر ضعیف البنیان انسانوں کی زندگیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں شمار نہیں کر سکتے اور نہ کرتے ہیں۔ کیونکہ دونوں قسم کی زندگیوں میں بعد المشرقین ہے۔ آپ کی پاک ذات کی روشنی ہر زمانہ ملک اور قوم کے کروڑوں افراد کے لئے اعلیٰ ترین معیار رہی ہے، جس سے انہوں نے اپنے گناہوں اور تاریک مقاموں کو دیکھا ہے اور انکی اصلاح کی ہے۔ پس آپ ابتدا ہی سے عالم روحانیت کے واحد استاد اور حکمران اور دنیائے اخلاق کے واحد تاجدار رہے ہیں۔

(۹)

حق تو یہ ہے کہ کلمۃ اللہ کی ذات ایسی ہے جو دنیا کی پیدائش سے تا قیامت ایک ہی بار واقع ہوئی ہے یعنی ایک ایسا شخص جو اس دنیا میں آیا جو ''خود گناہ سے ناواقف تھا'' لیکن اس نے گناہ کی حقیقت کو دنیا پر واضح کر دیا۔ (متی ۵: ۲۷؛ ۱۵: ۱۱ وغیرہ) وہ دوسروں کو توبہ کی دعوت دیتے تھے (متی ۴: ۱۷)۔ لیکن اس کو خود توبہ کی مطلق (بے قید) حاجت نہ تھی۔ وہ ریاکاری کے جانی دشمن تھے۔ لیکن خود راستباز ہونے کے مدعی تھے (یوحنا ۵: ۳۰)۔ وہ دوسروں کو نجات دینے آئے تھے لیکن خود ان کو نجات کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ وہ خدا کی طرح گناہ گاروں کو معاف کرتے ہیں لیکن وہ گناہ گاروں کو خدا کے نام سے معاف نہیں کرتے بلکہ اپنے نام اور اختیار سے معاف کرتے ہیں (مرقس ۲: ۱۰؛ لوقا ۲۳: ۴۳) اور خدا کا ذکر تک درمیان میں نہیں لائے۔ دیگر انبیاء مثلاً حضرت سموئیل وغیرہ کہتے تھے کہ ''خدا نے تیرے گناہ معاف کر دیئے'' (۲۔ سموئیل ۱۲: ۱۳) اور ان کی تعلیم یہ تھی کہ صرف خدا ہی گناہوں کو معاف کر سکتا ہے (متی ۹: ۳؛ یسعیاہ ۴۳: ۴۵؛ یرمیاہ ۳۱: ۳۴؛ حزقی ایل ۳۶: ۳۵)۔ کلمۃ اللہ کامل انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں (متی ۱۱: ۲۵۔۲۸) لیکن یہ کمال ان کو پیدائش کے وقت عطیہ کے طور نہیں ملا تھا۔ بلکہ آپ نے خود حاصل کیا تھا۔ دیگر انسانوں کی روحانی ترقی بدی سے نیکی کی جانب ہوتی ہے لیکن خود ابن اللہ کی روحانی ترقی کاملیت کی ایک منزل سے دوسری منزل کی جانب ہوئی (لوقا ۱: ۴۰)۔ پس آپ کی ہستی اخلاقیات اور مذاہب کی دنیا میں بے نظیر ہے۔

جنابِ مسیح کی عالم گیر شخصیت

ابن اللہ کی زندگی کا خاکہ ایک جامع ہستی کا خاکہ ہے۔ آپ کی پاک اور قدوس ذات میں کوئی بات نہیں پائی جاتی جو مقامی ہو اور امتدادِ زمانہ کے باعث منسوخ ہونے کے لائق ہو یا قابلِ تقلید نہ رہی ہو آپ کی شخصیت اور آپ کی ستودہ قدوس صفات کا کسی خاص جگہ وقت مکان زمان، قوم، پشت وغیرہ کے ساتھ تعلق نہیں۔ بلکہ آپ کی تعلیم کے اصول کی طرح آپ کی ذات بھی عالم گیر ہے۔ آپ اہل یہود میں سے تھے لیکن ہٹلر جیسے دشمن یہود کو بھی آپ کی زندگی میں یہودی خصائل کا شمہ تک نظر نہیں آتا۔ جہاں ہٹلر ہر شئے کو جس سے یہودیت کی بو بھی آتی ہے نیست

ونابود کرنے کو تیار رہتا ہے وہاں جنابِ مسیح کی شخصیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے کیونکہ آپ کا نصب العین اور آپ کی ذات کسی خاص قوم اور ملک سے وابستہ نہیں بلکہ آپ کی ہستی جامع اور عالم گیر ہے۔

مختلف ممالک اور اقوام کا مطمع (نظر پڑنے کی جگہ، مقصود) نظر ایک نہیں ہوتا۔ جو شخص عرب کی نظر میں ہیرو ہے وہ اٹلی کی نظر میں قابلِ قدر نہیں ہوتا۔ جو شخص مثلاً ہٹلر جرمنی کی نظر میں قابلِ قدر ہستی ہے وہ امریکہ یا ہندوستان کی نظروں میں وقعت (عزت) نہیں رکھتا۔ مثلاً اہلِ مغرب ہندوستان کے گاندھی جی کو ایک عظیم ہستی مانیں گے۔ لیکن اس کو نجات دہندہ مان کو ہر گز اس کی پیروی نہ کریں گے۔ ہندوستان کے باشندے مغرب کے کسی فلاسفر کو قابلِ قدر ہستی مان لیں گے لیکن اس کو اپنا گورو اور مکتی داتا ماننے کو ہر گز تیار نہ ہوں گے۔ لیکن مشرق و مغرب کے رہنے والے سب کے سب یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی جنابِ مسیح کی زندگی کی طرح ہو جائے۔ وہ آپ کے کامل نمونہ پر چلنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ آپ خداوند کی زندگی لیں مثالیہ شی ہے۔ کیونکہ یہ بات کسی اور دین کے ہادی کو نصیب ہے۔ مثلاً کیا غیر مسلم اصحاب ایسے شخص کو مرحبا کہیں گے جو اپنی زندگی کو رسولِ عربی کی مانند بنانے کی کوشش کرتا ہے؟ کیا غیر ہنود (اور ہنود بھی) ایسے اشخاص کی دل سے وقعت کریں گے جو اپنی زندگی کو کرشن کی زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مہاتما بدھ دنیا کی عظیم الشان ہستیوں میں سے ہے۔ لیکن کتنے اشخاص ہیں جو اپنی زندگی کو بدھ کے نقشِ قدم پر چلانا چاہتے ہیں؟ لیکن اگر کوئی شخص یہ تہیہ کر لیتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو جنابِ مسیح کی زندگی کے مطابق کرے گا اور اپنے خیالات و جذبات و افعال کو آپ خداوند کے خیالات و جذبات و افعال کے نمونہ پر چلائے گا تو جس نسبت سے وہ اپنی ساعی (کوشش کرنے والا) میں کامیاب ہوتا ہے اسی نسبت سے روئے زمین کے تمام ممالک و اقوام اس کی دل سے قدر، وقعت اور تعظیم کرتی ہیں اور اس کے وجود کو دنیا کے لئے باعثِ غنیمت خیال کرتی ہیں۔ رینان جیسا آزاد خیال اور عقل پرست یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

> ''مسیح کی ذات نوع انسانی کی حقیقی فلاح کی مضبوط پشت و پناہ ہے۔ اگر اس دنیا سے مسیح کا نام مٹ جائے تو دنیا کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ وہ ایسی بے نظیر ہستی ہے جس کے ہاتھ میں دنیا کی باگ ڈور ہے اور جس کے ذریعہ انسان خدا کے پاس پہنچ سکتا ہے۔ نوع انسانی کے لئے اس کی زندگی ایک زبردست نمونہ ہے۔ جب تک ہمارے سینوں میں مسکن گزیں نہیں ہوتا ہم کو حقیقی راستبازی اور پاکیزگی حاصل نہیں ہو سکتی''۔

کلمۃ اللہ کی شخصیت ہی ایک ایسی واحد شخصیت ہے جس کی تعلیم اور نمونہ کو ہر زمانہ ملک اور قوم کے کروڑوں افراد اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں۔ کیا مشرق مغرب اور کیا شمال جنوب۔ سب کا سر آپ کی ذات کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ جنابِ مسیح اکیلے واحد مشرقی شخص ہیں جن کے سامنے اہلِ مغرب اور اہلِ مشرق سب کے سب سر بسجود (سجدہ ریز ہونا) ہیں۔ ابن اللہ کی ذات کامل ہے۔ آپ کی صفات جامع ہیں اور آپ کا نمونہ کل بنی نوع انسان کے لئے کامل اور اکمل ہے۔

کلمۃ اللہ کی آمد نے خدا کی ذات کو انسان پر ظاہر کر دیا۔ خدائے قدیم کا جلال ابن اللہ کا جلال کے ذریعہ بنی نوع انسان پر پرتو فگن ہوا۔ خدا نے مسیح میں مجسم ہو کر اپنی ذات کی ضیا پاشی کی۔ خدا اور انسان میں، خالق اور مخلوق میں، عابد اور معبود میں گو فرق اور تمیز برقرار رہتی لیکن دونوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ رہی۔

در بشر روپوش کردہ است آفتاب
فہم کن اللہ اعلم بالصواب
صورتش برخاک وجان برلامکان
لامکانے فوقِ وہم سالکان

(مولانا روم)

فصل دوئم

مسیح کی فضیلت کی شان

اور

شہادت انجیل وقرآن

ہمارے مخاطب اور انداز خطاب

(۱)

اس فصل میں ہمارا روئے سخن مسلمان برادران کی طرف ہے جن کا ایمان تمام کتب منزل من اللہ پر ہے۔ چنانچہ قرآن میں وارد ہوا ہے۔

(۱) وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ (سورۃ آل عمران آیت ۱۱۹)

یعنی جو ایمان رکھتے ہیں خدا کی ساری الکتاب (بائبل) پر۔

کیونکہ قرآن مطابق آیت شریف

(۲) (وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ) (سورۃ الانعام آیت ۹۲)

یعنی یہ (قران بھی) کتاب (آسمانی) ہے جس کو ہم نے اتارا ہے۔ برکت والی (کتاب) ہے اور جو (کتابیں) اس (کے زمانہ نزول) سے پہلے (کی موجود) ہیں ان کی (بھی) تصدیق کرتی ہے۔ (ترجمہ نزیر احمد)

(۳) (وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ) (سورۃ بقرۃ آیت ۹۱)

یعنی قرآن حق ہے اور تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس موجود ہے۔

(۴) (وَ اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًی وَّ نُوْرٌ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًی وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ) (سورۃ المائدہ آیت ۴۶)

یعنی ہم نے عیسٰی کو انجیل دی اور اس کے اندر ہدایت ہے اور نور اور وہ تصدیق کرتی ہے تورات کی، جو اس کے آگے تھی اور وہ ہدایت ہے اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔

(نیز دیکھو نساء ع ۶۔ بقر ع ۵۔ ع ۱۱۔ مائدہ ۷، ۹۔ ۱۰۔ انعام ع ۱۱۔ ع ۱۹۔ مومن ع ۶۔ وغیرہ)

مندرجہ بالاآیات سے دو باتیں صاف ہو جاتی ہیں اول کہ کتب بائبل میں یازمانہ قرآن تحریف واقع نہیں ہوئی۔پس وہ تلاوت اور اسلامی ایمان کا جز ہیں۔دوم۔کہ سچا مسلمان وہی ہے جو بائبل وقرآن دونوں کو کتب سماوی سمجھ کر دونوں پر ایمان لائے اور دونوں کی غور وتدبر (انجام پر غور کرنا) سے تلاوت کر کے ان پر عمل کرے جس طرح نصاریٰ انبیاء یہود کی کتب پر ایمان رکھتے ہیں اور انجیل جلیل کے ساتھ ان کی بھی تلاوت کرتے ہیں۔

جو مسلمان برادران قال اللہ اور قال الرسول کو اپنے ایمان کی بنیاد بناتے ہیں۔ان کے لئے مسئلہ تحریف کی غلطی ثابت کرنے کے لئے مندرجہ بالاآیت کافی اور وافی (مکمل) ہیں۔لیکن جو عقل کو بھی دخل دیتے ہیں اور ادبیات کے تنقیدی اصولوں کے مطابق کتاب مقدس اور انجیل جلیل کی صحت کو پرکھنا چاہتے ہیں ہم ان کی توجہ اپنی کتب ''صحت کتب مقدسہ ''اور ''قدامت واصلیت اناجیل اربعہ (۲ جلد)'' کی جانبمبذول کرتے ہیں اور ان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ قرآن کو بھی موجودہ علم تنقید کے اصولوں پر پرکھیں تاکہ اس کی صحت سے بھی واقف ہو سکیں۔

(۲)

پھر قرآن میں ارشاد ہوا ہے:۔

(تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ)(سورۃ آل عمران آیت ۶۴)

یعنی (اے اہل کتاب) ایک ایسے کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلم ہے۔

اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔

(وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَہْلَ الْکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْہُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ وَ اِلٰـہُنَا وَ اِلٰـہُکُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ)(سورۃ عنکبوت آیت ۴۶)

یعنی تم اہل کتاب سے جھگڑا (بحث) کرو تو ایسے طور پر کرو جو سب سے اچھا ہو اور ان سے یوں کہو کہ ہم ایمان رکھتے ہیں قرآن پر جو ہم پر نازل ہوا اور بائبل پر جو تم پر اتری۔ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے محکوم ہیں۔

انجیل میں بھی وارد ہوا ہے کہ:۔

- حق بات کو محبت کے ساتھ زبان سے نکالو۔(افسیوں ۴:۱۵)
- تمہارا کلام ہمیشہ پر فضل اور نمکین ہوتا کہ تمہیں ہر شخص کو مناسب جواب دینا آجائے۔(کلسیوں ۴:۶)
- جو کوئی تم سے تمہاری امید کی وجہ اور دلیل دریافت کرے اس کو جواب دینے کے لئے ہر وقت حلم اور خوف کے ساتھ مستعد رہو اور نیت بھی نیک رکھو۔(۱۔پطرس ۳:۱۵ وغیرہ)

مذکورہ بالا قرآنی اور انجیلی ارشادات کے مطابق راقم السطور (جس نے یہ سطریں تحریر کی ہیں) اسلامی دنیا کو دعوت دیتا ہے کہ ایک ایسے کلمے کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلم ہے۔انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں کا ایمان ایک واحد اللہ پر ہے جس کے ہم سب محکوم ہیں اور ہر کتب سماوی حضرت کلمۃ اللہ کی ثناخواں ہیں۔پس اس فصل میں ہم کلمۃ اللہ کی افضل خصوصیات کا ذکر کریں گے۔جو اسلام اور مسیحیت میں مسلم ہیں۔

مقام مریم وابن مریم

(۱)

قرآن اور اناجیل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ حضرت مریم صدیقہ حضرت کلمۃ اللہ کی پیدائش کے وقت پاکیزہ تھیں۔ اناجیل ہمیں بتاتی ہیں کہ آپ کی منگنی حضرت یوسف سے ہوگئی تھی لیکن ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے (متی ۱:۱۸) جبرئیل فرشتہ اللہ کی طرف سے آپ کے پاس آیا۔ اور اس نے کہا "سلام۔ خدا نے تجھ کو اپنے فضل سے سرفراز فرمایا ہے کیونکہ خدا تیرے ساتھ ہے"۔

حضرت مریم عفیفہ (پرہیزگار عورت، باعصمت عورت) تھیں۔ آپ فرشتہ کو دیکھ کر اور اس کا کلام سن کر گھبرا اُٹھیں فرشتے نے آپ کی حالت دیکھ کر کہا۔

"بی بی۔ خوف نہ کر، کیوں کہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے۔ دیکھ تو حاملہ ہوگی اور تیرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام یسوع رکھنا اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا۔ وہ ایک عظیم شخصیت کا مالک ہوگا اور خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا۔ مریم مقدسہ نے فرشتے سے پوچھا کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ میں اب تک مرد کو نہیں جانتی۔ جبرئیل نے جواب دیا میں کہ خدا کا روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور خدا کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی۔ اس سبب سے وہ مولود مقدس اور ابن اللہ ہوگا"۔

حضرت مریم نے جواب دیا "میں تو خدا کی بندی ہوں۔ اگر رضائے الٰہی یہی ہے تو مجھے منظور ہے میرے تیرے قول کے موافق ہو۔ تب فرشتہ آپ کے پاس سے چلا گیا"۔ (لوقا ۱:۲۶۔۳۸؛ متی ۱:۱۸ تا آخر۔ سورۃ مریم ۱۶ تا ۳۳ آیات)

یہ خاتون کون تھیں؟ قرآن مجید ہم کو مفصل طور پر بتلاتا ہے کہ حضرت بی بی مریم اپنی پیدائش پہلے جب وہ ابھی بطنِ مادر (ماں کا پیٹ) تھیں تو آپ کی والدہ مکرمہ نے آپ کو خدا کی نذر کر کے دُعا کی تھی کہ :۔

"اے میرے رب جو کچھ میرے بطن میں ہے اس کو میں نے تیری نذر کیا ہے، تو اس کو میری طرف سے قبول فرما" (آل عمران آیت ۳۱)

جب حضرت مریم پیدا ہوئیں تو آپ کی والدہ نے آپ کو اور آپ کی اولاد کو خدا کے حفظ واماں میں دے کر کہا۔

"اے میرے رب میں اس کو اور اس کی اولاد کو الشیطان الرجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں"۔ (آل عمران آیت ۳۱)

ایسی خدا رسیدہ ماں کی دعا اپنا اثر دیکھائے بغیر نہ رہی پس :۔

"اس کے رب نے بی بی مریم کو اچھی طرح قبول فرمایا"۔ (سورہ آل عمران آیت ۳۲)

اس آیہ شریفہ سے ظاہر ہے کہ خدا نے مریم کو بالفاظ انجیل اپنے "فضل" کے سایہ میں لے لیا اور آپ کو "شیطان مردود سے پناہ" میں رکھا اور آپ کے رشتہ دار حضرت زکریاہ جیسے صالح کاہن (لوقا ۱:۸) کو آپ کا کفیل اور ذمہ دار بنایا۔ (آل عمران ۳۲)

چونکہ حضرت زکریاہ کاہن تھے مریم بتولہ کی طفولیت کا زمانہ حضرت سموئیل نبی کی طرح خدا کے مقدس میں گذرا اور خدا خود آپ کی پرورش آسمانی خوراک سے کرتا رہا (قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ) (سورۃ آل عمران آیت ۳۷)

اس تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آپ جوان ہوئیں تو آپ ایک ایسی خاتون تھیں جس پر بالفاظ انجیل "اور خدا کی طرف سے فضل ہوا، اور بالفاظ اور قرآن"۔

جس کو اللہ نے پسند فرمایا اور پاک کیا اور تمام جہاں کی عورتوں سے بر گزیدہ فرمایا۔ (وَ اصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ) (سورۃ آل عمران آیت ۴۲)۔

پس وہ اس قابل تھیں کہ آپ کے بطن اطہر سے ابن اللہ و کلمۃ اللہ پیدا ہو قرآن مجید کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ حضرت بی بی مریم ایک ایسی پاک دامن اور مقدس ہستی تھیں جو صفت اور پرہیز گاری کے لحاظ سے تمام دنیا کے طائفہ نسواں پر فضیلت رکھتی تھیں۔ جن کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ خاص کے خاص کے ہاتھ آپ کے پاس پیغام بھیجا۔ یہی ہے کہ قرآن میں خدا نے آپ کو ''صدیقہ'' کا خطاب مستطاب (خوش گوار، نیک) عطا فرمایا۔ (مائدہ آیت ۷۹)

مسیح کی خارق عادت پیدائش

قرآن شریف میں وارد ہوا ہے:۔

یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ (سورۃ آل عمران آیت ۴۵)۔

یعنی اے مریم، خدا تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام المسیح عیسیٰ بن مریم ہے وہ دنیا اور آخرت میں خوشنما بارونق چہرے والا ہو گا اور خدا کی قربت میں رہنے والا ہو گا۔

انجیل جلیل کا پہلا ورق ہمیں بتلاتا ہے کہ کلمۃ اللہ کی پیدائش میں اور مذہب عالم کے بانیوں کی پیدائش میں فرق ہے۔ جب سے ابوالبشر آدم خلق کیا گیا اس وقت سے لے کر دور حاضرہ تک کوئی شخص خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان ہو گزرا ہو حضرت روح اللہ کی طرح باکرہ (کنواری لڑکی) کے باطن اطہر سے خدا تعالیٰ کی قدرت خاص سے پیدا نہیں ہوا۔ (متی ۱: ۲۰؛ لوقا ۱: ۳۴۔۳۵)

اس قسم کی پیدائش صرف ابن اللہ کی ذات سے ہی مخصوص ہے اور یہ خصوصیت ہے جس کو ہر دو کتب سماوی قرآن و انجیل تسلیم کرتی ہیں (عمران ۴۰تا۴۲۔ مائدہ ۱۰۹۔ مریم ۱۶تا۳۲۔ وغیرہ)

پس ابن مریم کی خارق (پھاڑنے والا، کرامت) عادت پیدائش پر خدا اس کے ملائک اور ہر دو کتب سماوی کے ماننے والے یعنی کل دنیا کے مسیحی اور مسلمان متعلق ہو کر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ابن مریم کو دنیا کے کل انسانوں، ہادیوں، نبیوں پر فوقیت اور تقدم حاصل ہے اور ابن اللہ فوق البشر انسان اور افضل الناس ہستی ٹھہرتے ہیں۔

''مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم'' کا مطلب

بعض عقل پرست آیہ قرآنی ''عیسیٰ کی مثل اللہ کے نزدیک آدم کی مثال ہے۔ اس کو مٹی سے خلق کیا۔ پھر اس کو کہا ''ہو جا'' پس وہ گیا (سورۃ آل عمران آیت ۵۹) کو اس واقعہ کے انکار سے پیش کرتے ہیں۔ پس ہم اس آیت شریف کا مفہوم بھی صاف کئے دیتے ہیں۔ تورات شریف میں آیا ہے کہ:۔

''خدا نے آدم کو مٹی سے انسان بنایا اور اس کے نتھنوں میں کا دم پھونکا''۔ (پیدائش ۲: ۷)

انجیل میں وارد ہوا ہے کہ:۔

''خدا نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام روئے زمیں پر پیدا کیا''۔(اعمال ۱۷:۲۶)

قرآن مجید میں بھی آدم اور نسل آدم کی آفرینش کی نسبت یہی آیا ہے۔(سجدہ،آل عمران،دہر)

ابوالبشر آدم اور حوا کی پیدائش الٰہی تخلیق کے طور پر ماں باپ کے واسطہ کے بغیر ہوئی جس طرح دیگر حیوانات کے پہلے جوڑے نر اور مادہ کے بغیر پیدا ہوئے (پیدائش ۱:۲۰) اس وقت کے بعد آج کے دن تک ہر حیوان اور ہر فرد بشر طبعی قانون فطرت کے مطابق نر اور مادہ سے پیدا ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن اس قاعدہ کلیہ سے صرف ایک واحد فرد یعنی مسیح ابن مریم کی پیدائش مستثنیٰ (وہ شخص یا چیز جسے علیحدہ کیا گیا یا چُنا گیا) اور یعنی فوق الفطرت طور پر ہوئی۔ بالفاظ مقدس پولوس:.

''ابوالبشر آدم اول مٹی سے تھا اور خاکی تھا لیکن آدم ثانی مسیح زندگی بخشنے والی روح بنا اور آسمانی ہے''۔(۱۔کرنتھیوں ۱۵:۴۵۔۴۷)

امراً مقضیاً

کا مفہوم

قرآن مجید میں مسیح عیسیٰ کا ذکر ہر جگہ صرف آپ کی کنیت ''ابن مریم'' سے ہی کیا گیا ہے (سورۃ آل عمران) آپ کے کسی زمینی باپ کا ذکر تو درکنار نام تک موجود نہیں ہے۔ قرآن نے بقائے جنس کے فطری جنس کے طریق کو منسوخ کرنے اور آفرینش کا مقررہ سلسلہ توڑنے کی وجہ بھی اس کو بتلادی ہے:-

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا (سورۃ مریم آیت ۲۱)

''ہم (یعنی خدا) اس کو (مسیح کو) اپنی طرف سے دنیا کے آدمیوں کے لئے رحمت اور نشان بنانا چاہتے ہیں اور یہ امر ازل سے معین اور مقرر ہو چکا ہے''۔

اللہ نے یہ پسند نہ کیا کہ اپنے کلمہ اور روح کو اسی حقیر صلصال (گندھی ہوئی مٹی جس سے برتن بنتے ہیں۔ سوکھی مٹی جو بجانے پر آواز دے ۔) سے بنائے جس سے آدم اول اور اس کی نسل کی افزائش ہوئی۔ ایسی عظیم الشان خارق عادت پیدائش بغیر کسی خاص الٰہی مقصد ''كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا'' کے نہ ہو سکتی تھی۔ دونوں کتب سماوی (انجیل و قرآن) کے مطابق یہ مقصد تھا کہ دنیا میں ایک ایسا آیت اللہ اور رحمت اللہ پیدا ہو جو تمام دنیا کے انسانوں کے لئے حجت اللہ ثابت ہو (یوحنا ۹:۳۹۔۴۱) اسی واسطے ابن اللہ کی زبان معجز بیان نے فرمایا کہ:-

''راہ حق اور زندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا۔ قیامت اور زندگی میں ہوں جو مجھ پر ایمان لاتا ہے گو وہ مر جائے تو بھی زندہ رہے گا۔ دنیا کا نور میں ہوں جو کوئی میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا۔ (یوحنا ۱۴:۶؛۱۲:۲۵؛۸:۱۲)

كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا
کی انجیلی تفسیر

قرآن حضرت کلمۃ اللہ کی بے نظیر پیدائش کو ''اَمْرًا مَّقْضِيًّا'' قرار دیتا ہے یعنی ایک ایسا امر جو خدا کے خاص اہل ارادہ کے مطابق ہوا ہے۔ لیکن وہ اس قضائے الٰہی کی وجہ نہیں بتلاتا اور اس حقیقت کے مقصد کو پردہ اخفا میں رکھتا ہے۔ انجیل جلیل میں بھی اس لاثانی کلمہ کے جسم اختیار کرنے کی اصل غرض اور مدعا کو ''راز'' کہا گیا ہے جو ازل سے پوشیدہ رہا (رومیوں ۱۶: ۲۵) اور کلمۃ اللہ کے رسولوں پر جو صاحب وحی تھے (سورۃ آل عمران آیت ۴۵، سورۃ صف آیت ۱۴، سورۃ مائدہ آیت ۱۱۱؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۴: ۳۷؛ لوقا ۶: ۱۳؛ عبرانیوں ۵: ۴؛ متی ۱۰: ۲؛ مرقس ۶: ۳۰؛ رومیوں ۱: ۱ وغیرہ)۔

بذریعہ کشف و مکاشفہ خدا سے ازلی کے حکم کے مطابق ظاہر کیا گیا۔ (۱۔ کرنتھیوں ۲: ۷؛ ۱۔ تیمتھیس ۳: ۱۶؛ افسیوں ۱: ۸۔۹، ۳: ۹۔۱۲ وغیرہ)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قضائے الٰہی کی غایت کیا تھی؟ قرآن اس بارے میں خاموش ہے لیکن اس نے ایک اصول بتلا دیا ہے۔ جس کے ذریعہ ہم ''اَمْرًا مَّقْضِيًّا'' کو سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن میں رسول عربی کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

(فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ) (سورۃ یونس آیت ۹۴) یعنی (اے محمد) اگر تجھ کو اس چیز میں جو ہم نے تیری طرف اتاری کچھ شک ہو (یعنی پتہ نہ چلے) تو ان لوگوں سے پوچھ لیا کر جو تجھ سے پہلے الکتاب (بائبل) پڑھتے ہیں۔

(انعام ع ۱۰؛ قصص ۴۹)

امام رازی اس آیت شریفہ کی تفصیل میں لکھتے ہیں کہ

> اس میں خطاب رسول سے ہے۔ چونکہ آپ انسان تھے بعض اوقات آپ کے دل میں مختلف قسم کے پریشان خیال اور شبہات و تفکرات پیدا ہوتے تھے۔ جو دلائل اور تشریح کے بغیر رفع نہ ہوتے تھے پس خدا تعالیٰ نے بہ آیت نازل فرمائی

(تفسیر جلد ۵ صفحہ ۲۸، ۲۹)

تفسیر جلالین میں بھی لکھا ہے کہ

> لفظ ''تو'' کا مخاطب رسول اللہ ہیں۔

(جلد اول ص ۲۰۵)

آنحضرت اس حکم پر عمل بھی کرتے رہے۔ پھر اللہ نے جو حکم آنحضرت کو دیا اس کو عام کر کے سب مسلمانوں کو دیا اور فرمایا

(فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ) (سورۃ نحل آیت ۴۳)

یعنی اے مسلمانو، اگر تم کو کسی شے کا علم نہ ہو تو بائبل والوں سے دریافت کر لیا کرو۔

جب ہم اس قرآنی ارشاد کے مطابق انجیل جلیل کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں اس ''امر مقدر'' اور عظیم ''راز'' کو سمجھنے کی صحیح کلید مل جاتی ہے۔ چنانچہ انجیل میں وارد ہوا ہے کہ :۔

جبرئیل فرشتہ نے حضرت مریم سے ملاقات کرنے کے بعد حضرت یوسف کو ''خواب میں دکھائی دے کر کہا اے یوسف ابن داؤد۔ اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے مت ڈر کیوں کہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے۔ اس کے بیٹا ہوگا اور تو اس کا نام یسوع رکھنا کیوں کہ وہی اپنی قوم کو ان کے گناہوں سے نجات دے گا''۔ (متی ۱: ۲۰۔۲۱)

اس لاثانی مولود مقدس کی پیدائش کے بعد فرشتہ شب کی تاریکی میں چرواہوں کے پاس ''آ کھڑا ہوا۔ اور خداوند کا جلال ان کے گرد چمکا اور وہ نہایت ڈر گئے۔ مگر فرشتہ نے ان سے کہا۔

ڈرو مت کیوں کہ میں تم کو خوشی کی بشارت دینے آیا ہوں جو ساری امت کے لئے ہے۔ آج داؤد کے شہر میں تمہارے لئے نجات دہندہ پیدا ہوا ہے یعنی مسیح خداوند اور یکایک اس فرشتہ کے ساتھ آسمانی لشکر کا ایک گروہ خدا کی حمد کرتا اور یہ کہتا ظاہر ہوا کہ عالم بالا پر خدا کی تمجید ہو اور زمین پر ان آدمیوں میں جن سے وہ خوش ہے صلح''۔ (لوقا ۲: ۸۔۱۴)

صاحب وحی مقدس پطرس رسول نے روسائے یہود کے سامنے فرشتہ کے پیغام کی توضیح کر کے فرمایا۔

''کسی دوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں۔ کیوں کہ آسمان کے تلے آدمیوں کو کوئی دوسرا نام نہیں بخشا گیا جس کے وسیلے سے ہم نجات پا سکیں''۔

آپ نے سردار کاہن اور صدر عدالت والوں کے سامنے ہی علی الاعلان کہا۔

''خدا نے یسوع مالک اور نجات دہندہ مقرر کر کے اپنے داہنے ہاتھ سربلند فرمایا تا کہ اسرائیل کو توبہ کی توفیق اور گناہوں کی معافی بخشے''۔ (اعمال ۴: ۱۲؛ ۵: ۳۱ وغیرہ)

مذکورہ بالا انجیلی مقامات سے ظاہر ہے کہ حضرت کلمۃ اللہ کی بے نظیر پیدائش سے خدائے عزوجل (بزرگ) کا ازلی ارادہ یہ تھا کہ مسیح جیسی لاثانی شخصیت کا مالک (یا انجیلی اصطلاح میں ''اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے'') خدا کا رسول بن کر (یوحنا ۱: ۱۸) دنیا کے لوگوں کو ازلی ابدی اور لازوال محبت کا پیغام دے اور گناہگار دنیا کو گناہوں سے نجات دے کر اور شیطان کی غلامی سے چھڑا کر ان کو نئی پیدائش عطا کر کے از سر نو خدا کا فرزند بنائے یہ تھی اس راز کی حقیقت جس کی وجہ سے کلمۃ اللہ کا اس دنیا میں آنا مقرر و معین ہو چکا تھا جو تمام عالم و عالیمان کے لئے معجزہ یعنی عاجز کر دینے والا نشان بنا۔

امام رازی لفظ ''امر'' سے مراد عالم بسیط (کشادہ) و مجرد ہیں۔ قرآن مجید المسیح کے لئے '' **اَمْرًا مَّقْضِيًّا** '' جو آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ عالم بسیط و مجرد تھے اور ازلی و ابدی ہستی ہیں اور آسمان یا اوپر کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے لیکن لفظ '' **مَّقْضِيًّا** '' نے اس حقیقت کی توضیح کر دی کہ آپ کا لاتعین سے تعین میں آنا اور عالم رنگ و بو میں جلوہ پیرا سونا ازل سے ہی آپ کے لئے مقرر و متعین ہو گیا۔ بالفاظ دیگر کلمۃ اللہ کا تجسم ہونا ازل سے ہی مقرر و متعین ہو گیا تھا۔

کلمۃ اللہ اور روح اللہ کا مفہوم

انجیل یوحنا میں وارد ہوا ہے کہ :-

ابتدا میں کلمہ تھا کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا سب چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی بنی نوع انسان کا نور تھی۔ کلمہ مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان خیمہ زن ہوا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال (باب اول)

قرآن میں بھی آیا ہے کہ فرشتے نے ام المومنین حضرت مریم صدیقہ کو کہا

(یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ)(سورۃ آل عمران آیت ۴۵)

یعنی اے مریم تجھ کو اللہ اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے۔

پھر لکھا ہے :-

(اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ)(سورۃ النساء آیت ۱۷۱)

یعنی مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور اس کا کلمہ ہے جو مریم کی طرف ڈال دیا اور وہ اللہ کا روح ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں میں عیسیٰ مسیح کو کلمۃ اللہ یعنی خدا کا کلمہ یا کلام (کلمہ منہ) اور خدا کا روح یا روح اللہ (رُوْحٌ مِّنْهُ) کہا گیا ہے۔ تمام قرآن کو تلاش کر کے دیکھ لو۔ابن مریم کے سوا کسی دوسرے انسان یا نبی کے واسطے الفاظ کلمہ منہ اور روح منہ وارد نہیں ہوئے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نوع انسانی مخلوق ہے اور غیر اللہ ہے۔ان دونوں آیتوں میں لفظ ''منہ'' آیا ہے۔جو اضافت توصیحی ہے۔یعنی غیر حضرت کلمۃ اللہ و روح اللہ مسیح عیسیٰ ابن مریم ایک ہی ذات کے ہیں اور ایک ہی واحد ذات سے نسبت رکھتے ہیں قرآن میں یہ اضافت اور نسبت غیر اللہ اور مخلوق انسان یا شے کے لئے استعمال نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔

علیٰ ہذا القیاس مذکورہ بالا دوسری آیت میں الفاظ '' رُوْحٌ مِّنْهُ '' میں بھی اضافت توضیحی ہے۔یعنی حضرت روح اللہ مسیح عیسیٰ ابن مریم وہی ذات اور جوہر ہیں جو ہر ذات کا اللہ ہے۔پس اس اضافت توضیحی سے ثابت ہے کہ وحی الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور روح اللہ ایک واحد ہستی اور ذات الٰہی کے جوہر کے دو مختلف نام ہیں۔قرآنی آیت کلمہ کی شخصیت جوہر اور ذاتیت ظاہر کرتی ہے اور ثابت کرتی ہیں کہ جو ام المومنین حضرت مریم صدیقہ سے مولود ہوا۔وہ خدائے عزوجل کی ذات اور جوہر سے تھا۔دونوں کتب سماوی انجیل و قرآن کے ان الفاظ سے ثابت ہے کہ جو کلمہ مجسم ہو کر دنیا میں ظاہر ہوا وہ ازلی ہے اور اس کی ذات خدا کی ذات میں سے ہے اور اس کا جوہر خدا کے جوہر میں سے ہے۔

معاًبہ حقیقت بھی عیاں ہو گئی اور کلمۃ اللہ سے مراد کلمۃ من کلمات اللہ نہیں بلکہ ایسا کلمہ مراد ہے جو اپنی ذات و صفات میں واحد لاشریک اور لاثانی ہے کلمۃ اللہ اس افضیلت کے لحاظ سے تمام صفات پر حاوی اور محیط ہونے کے علاوہ ذات حق کا اکمل اور اشرف مظہر ہے اور خدا کا علم و حکمت اور ارادہ اور مقصد ہے۔ علیٰ ہذا القیاس روح منہ سے قرآن کی مراد متعدد روحوں میں سے ایک روح نہیں ہے بلکہ خدا کی اپنی روح کا عصارہ نچوڑ اور جان مراد ہے آنخداوند کے القاب کلمۃ اللہ اور روح اللہ باطنی، داخلی اور اندرونی نسبت پر دلالت کرتے ہیں اور کلمہ منہ اور روح منہ ذات حق تعالیٰ

سے حدود و بروز ازلی ظہور کی وضاحت کرتے ہیں۔ بعض فلاسفر کے نزدیک علم ذات حق کا باطن ہے اور کلام اس کا ظہور ہے۔ چنانچہ صوفی عبدالکریم کہتے ہیں۔ ان الکلام ھوالوجود الظاھر

نہانی از نظر اے بے نظیر از بس عیانستی
عیاں شد سرایں معنی کہ میگفتم نہانستی
گہے گویم عیانستی ۔گہے گویم نہانستی
زانیستی نہ آنستی ہم انیستی ہم آنستی

(تآنی)

انجیل جلیل میں مقدس پولوس کے الفاظ قرآن کی مذکورہ بالا اضافت کی وضاحت کردیتے ہیں۔

''انسانوں میں سے کون کسی انسان کی باتیں جانتا ہے سوا انسان کی اپنی روح کے اسی طرح خدا کے روح کے سوا کوئی خدا کی باتیں نہیں جانتا۔ روح خدا کی تہہ کی باتیں بھی دریافت کرلیتا ہے''۔ (۱۔کرنتھیوں ۲:۱۰۔۱۱)

کیوں کہ خدا اور روح ایک ہی واحد خدا ہیں اور تینوں جوہر وذات کا کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں ان تینوں میں امتیاز ضروری موجود ہے اور یہ امتیاز دو کتب سماوی انجیل وقرآن میں موجود ہے چنانچہ قرآنی اصطلاح میں ایک کا نام اللہ ہے اور دوسرے کا نام مسیح عیسیٰ کلمۃ اللہ ہے اور تیسرے کا روح اللہ ہے انجیلی اصطلاح میں ایک کا نام باپ ہے اور دوسرے کا نام کلمہ اور ابن ہے اور تیسرے کا روح القدس ہے۔ دونوں میں ذات وجوہر نہیں ہے۔

جناں باحق شدہ ملحق کہ استثنا بہ مستثنیٰ

حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں

من زقراں مغز را برداشتم
استخوان پیش سگاں انداختم

اس سلسلہ میں یہ حقیقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لفظ کلمہ تانیث کا صیغہ ہے۔ دونوں کتابوں میں یہ لفظ صیغہ مذکر میں وارد ہوا ہے۔ جس سے کہ کلمہ کی شخصیت عرضی نہیں تھی، بلکہ جوہری تھی۔ جو خدا کے ساتھ ازل سے مستقل طور پر قائم تھی۔ دونوں الہامی کتابوں میں کوئی لفظ اس سلسلہ میں ذو معنی نہیں ہے۔ دونوں کتابوں کا مفہوم صاف اور واضح ہے۔ جس میں تصرف وتحریف اور من مانی تاویل کو دخل نہیں ۔دونوں کے الفاظ ہر کہ دمہ پر صاف طور پر واضح کردیتے ہیں، کہ کلمۃ اللہ نہ صرف رسول خدا تھے (یوحنا ۱:۱۔۱۴ وغیرہ) بلکہ آپ الٰہی الاصل تھے اور خدا میں خدا۔ نور میں سے نور۔ خدا کے واحد برحق کے کلمہ تھے جو پیکر انسانی میں جلوہ گر ہوئے۔ دونوں الہامی کتابوں میں آیا ہے کہ کائنات ایں کلمہ کے وسیلہ سے پیدا ہوئی اور وجود میں آئی۔ (یوحنا ۱:۱۔۴؛ بقرہ ۱۱۷، عمران ۴۳)

یہ انجیلی آیات قرآنی الفاظ وآیات کی تفصیلی وتفسیر ہیں اور کلمہ کو ابن مریم سے مختص کرتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان میں عقل ادراک اور فہم ودانش موجود ہے۔ جس کے ذریعہ وہ غور وفکر کرکے اپنے تصورات وخیالات قائم کرتا ہے جن میں تخلیقی قوت ہوتی ہے اسی

طرح خلاق عالم کے کلمہ کی تخلیقی قوت سے کائنات وجود میں آئی اور جس طرح غیر مادی تصورات مادی الفاظ و حروف تحریر و تقریر کے ذریعہ ظاہر ہو کر کسی شخص کے بانی الضمیر کو ادا کرتے ہیں اور سب لوگوں پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ کلام کرنے والا شخص کس قسم کا انسان ہے۔اسی طرح الٰہی عقل کل کا پتہ حضرت کلمۃ اللہ کی تعلیم، زندگی، صلیبی موت اور ظفریاب قیامت وغیرہ کے ذریعہ چل جاتا ہے۔ کیونکہ آپ کی قدوس شخصیت خدا کی ذات کو منکشف کر دیتی ہے اور ہر انسان کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ خدا کی قسم کا خدا ہے اور نوع انسانی کو یقین ہو جاتا ہے کہ خدا کی ذات محبت ہے۔ مذکورہ بالا اضافت توضیحی سے صاف ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ و روح اللہ کا صدور خدا کی ذات میں سے ہے۔ یا الفاظ عقائد کلیسیا کلمۃ اللہ خدا میں ہے خدا نور میں سے نور حقیقی خدا میں سے حقیقی خدا ہے۔ کلمہ نے مجسم ہو کر انسانیت کے ساتھ حادث مگر حقیقی اتحاد اختیار کر لیا اور یوں کلمۃ اللہ ''ابن مریم ''ہو گئے۔

لایا ہے میرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں (میرؔ)

اس کو ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ روح اور جسم دو جداگانہ ماہیتیں ہیں جو ہر انسان موجود ہیں۔ کیونکہ ہر انسان ذی روح اور ذی جسم ہستی ہے اسی طرح ابن مریم میں الوہیت اور انسانیت دونوں موجود ہیں اور وہ کامل انسان تھے ۔ لیکن آپ میں الوہیت او ر انسانیت کا اتحاد تحلیل (علیٰحدہ علیٰحدہ ہونا) ہو کر ترکیب کے طور پر نہ تھا بلکہ ''ظاہر ''اور ''مظہر '' کے طور پر تھا۔ قرآن مجید میں اللہ کا ایک نام ''الظاہر '' ہے اور انجیل میں کلمۃ اللہ کا نام ''مظہر '' بار بار آتا ہے (یوحنا ۱:۱۸ وغیرہ) انشاءاللہ ہم آگے چل کر اس نکتہ پر مفصل بحث کریں گے۔

اسلامی علماء کی تاویل

(۱) مسلم علماء اور فلاسفہ بھی قرآنی الفاظ ''روح منہ '' سے مذکورہ بالا نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن قیم جوزی ''خدا کی طرف روح کی اضافت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> ''اب دو امر باقی رہ گئے ہیں۔ اول یہ کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر فرشتہ نے مریم میں نفخ (پھونکنا، ہوا سے بھرنا) کیا تھا جس طرح وہ دیگر انسانوں میں کرتا ہے تو مسیح کو روح اللہ کیوں کہا گیا؟ جب تمام ارواح اسی فرشتہ کے نفخ سے حادث ہوتی ہیں تو مسیح کی اس میں کیا خصوصیت رہی؟ دوم یہ کہ کیا حضرت آدم میں بھی اسی فرشتہ نے روح پھونکی تھی؟ یا خود خدا تعالیٰ نے جس طرح آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اسی طرح اس میں روح پھونکی تھی در حقیقت یہ دونوں سوال قابل غور ہیں۔
>
> امر اول کا جواب یہ ہے کہ جس روح کو مریم کی طرف نفخ کیا گیا یہ وہی روح ہے جو خدا کی طرف مضاف ہے اور جس کو خدا نے اپنے نفس کے لئے مخصوص کیا ہے اور یہ روح تمام ارواح میں ایک خاص روح ہے یہ روح فرشتہ نہیں ہے جو خدا کی طرف سے ماں کے پیٹ میں ہی مومن اور کافر کے بچوں کی روح پھونکتا ہے۔ بلکہ یہ روح جو مریم میں نفخ کی گئی وہ خاص روح ہے جس کو خدا نے اپنی ذات کے لئے مخصوص کیا ہے''۔

(کتاب الروح مطبوعہ دائرۃ المعارف ص ۲۴۷)

(۲) امام رازی علیہ الرحمہ آیہ کریمہ

(اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ)(سورۃ آل عمران آیت ۴۵)

کی نسبت سے لکھتے ہیں کہ

''اسْمُهُ''میں جو ضمیر ہے وہ مذکر ہے اور کلمہ کی طرف راجع (رجوع کرنے والا) ہے۔ حالانکہ وہ مونث ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص کلمہ سے مراد ہے وہ مذکر ہے۔

(جلد ۳ ص ۲۷۶)

لیکن امام صاحب نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جب اسمہ کی ضمیر کلمہ پر عائد ہوتی ہے تو کلمہ ایک ذات ٹھہرتا ہے اور یہ بشارت کلمہ کی ذاتیت کو ظاہر کرتی ہے۔ دران حالیکہ جس کلمہ کی خوشخبری دی گئی وہ خدا کی طرف سے ذات ہے تو غور اس بات پر کرنا چاہیے کہ اس صورت میں یہ ذات کیا ٹھہری؟ انجیل جلیل کے تمام صحائف بیک زبان اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ ذات الوہیت ہے جو اس ذات میں اپنی تمام معموری کے ساتھ موجود تھی۔ جس کو قرآن مجید میں کلمہ منہ اور روح منہ کا نام دے کر ممتاز کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اس ذات کا امتیازی نشان ہو۔ پس یسوع المسیح نبی ہیں مگر دیگر انبیاء کی مانند نہیں ہیں۔ آپ مسیح ہیں مگر دوسرے ممسوحوں کی مانند نہیں بلکہ آپ بالخصوص المسیح ہیں جن کا نسب کل نسل انسانی سے اعلیٰ اور بالا ہے جو دونوں جہانوں میں مرتبہ عزت اور جلال والے ہیں۔ جنھوں نے مہد (ماں کی گود) ہی سے اپنی رسالت کا اعلان کر دیا اور فرمایا

(قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا)(سورۃ مریم آیت ۳۰)

میں خدا کا ہوں جس نے مجھے کتاب انجیل دی اور نبی بنایا ہے۔

اس حقیقت کا امام رازی کو بھی اقبال ہے کہ

یہ ایک ایسی شریف فضیلت ہے جو صرف آپ کو ہی حاصل ہوئی اور کسی دوسرے نبی کو نہ تو آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد حاصل ہوئی۔

(جلد ۳ ص ۶۹۱)

بعض معترض امام رازی کی تقلید کر کے کلمۃ اللہ کی جو تاویل کرتے ہیں وہ بعید از حقیقت ہے دراصل اس کو تاویل نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ پہلو تہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ معترضین (اعتراض کرنے والے) کی زبان بھونڈی لیکن امام صاحب کو نہایت لطیف ہے امام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کلمۃ اللہ بغیر نطفہ کے یا کسی دوسرے وسیلہ کے حکم قدرت خدا سے پیدا ہوئے اسی طرح ابوالبشر آدم اور دیگر مخلوقات بھی ابتدا میں وجود میں آئے۔ پس المسیح میں کوئی فضیلت یا خصوصیت نہیں رہتی۔ اس قسم کے معترضین بھی حقیقت بالائے طاق رکھ کر بھول جاتے ہیں کہ قرآن مجید نہ تو حضرت ابوالبشر کے اور نہ کسی دوسرے مخلوق کے حق میں کہ وہ کلمۃ اللہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ آدم اور عیسیٰ ناصری دونوں بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن اس کے باوجود مسیح ناصری آدم سے اس نسبت کے سبب کہ وہ خاص کلمہ منہ اور روح منہ ہیں، ممتاز کئے گئے ہیں امام صاحب کی تاویل کے مطابق آدم بھی کلمہ منہ اور روح منہ ٹھہرتا ہے لیکن قرآن آدم کو کلمہ منہ بھی نہیں ٹھہراتا۔ پس امام صاحب کے لئے یہ بہتر ہوتا کہ آپ ولادت مسیح کی بابت اس بھید کے لحاظ سے (جو اس الٰہی نسبت کلمہ منہ و روح منہ میں پوشیدہ ہے) اس طور سے استدلال کرتے کہ یہ الٰہی نسبت عیسیٰ مسیح ناصری کے بن باپ پیدا ہونے کے باعث ہے اس کے برعکس آپ نے یہ دلیل دی کہ آپ کی صادق عادت پیدائش اس نام یعنی کلمۃ اللہ کا سبب ہے لیکن آنخداوند نے بغیر باپ کا پیدا ہونا یہ لازم نہیں ٹھہرتا ان کو یہ نام دیا جائے جیسا کہ خلق آدم کے موقعے پر ابوالبشر کے یہ نام نہیں دیا گیا تھا۔ کم

از کم ہر مومن ایماندار مسلمان پر یہ بات عیاں ہو جانی واجب ہے کہ قرآن مجید میں المسیح کو جو اللہ کی طرف بطور کلمہ منہ اور روح منہ نسبت دی گئی ہے۔ وہی آپ کے خلاف قاعدہ طبعی پیدا ہونے کا حقیقی سبب اور علت ہے۔

(۳) قرآن مجید میں جیسا متذکرہ بالا آیہ شریفہ میں لکھا ہے۔ حضرت عیسیٰ مسیح کو روح من اللہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ امام رازی اس کی تفسیر میں لکھتا ہے کہ وہ روح ہے دیگر ارواح شریفہ، عالی اور قدس میں سے ہے جس کو خدا نے اپنی طرف شریف و تعظیم کے لئے نسبت کی ہے اور اس آیہ کے باقی الفاظ ابد تک بروح القدس سے مراد یہی ہے۔ روح عالیہ ہے لیکن نہ تو امام صاحب نے اور نہ ان کے مقلدوں (تقلید کرنے والا، پیرو) نے اس بات پر غور کیا کہ یہ تاویل ان کو مشکل میں ڈالے گی۔ کیونکہ اگر مسیح روح ہے خدا سے یعنی "ارواح شریفہ قدسیہ اور عالیہ میں سے" جس کو خدا نے ایسی شرف و عزت و عظمت بخشی ہے کہ اس کو اپنے نفس کی جانب منسوب کر لیا ہے تو وہ روح القدس کون سی تھی جس کی نسبت لکھا ہے کہ "مدد کی ہم نے تجھ کو روح پاک سے"؟ کیا وہ روح القدس سے مدد دیتا ہے؟ اور کیا مسیح جو یہی روح سے مدد دی جائے، جو اس کو نشانی اور معجزات کرنے کی قدرت دے؟ ہر صاحب عقل اس سوال کا جواب نفی میں دے گا کیونکہ یہ امداد فقط اس شخص کے لیے ہی جائز ٹھہرتی ہے جو خدا کی روح میں سے نہ ہو یعنی جو روح منہ نہ ہو لیکن قرآن مجید صاف الفاظ میں المسیح کو روح منہ کہتا ہے پس یہ تاویل غلط ہے اور روح منہ وہ ہے جو کہ خدا سے صادر ہے۔ نہ کہ جو "دیگر ارواح شریف اور قدس سے ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے یہ روح جس سے خدا نے اپنے مسیح کو مخصوص کیا جو دیگر انبیاء اور مرسلین کو بھی عطا ہوئی اور قرآن کا قول روح منہ عبث ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کا قول عبث نہیں ہو سکتا پس اس وجہ سے مراد ہر گز نہیں نعمت نہیں ہو سکتی لہٰذا اس سے مراد ذات ہے اور روح منہ کا الٰہی ذات سے صادر ہونا ثابت ہو گیا اور یہی جیسا ہم سطور بالا میں کہہ آئے ہیں۔ انجیل جلیل فرماتی ہے۔ انجیل کی اصطلاح میں آنخداوند کلمۃ اللہ ابن اللہ ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں آپ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں اور دونوں کتب سماوی اس امر پر متفق ہیں کہ آپ خدا کی ذات میں سے صادر ہیں۔

بعض احباب لفظ "ابن" پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ ان اعتراضات کا جواب رسالہ ابوت خداوندی اور ابنیت مسیح میں دے چکے ہیں اور معترض کی توجہ اس کتاب کی جانب مبذول کرتے ہیں دیگر احباب بار بار یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ مسیح کو رسول کہو۔ ان کو ابن نہ کہو۔ جواباً عرض ہے کہ آنخداوند نہ صرف رسول اللہ ہیں بلکہ کلمۃ اللہ اور ابن اللہ بھی ہیں اور یہ دونوں کتب سماوی انجیل و قرآن کی متفقہ (اتفاق کیا ہوا) آواز ہے (لوقا ۱:۲۵) انجیل جلیل میں بار بار آتا ہے کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ (یوحنا ۱۷:۳؛ ۳:۱۷ وغیرہ) اور بار بار یہ بھی آیا ہے کہ آپ ابن اللہ ہیں (لوقا ۱:۳۳؛ مرقس ۱:۱؛ لوقا ۱:۲۵ وغیرہ) کیا ایک واحد شخص بیک وقت رسول اللہ اور ابن اللہ نہیں ہو سکتا؟ مثال کے طور پر کیا کوئی بادشاہ یا ملک کا حاکم اپنے بیٹے کو بطور سفیر کسی دوسرے حاکم ملک کے پاس نہیں بھیج سکتا؟ کیا وہ بیک وقت رسول اور ابن ملک نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک مثال سے ظاہر ہے کہ حضرت کلمۃ اللہ بدرجہ احسن خدا باپ کی رضا اور ارادہ کو جانتے تھے، کیوں کہ آپ خدا سے نکلے تھے اور رسولوں اور نبیوں سے بڑھ چڑھ کر الٰہی پیغام محبت و نجات کو بنی نوع انسان پر واضح کر سکتے تھے۔ دیگر نبی صرف مرسل اور فرستادے (قاصد، ایلچی) تھے۔ لیکن آپ خدا کے ابن وحید تھے۔ انجیل جلیل سے ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ کی حساس طبعیت کو اس فرق کا کامل احساس تھا (مرقس ۱۲:۱۔۱۲؛ متی ۲۱:۲۳۔۴۶؛ لوقا ۲۰:۹۔۱۹)۔

ہم کو امید واثق سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ اہل کتاب لاتغلوا فی دینکم اپنے دین میں مبالغہ نہیں کرتے بلکہ وہی بات کہتے ہیں جو قرآن و انجیل دونوں کتب سماوی کہتی ہیں۔ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے گو قدرتاً الفاظ اور اصطلاح میں فرق ہے۔ اہل انجیل اپنے دین میں مبالغہ کے مرتکب نہیں ہیں۔ بیضاوی بھی کہتا ہے کہ

مسیح صاحب روح ہیں جو خدا سے صادر ہوئی نہ بوسیلہ اور نہ قاعدہ طبعی سے اور نہ مادہ سے۔

اور یہی عقیدہ مسیحی کلیسیا کا عقیدہ ہے کہ روح القدس کی ذات میں سے ہے صادر ہوا جو انجیلی اصطلاح ہے اور خود کلمۃ اللہ کی زبان حقیقت ترجمان کی ترجمان ہے (یوحنا۱۵:۲۶)۔ کلمۃ اللہ نے اپنی نسبت آخری شب خدا سے دعا مانگتے وقت فرمایا "اے باپ تو اس جلال سے جو میں دنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے سے رکھتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ جلالی بنادے۔۔۔۔ تو نے بنائے عالم سے پیشتر مجھ سے محبت رکھی (یوحنا۱۷:۵، ۲۴؛ افسیوں ۱:۴؛۱۔ پطرس ۱:۲۰) پھر آپ نے فرمایا "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرے۔ (متی ۱۱:۲۷؛ یوحنا ۱:۸؛ ۶:۴۶؛ ۷:۳۹؛ ۸:۱۷؛ ۱۷:۲۵؛ ۱۰:۱۵ وغیرہ) یہ ان آیات بینات (روشن دلائل) میں القاب کلمہ منہ وروح منہ کی صحیح تفسیر ہے جو خود کلمۃ اللہ اور روح اللہ نے فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر آپ کا فرمودہ ہونے کی وجہ سے قطعی صحیح ہے۔ جس کو قرآنی آیہ نسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون کے مطابق ہر مومن مسلمان کو تسلیم کرنا لازم ہے۔

وجھا فی الدنیا والاخرۃ کی انجیلی تفسیر

(اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ) (سورۃ آل عمران آیت ۴۵)

سورۃ آل عمران کی مذکورہ بالا آیت میں جبرئیل فرشتہ ام المومنین حضرت بی بی مریم صدیقہ کو بشارت دیتا ہے کہ آپ کا مولود قدوس نہ صرف خدا کا کلمہ اور خدا کا روح ہوگا بلکہ وہ:- "دنیا اور آخرت میں خوشنما، خوش رو اور رونق دار چہرے والا ہوگا اور وہ خدا کے مقربین میں سے ہوگا جس کو خدا کی خاص قربت حاصل ہوگی۔

قرآن کا یہ خطاب کلمۃ اللہ کے خصائل وشمائل (عادتیں) کے اعلیٰ ترین مدارج اور حضرت روح اللہ کی روحانیت کے اوج (بلندی) کا مظہر ہے۔ آپ کا مبارک چہرہ رونق دار اور خوش نما تھا اس حقیقت کا ذکر اناجیل میں پایا جاتا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ :-

"یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور ان کو لے کر ایک اونچے پہاڑ پر دعا کرنے گیا۔ جب وہ دعا کر رہا تھا تو ایسا ہوا کہ تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی اور اس کا چہرہ آفتاب کی مانند چمکا اور اس کی پوشاک نور کی مانند سفید ہوگئی۔ (لوقا ۹:۲۸۔۳۶)

قارئین کو یاد ہوگا کہ حضرت موسیٰ نے خدا سے کوہ سیناپر منتِ عرض کی تھی کہ مجھے اپنا جلال دکھا۔ لیکن خدا نے اس کو فرمایا تھا تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا (خروج ۳۳:۱۸۔۲۰)۔ لیکن ارض مقدس کے پہاڑ پر خداوند کے رسولوں کی آنکھوں نے آپ کا پر نور "جلال دیکھا اور بادل نے آکر ان پر سایہ کیا اور جب وہ بادل میں گھرنے لگے تو ڈر گئے اور بادل میں سے ایک آواز آئی کہ یہ میرا برگزیدہ بیٹا ہے۔ اس کی سنو" (لوقا ۹:۳۲۔۳۵)۔

تب کلمۃ اللہ کا چہرہ ایسا چمکتا تھا جیسے تیزی کے وقت آفتاب (مکاشفہ ۱:۱۶)

تو بدیں جمال وخوبی بر طور گو خرامی
ارنی بگوید آنکس کہ بگفت لن ترانی

کلمۃ اللہ کے چہرے کی یہ رونق قربت الٰہی اور روحانی خوشی کا مظہر (یوحنا ۱۵:۱۱؛ ۱۷:۱۲؛ ۱:۱۴ وغیرہ) ہونے کی وجہ سے ہمیشہ خوشنما اور دلکش تھی (یوحنا ۱۵:۱۱؛ لوقا ۴:۱) کیونکہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ قربت خداوندی میں گزرتا تھا (لوقا ۱۱:۱؛ ۹:۲۸؛ یوحنا ۸:۱۶؛ ۸:۲۹؛ ۱۷:۱۔۵؛ ۱۶:۳۲؛ مرقس ۹:۱۸ وغیرہ)

چنانچہ مقدس پطرس اس چشم دید واقعہ کے سالہا سال بعد لکھتا ہے کہ :

''جب ہم نے تم کو اپنے جنابِ مسیح کی قدرت اور آمد سے واقف کیا تھا کہ دغا بازی کی گھڑی ہوئی کہانیوں کی پیروی نہیں کی تھی بلکہ خود اس کے جلال کی شوکت کی عظمت و شوکت کو دیکھا تھا کہ اس نے خدا باپ سے اس وقت عزت اور جلال پایا جب اس افضل جلال میں سے یہ آواز آئی کہ یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں اور جب ہم اس کے ساتھ مقدس پہاڑ پر تھے تو آسمان سے یہی آواز سنی ''(۲۔پطرس ۱: ۱۶۔۱۸)

اور چشم دید گواہ مقدس یوحنا فرماتا ہے ۔کلام فضل اور سچائی سے معمور ہو کر انسانوں کے درمیان خیمہ زن رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا ،جو صرف باپ کے ابن وحید کی شان کے ہی شایاں ہے (یوحنا ۱: ۱۴)

کلمۃ اللہ ''دنیا کی پیدائش سے پیشتر خدا کے جلال میں تھے ''۔رفع آسمانی کے بعد خدا نے اپنے کلمہ کو اپنی قربت سے جلالی بنا کر (یوحنا ۱۷: ۵)اس ذی شان کو مالک اور منجی ٹھہرا کر اپنی قدرت کے دہنے ہاتھ پر سر بلند کیا تا کہ بنی نوع انسان کو توبہ کی توفیق اور گناہوں کی معافی بخشے ۔(اعمال ۵: ۳۱) یہ ہے قرآنی آیہ بالا کی انجیلی تفسیر جس میں کلمۃ اللہ ،روح اللہ وابن اللہ کے دنیا اور آخرت کے روحانی کمالات اور اعلیٰ مدارج و مراتب درج ہیں۔ایک معترض نے لکھا ہے کہ قرآن مجید حضرت موسیٰ کے لئے عنداللہ وجیہہ آیا ہے پس آنخداوند کی اس سے کوئی کمال و خوبی ثابت نہیں ہوتی۔جواباً عرض ہے کہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں وجاہت (چہرے کی رونق ،عزت) سے مراد معرفت اور عرفان لیا ہے ۔لیکن بیضاوی نے المسیح کے لئے لکھا ہے کہ اس دنیا میں وجاہت کا مفہوم نبوت اور دوسری دنیا میں شفاعت کیا ہے ۔رازی بھی اس تفسیر کی حمایت کرتا ہے اور زمخشری کشاف میں لکھتا ہے کہ اس دنیا میں وجاہت سے مراد نبوت اور تقدم و تفوق (برتری) ہے ۔بالفاظ دیگر خداوند مسیح کو اس دنیا میں بنی نوع انسان پر تفوق اور کل انبیا پر فضیلت حاصل ہے اور اس دنیا میں وہی شفیع عاصیاں ہوں گے اور یہ تاویل و تفسیر انجیل جلیل کے مطابق بھی ہے (عبرانیوں ۷: ۲۵وغیرہ)

ایک اور امر غور ہے کہ جس طرح القاب کلمۃ اللہ اور روح اللہ قرآن مجید میں کسی دوسرے انسان اور نبی کے لئے وارد نہیں ہوئے اسی طرح وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ سوائے المسیح کی ذات کے کسی دوسرے شخص کے لئے وارد نہیں ہوئے۔ناظرین کو یاد ہو گا کہ قرآن میں آیا ہے کہ ''تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ کا چہرہ ،شکل یا نور ہے '' وجهِ '' لفظ ''وجہ'' سے مشتق ہے ۔جس کے معنی ہیں چہرہ ،صورت ۔پس جب آنخداوند کو '' وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ '' کہا گیا ہے تو قرآن کا مطلب ہے کہ ''آپ کی صورت کو خدا نے اپنی صورت پر آدم کی طرح پیدا کیا (پیدائش ۱: ۲۷؛لوقا ۱: ۳۵)اور آپ خدا کی صورت ہیں (۲۔کرنتھیوں ۴: ۴)اور ان دیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ''ہیں (کلسیوں ۱: ۵)۔لفظ ''وجھ ''وجہ سے مشتق اور صفت مشبہ ہے ۔یہ جو معترض صاحب نے لکھا ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰ کی نسبت بھی ''وجیہہ ''آیا ہے صحیح ہے لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کر گیا ہے کہ المسیح کے متعلق '' وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ '' آیا جو آنخداوند کا امتیازی نشان ہے اور نہ موسیٰ کے لئے اور نہ کسی دوسرے انسان کے لئے قرآن میں آیا ہے۔

مسیح ابن اللہ

(۱)

سطور بالا میں ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ''کوہ مقدس کے افضل جلال'' میں سے اللہ جل شانہ کی آواز نے خداوند کے تین رسولوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:۔

''یہ میرا برگزیدہ ابن ہے جو میرا محبوب ہے جس سے میں خوش ہوں۔اس کی سنو''(لوقا۹:۳۵؛۲۔پطرس ۱:۱۷)

بعنیہ یہی آواز اور خطابات (یعنی برگزیدہ ابن اور محبوب ربانی) خداوند مسیح کے بپتسمہ کے وقت سنائی دیتے تھے (متی ۳:۱۷) جب ''آسمان کھل گیا اور ''روح القدس جسمانی صورت میں'' آپ پر نازل ہوا (لوقا ۳:۳۲)

پس خود خدائے عزوجل نے مسیح کو خطاب ''برگزیدہ بیٹا'' عطا فرمایا۔اس لقب کا وہی مطلب ہے جو قرآن میں ''روح اللہ'' کے لقب سے مراد ہے۔ جہاں قرآن میں آیا ہے کہ فرشتے نے صدیقہ کو بشارت دی کہ خدا اس کو روح اللہ عطا کرے گا۔وہاں انجیل میں آیا ہے کہ فرشتہ نے بشارت دیتے وقت مقدسہ کو کہا تھا کہ اس کا مولود مسعود (خوش نصیب، مبارک) عظیم المرتبت (درجہ، مرتبہ) ہوگا اور خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا (لوقا ۱:۳۲)۔آپ کے پیش رو یوحنا اصطباغی (یحییٰ) نے قوم یہود کو کہا کہ:۔

''یہ خدا کا بیٹا'' (یوحنا ۱:۳۴)۔

اصطباغ کے وقت خدا نے فرمایا:۔

''تو میرا بیٹا ہے جو میرا محبوب ہے تجھ سے میں خوش ہوں''۔

مقدس یوحنا انجیل نویس کہتا ہے کہ آپ ''خدا کے ابن وحید اور باپ کے مقرب ترین ہیں'' (یوحنا ۱:۱۸)۔

خود کلمۃ اللہ کی زبان صداقت بیان نے فرمایا کہ آپ کہ آپ ''خدا کے ابن ہیں (یوحنا ۳:۳۵۔۳۶؛ متی ۱۱:۲۷ وغیرہ)

کلمۃ اللہ تمام لوگوں کو دعوت عام دیتے ہیں کہ وہ ''خدا کے بیٹے پر ایمان لائیں (یوحنا ۱۰:۲۶)۔

آپ کے حوارئین اور دوازدہ رسول جو صاحب وحی والہام تھے (سورۃ المائدہ ۱۱۱) خدا کے خاص الہام سے آپ کو ''زندہ خدا کا بیٹا مسیح'' مانتے ہیں (یوحنا ۱۶:۱۶۔۱۹)۔

مقدس پولوس لکھتے ہیں کہ ''آپ قدرت کے ساتھ خدا کے بیٹے تھے'' (رومیوں ۱:۴ وغیرہ)

غیر یہود رومی اقرار کرتے ہیں کہ آپ خدا کے بیٹے تھے (مرقس ۱۵:۳۹) خود ابلیس لعین (لعنتی) اور اس کے چیلے چانٹے تک اقبال کرتے ہیں کہ آپ خدا کا بیٹا ہیں (متی ۴:۳؛۸:۲۹ وغیرہ)

مسیحی کلیسیائے جامع نزول قرآن سے صدیوں پہلے ابتدا ہی سے اقرار کرتی چلی آتی ہے آپ خدا کا بیٹا ہیں اور رسول عربی کی بعثت کے زمانہ میں قبائل عرب جو مسیحی تھے یہی شہادت دیتے تھے کہ ''آپ المسیح ابن اللہ'' ہیں۔چنانچہ قرآن اس حقیقت کا گواہ ہے کہ ''آپ المسیح ابن اللہ'' ہیں۔

(وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ) (سورۃ التوبہ آیت ۳۰)

''یعنی عیسائی دنیا یہی کہتی ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے''۔

(۲)

مذکورہ آیات سے ظاہر ہو گیا کہ اہل یہود میں (جو کٹر موحد تھے) خطاب ''ابن اللہ'' کفر و شرک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس خطاب سے نہ تو شرک ٹپکتا تھا اور نہ کفر کی بو آتی تھی، لیکن قرآن اس یہودی اور مسیحی اصطلاح کو استعمال نہیں کرتا کیونکہ عرب کے مشرکین اور بت پرست اپنے معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کی نسبت سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ جسمانی طور پر اللہ کے اور دیگر کے اور دیگر معبودوں کے بیٹے بیٹیاں ہیں (سورۃ مریم ۹۱۔ ۹۲)۔ وہ فرشتوں کو بھی خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں اور عرفی معنوں میں اپنے دیوتاؤں کو خدا کے بیٹے مانتے تھے۔ اندریں حالات خدشہ تھا کہ عرب مسلمان جوان مشرکوں میں سے نکل کر خدا اور رسول پر ایمان لاتے تھے، وہ شرک و کفر کے خیالات کو مومنین کی جماعت میں نہ لے آئیں۔ پس قرآن نے اس خطاب کو استعمال نہ کیا، بلکہ اس کی جگہ ''روح اللہ'' کا خطاب مستعمل کیا بکس کا قرآنی مفہوم وہی ہے جو انجیل میں ''ابن اللہ'' کا ہے (متی ۳: ۱۷)۔

پس گو قرآن نے لفظ ''ابن'' کا استعمال ترک کر دیا، لیکن اس نے اسکے معنی اور مفہوم کو برقرار رکھا۔ ہم سطور بالا میں بتلا آئے ہیں کہ دونوں کتب سماوی انجیل و قرآن کا مطلب واحد ہے صرف اصطلاحات دو ہیں۔ دونوں اصطلاحوں سے یہ مترشح (ٹپکنے والا) ہے کہ ابن اللہ کا وہ مقام ہے جو فوق البشری ہے گو دونوں کتب ربانی مسیح کو بشر مانتی ہیں۔ (سورۃ مائدہ ۷۹؛۱۔ تیمتھیس ۲: ۵) لیکن کو دونوں آسمانی کتابیں مسیح کو مانتی ہیں وہ یہ بھی مانتی ہیں کہ کوئی دوسرا خاکی انسان ضعیف البنیان (جس کی بنیاد کمزور ہو) اس مقام پر نہیں پہنچا اور نہ پہنچ سکتا ہے۔

دنیا کے مشرکوں کی طرح انجیل کسی کو بھی اللہ کی صاحبہ اور ''جورو'' نہیں مانتی اور نہ کلمۃ اللہ کو ولد اللہ اور اللہ تعالیٰ کو کسی کا والد مانتی ہے۔ اللہ کی ذات پاک اس قسم کے رشتہ اور تعلق سے منزہ ہے۔ قرآن کی طرح انجیل بھی کہتی ہے۔

''اللہ ایک ہے جو واجب الوجود ہے نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ خود کسی سے جنا گیا ہے اس کے جوڑ کا کوئی نہیں'' (سورہ اخلاص)۔

دونوں کتب سماوی اللہ کی کوئی بیوی تجویز نہیں کرتیں اور دونوں ایسے مشرکانہ تصور کو کفر قرار دیتی ہیں۔ کلیسیائے جامع نے گذشتہ دو ہزار سالوں میں ہر قسم کے مشرکانہ تصورات اور الفاظ سے قطعی اجتناب کیا ہے اور لفظ ''ابن'' کو اللہ کے ساتھ بعینہ اسی طرح ترکیب دی ہے جس طرح قرآن میں لفظ ابن کو مختلف الفاظ کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن السبیل بمعنی مسافر (بقر ۲۷) ام الکتاب (عمران ۵؛ انعام ۹۲) ام القریٰ وغیرہ الفاظ ابن الوقت ابن الارض ابن سحاب وغیرہ میں لفظ ''ابن'' مجازی اور غیر حقیقی مناسبت کو مد نظر رکھ کر استعمال کیا گیا ہے۔ بعینہ اس طرح خطاب ''ابن اللہ'' استعارہ کے طور پر انجیل جلیل میں مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ مولوی ثناء اللہ مرحوم تک کو اس حقیقت کا اقبال ہے اور وہ لکھتے ہیں۔

''لفظ ابن اللہ انجیل کے خاص محاورہ میں عبد اللہ کے معنی میں آیا ہے''

(اہل حدیث ۱۰ جولائی ۱۹۴۲ء) ص ۴

مرحوم مر گئے لیکن انجیل کے خاص محاورہ کو آپ نے کبھی سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کی انجیل جلیل میں المسیح کو حقیقی اور اصلی و داخلی اور باطنی فقید المثال نسبت و اضافت کی جہت سے ابن اللہ کہا گیا ہے۔ آپ علم اور کلمۃ اللہ کی جہت سے ابن اللہ ہیں۔ تو افلاطونی فلاسفر فائلو نے علم اللہ یا کلمۃ اللہ کو ابن اللہ کہا ہے امام غزالی کسی مصنف کی کتابوں کر اس کی باطنی اولاد کہتے ہیں۔ اہل عرب خود خیال کو بنت الفواد یعنی دل کی بیٹی کہتے ہیں۔ تو کس قدر افضل طور پر المسیح خدا کی حکمت و شعور، عقل و دانش اور علم و کلام کی حیثیت سے ابن اللہ اور ابن وحید کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ المسیح کلمۃ اللہ ذات حق سے ازلی ظہور و بروز و صدور کے اعتبار سے ابن اللہ ہیں۔ علم اللہ اور کلمۃ اللہ میں ازل سے سب کلمات اور تمام موجودات موجود تھیں اور موجود ہیں یعنی وجود ذہنی کے لحاظ سے انجیلی اصطلاح ''ابن اللہ'' ایک نہایت لطیف محاورہ ہے۔ ایں خطاب سے مراد ہے

کہ کلمۃ اللہ نے ہر امر میں اپنی مرضی کو زندگی کی ادنیٰ ترین تفاصیل میں رضائے الٰہی کے ایسا تابع کر دیا تھا کہ دونوں کی رضا ایک اور واحد رضا اور دونوں کی مرضی ایک اور مرضی تھی۔آپ کی انفرادی رضا فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے بلند اور رفیع مقام پر پہنچ چکی تھی (یوحنا۵:۳۶؛۹:۴؛فلپیوں ۲:۶ وغیرہ)۔

خود قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ فی نفسہ کسی کو ''ابن اللہ'' کہنا غلط نہیں ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

(لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ)(سورۃ زمر آیت ۴)

یعنی اگر خدا کو یہ پسند آیا کہ کسی کو فرزندی میں قبول فرمائے تو اپنے مخلوق میں سے جس کو چاہتا جن لیتا۔ وہی پاک اور اکیلا ہے۔

صرف کلمۃ اللہ کی ہستی اسی واحد فوق البشری معصوم انسانی ہستی سے جو بالتخصیص اس شرف کے لائق ہے چنانچہ مقدس لوقا انجیل نویس ہم کو بتلانا ہے کہ:۔

اللہ تعالیٰ کو یہ پسند آیا کہ ابن مریم جیسے قدوس مولود کے ہیں ''باپ کی نسبت سوائے اپنی ذات پاک کے کسی مخلوق شے سے نسبت نہ دے لہٰذا خدا نے خود نے فرشتہ کی معرفت مسیح کو ''ابن اللہ کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ابن اللہ کی ذات منبع موجود ہوئی ایسا کہ ''جتنوں نے اس کو قبول کیا اس نے ان کو خدا کے فرزند بننے کا حق عنایت فرمایا۔(یوحنا۱:۱۲)

پس کل عالم کے ایماندار حضرت ابن اللہ کی ذات پاک کی طفیل رعایتہ ''خدا کے فرزند'' ٹھہرے۔ صرف کلمۃ اللہ ہی بنی نوع انسان میں ایک واحد فرد ہیں جو استحقاقاً ابن اللہ ہیں اور خدا کی گود میں ہیں (یوحنا۱:۱۸)

جیسا کہ مقدس پولوس لکھتے ہیں:۔

''باپ کو پسند آیا کہ اس کی ساری معموری ابن اللہ ہی میں سکونت کرے''(کلسیوں ۱:۱۹)۔

(۳)

جو مسلمان سلوک کی اعلیٰ منازل پر پہنچ چکے ہیں وہ یہودی اور مسیحی اصطلاح ''ابن اللہ'' سے فائدہ اُٹھا کر نڈر ہو کر کہتے ہیں اولیا اطفال حق انداے سپر اور

ابو بکر شبلی فرماتے ہیں۔

الصوفیہ اطفال فی حجر الحق یعنی صوفیا خدا کی گود میں ہیں

(رسالہ قشیریہ)

یہ اصطلاح انجیل (یوحنا۱:۱۸) سے اخذ کی گئی ہے۔قرآن میں بھی آیا ہے۔

(فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا)(سورۃ البقرۃ آیت ۲۰۰)

یعنی خدا کی یاد اس طرح کرو جیسے اپنے باپوں کی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کرو۔

دونوں کتب سماوی کے پڑھنے والوں پر یہ ظاہر ہے کہ ابن اللہ کا تمام وجود جن، انس، ملائکہ اور مخلوقات میں افضل ترین ہے صرف ابن اللہ ہی خدا کا کلمہ اور روح ہیں اور '' وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ '' ہیں لہٰذا وہی صرف اس شرف کے سزاوار ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص اکلوتے بیٹے ہوں کیونکہ

عدیم است عدیش جو خداوند کریم

چونکہ ہم نے اس موضوع پر اپنے رسالہ ''ابوت الٰہی اور ابنیت مسیح میں مفصل بحث کی ہے ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اہل کتاب اور اہل قرآن میں جو نزاع (تکرار) ''ابن اللہ'' کی اصطلاع پر ہے وہ محض لفظی اختلاف پر مبنی ہے۔

کلمۃ اللہ خدا کی قدرت اور حکمت

(۱)

انجیل جلیل میں کلمۃ اللہ سے چند اور خطابات منسوب ہیں جن میں سے ہم بعض کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:۔

اول لکھا ہے کہ کلمۃ اللہ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے اور دوم کہ کلمۃ اللہ خدا تعالیٰ کی حکمت ہے چنانچہ مقدس پولوس رسول لکھتے ہیں۔

''مسیح خدا کی قدرت اور خدا کی حکمت ہے''(۱۔کرنتھیوں ۱: ۲۴)۔

اس انجیلی آیہ شریفہ میں اسی قسم کی اضافت توضیحی موجود ہے جو قرآنی آیات میں پائی جاتی ہے۔ جن میں کلمۃ اللہ کو منہ اور روح منہ لکھا ہے۔ ہم اس اضافت پر سطور بالا میں مفصل بحث کر آئے ہیں، پس انجیلی آیات بالا میں خطابات ''خدا کی قدرت اور خدا کی حکمت'' سے مراد وہ قدرت مطلق اور حکمت مطلق مراد ہے۔ جو خدا سے اور صرف خدا کی ذات سے منسوب ہے دونوں کتب سماوی انجیل و قرآن میں بار بار خدا تعالیٰ کی قدرت مطلق اور حکمت مطلق کا ذکر آیا ہے۔ پس ان مقامات کے حوالے دینا تحصیل حاصل ہے، یہ قدرت مطلق اور حکمت مطلق اس ذات سے ہی منسوب ہے جو قادر مطلق اور حکیم مطلق ہے اور جس کی شان میں لیس کمثلہ شی آیا ہے۔ پس سوائے کلمۃ اللہ کے اور کوئی غیر اللہ اور کوئی دوسرا مخلوق خدا کی قدرت و حکمت میں شریک نہیں کیا گیا اور یہ ہر دو کتب سماوی انجیل و قرآن پر صادق آتی ہے انجیل جلیل میں کلمۃ اللہ اور صرف کلمۃ اللہ اس صفت اولیٰ سے موصوف کئے گئے ہیں۔ دوسرا کوئی نفس اس میں شریک نہیں کیا گیا کیونکہ صرف المسیح خدا کی حکمت و دانش ہیں (امثال باب ۸)۔ پس آپ حکمت اللہ و دانش خدا اور علم اللہ کی جہت سے کلمۃ اللہ ہیں آپ کلیتہ خدا کی حکمت و دانش اور ذات حق کا علم نہیں در حقیقت علم اور کلمہ ایک ہی شے کے دو رخ اور دو نام ہیں۔ ذات کے بطون (بطن کی جمع، کسی شے کا اندرونی حصہ) میں مخفی ہونے کے پہلو سے جو علم اللہ ہے وہی ظہور ہے دبروز ہونے کے پہلو سے کلمۃ اللہ ہے۔ پس خداوند المسیح علم اللہ اور کلمۃ اللہ ہونے کی بنا پر الٰہی ذات کے باطن و ظاہر، اول و آخر اور الفا اور امیگا ہیں ۔ کلمۃ اللہ کائنات علم اور تجسم میں علی فرق مراتب بقدر حیثیت انسانی ہر دو ظاہر ہیں پس مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح خدا باپ قادر مطلق اور حکیم مطلق ہے۔ کیونکہ دونوں کی ذات اور جوہر واحد ہے۔

(۲)

مذکورہ بالا قدرت مطلق قرآن و بائبل میں صرف خدا سے ہی منسوب ہے۔ کوئی غیر اللہ اس صفت میں بھی خدا کا شریک نہیں ہو سکتا (متی ۶: ۱۳) کیوں کہ خدا کی یہ صفت ازلی ہے (رومیوں ۱: ۲۰)۔

اہل یہود خوف اور بہشت کے مارے خدا کے مارے خدا کا اسم اعظم ''یہوہ'' زبان پر نہیں لاتے تھے اور اکثر اوقات جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے یا اس سے دعا کرتے تھے تو خدا کو دوسرے ناموں سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ یہودی کتب مقدسہ میں لفظ ''نام'' سے مراد ''خدا کی ذات'' ہے۔ پس یہود اسم اعظم ''یہوہ'' کہ قدرت کو یہی منظور تھا اور زبور کی کتاب میں آیا ہے۔

''خدا نے ایک بار فرمایا اور میں نے دو بار سنا کہ قدرت صرف خدا ہی سے منسوب ہے'' (زبور ۶۲: ۱۲)۔ کیوں کہ صرف اسی ایک صاحب قدرت و صاحب حکمت نے کلام (کلمہ) کے ذریعہ کائنات کو خلق کیا (یرمیاہ ۵۱: ۴؛ زبور ۶: ۳۲؛ یوحنا ۱: ۳)۔

پھر خاص قدرت ابن اللہ کو حاصل تھی۔ چنانچہ انجیل میں عبرانیوں کے خط کا مصنف لکھتا ہے کہ ''ابن اللہ خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش ہو کر سب چیزوں کو جو اس کے ذریعہ پیدا ہوئیں تو اپنی قدرت کے کلمہ سے سنبھالتا ہے'' (عبرانیوں ۱: ۳) کیوں کہ ابن اللہ مردوں میں سے جی اُٹھنے کے سبب سے قدرت کے ساتھ خدا کا بیٹا ٹھہرا'' (رومیوں ۱: ۴)۔

یہ مطلق قدرت اور مطلق اختیار باپ کی طرف سے بیٹے کو بخشا گیا ہے اسی نے اس کو:-

''ہر بشر پر اختیار بخشا ہے تاکہ وہ سب کو زندگی عطا فرمائے'' (یوحنا ۱۷: ۲)۔

ابن اللہ کو یہ قدرت اور اختیار مطلق نہ صرف بشر پر حاصل ہے بلکہ آپ کو کل کائنات اور ''آسمان و زمین کا اختیار دے دیا گیا ہے'' (متی ۲۸: ۱۸) لیکن فرق یہ ہے کہ آپ کو خداداد اختیار مطلق حاصل تھا لیکن رسولوں کا اختیار مطلق نہیں بلکہ نسبتی اختیار تھا جو اضافی اور مشروط تھا (۱۰: ۱۹؛ ۹: ۸؛ متی ۱۰: ۱ وغیرہ) ابن اللہ کے مسیحائی نفس اور اختیار مطلق کی وجہ سے جو آپ کے قبضہ قدرت میں تھا۔ رسولوں سے ایسے معجزات اور حیران کن نشانات صادر ہوتے تھے کہ ''سب لوگ خدا کی شان اور عظمت کو دیکھ کر ہکا بکا اور ششدر رہ جاتے تھے (لوقا ۹: ۴۳)۔ کیوں کہ ''ابن اللہ کا پیغام بھی نجات پانے والوں کے لئے خدا کی قدرت تھا'' (۱۔ کرنتھیوں ۱: ۱۸)۔ جب سردار کاہن نے آپ کی زندگی کی آخری رات آپ سے سوال کیا کہ:-

''کیا تو اس ستودہ[1] خدا کا سا مسیح کو قادر مطلق کی دہنی طرف بیٹھے ہے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے'' (مرقس ۱۴: ۶۲) آپ نے متبعین کو فرمایا کہ دنیا کے آخر میں جب ''ابن آدم'' (مسیح) کا نشان آسمان پر دکھائی دے گا تم اس کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کے بادلوں پر دیکھو گے'' (متی ۲۴: ۳۰)۔

ابن اللہ کی یہ قدرت قدرت مطلق ہے جب ہی انجیل میں وارد ہوا ہے کہ مسیح مصلوب ذبح کیا ہوا برہ ہی قدرت اور حکمت۔ عزت اور حمد و تمجید کے شایاں ہے۔۔۔ خدا اور برہ کی حمد و عزت تمجید و سلطنت ابدالاباد قائم رہے (مکاشفات ۵: ۱۳)

ہر چند کہ جان عارف آگاہ بود
کے در حرم قدس تواش راہ بود
دست ہمہ اہل کشف دار باب شہود
از داو ادرک تو کوتاہ بود

(جامی)

---

1 ۔ ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ سردار کاہن اس مقام میں خدا کا اسم اعظم ''یہوہ'' استعمال نہیں کرتا بلکہ خدا کے لئے لفظ ''استودہ'' کا استعمال کرتا ہے۔ برکت اللہ

(۳)

بائبل مقدس اور قرآن مجید دونوں کے مطابق خدا حکمت مطلق ہے اور اس ذوالجلال کے علاوہ کوئی حکیم مطلق نہیں ہے (مکاشفہ ۷: ۱۲)۔ خدا اپنی حکمت مطلق کو کام میں لا کر نبیوں اور رسولوں کو اقوام کی طرف بھیجتا ہے (لوقا ۷: ۲۵)۔ مقدس پولوس رسول لکھتا ہے کہ ''مسیح خدا کی قدرت اور حکمت ہے'' (۱۔ کرنتھیوں ۱: ۲۴)۔

جس طرح ہم سطور بالا میں بتلا چکے ہیں۔ یہاں بھی جو اضافت استعمال کی گئی ہے وہ اضافت توضیحی ہے جس کا مطلب یہ ہے وہ حکمت مطلق جو انجیل میں خدا سے منسوب ہو سکتی ہے وہ مسیح ہے چنانچہ یہی رسول ایک اور مقام میں لکھتا ہے کہ ''مسیح ہمارے لئے خدا کی حکمت ٹھہرا جو راستی اور پاکیزگی ہے'' (۱۔ کرنتھیوں ۱: ۳۰)۔ ''مسیح خدا کی پوشیدہ حکمت ہے جو جہاں کے شروع سے نوع انسانی کو جلال دینے کے واسطے ہے'' (۱۔ کرنتھیوں ۱: ۳۰)۔ مسیح کے وسیلے سے جو ''خدا کی حکمت ہے'' سب چیزوں کو پیدا کیا گیا ''آسمان کی ہوں یا زمین کی، مرئی ہوں یا غیر مرئی۔ تخت ہوں یا ریاستیں، حکومتیں ہوں یا اختیارات سب چیزیں اس کے وسیلے سے اور اسی کے واسطے پیدا ہوئیں۔ وہ سب چیزوں سے پہلے ہے (ہوالاول) اور اسی میں سب چیزیں قائم رہتی ہیں'' (کلسیوں ۱: ۱۶۔۱۷)۔ کلمۃ اللہ میں جو خدا کی حکمت ہے ''حکمت اور معرفت کے سب خزانے پوشیدہ ہیں'' (کلسیوں ۲: ۳) ایں حکمت کی معرفت کلمۃ اللہ کے وجود باجود میں ابتدا ہی سے ہے (لوقا ۲: ۵۲) یہ حکمت جو مسیح میں ہے ''دنیا'' کی حکمت نہیں ہے، کیونکہ کائنات کی خلقت سے پہلے خدا میں تھی (امثال کی کتاب ۸ باب)۔

چنانچہ خدا فرماتا ہے ''میں حکمت ہوں اور قدرت بالذات ہوں'' (امثال ۸: ۱۴) اور جب مقدس پولوس لکھتا ہے کہ مسیح خدا کی قدرت اور حکمت ہے تو وہ اضافت توضیحی استعمال کرتا ہے۔ خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا اکلوتا بیٹا (کلمۃ اللہ) جو باپ کی گود (ذات حق تعالیٰ) میں ہے، اسی نے ظاہر کیا'' (یوحنا ۱: ۱۸)۔

حضرت ابن اللہ بھی فرماتے ہیں کہ :-

آپ خدا کی حکمت ہیں (لوقا ۱۸: ۴۹) اور دنیا کے لاکھوں ایمانداروں کا تجربہ آپ کے اس دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے۔

مسیح ابن آدم

چونکہ ابن اللہ صاحب قدرت و حکمت تھے لہٰذا آپ نے خود اپنی ذات خاص کی توضیح کرنے کے لئے ایک لقب تجویز فرمایا جو ہر چہار اناجیل میں خداوند مسیح کی زبان حقیقت ترجمان کے الفاظ مبارک میں پایا جاتا ہے اور صرف آپ کی زبان معجز بیان سے ہی نکلا ہے۔ یہ لقب ''ابن آدم'' ہے جس کو کوئی دوسرا شخص اناجیل میں آپ کے لئے استعمال نہیں کرتا۔

یہ لقب کتب انبیائے سلف میں سے خداوند نے چنا تاکہ اہل یہود آپ کی قدوس ذات کا علم حاصل کر سکیں۔ منجملہ دیگر کتب کے یہ لقب حضرت دانی ایل کے صحیفہ کے ساتویں باب میں وارد ہوا ہے۔ کلمۃ اللہ نے فرمایا کہ ''چونکہ آپ ''ابن آدم'' ہیں لہٰذا آپ کو اس حادث دنیا میں تمام کائنات پر (جو آپ کے ذریعہ مخلوق ہوئی تھی) کامل اختیار حاصل ہے (دانی ایل ۷: ۱۳ تا آخر یوحنا ۵: ۲۵ وغیرہ)

علاوہ اس کلی اختیار کے جو اس دنیا میں آپ کو حاصل ہے، آپ آخرت میں دنیا کی عدالت راستی سے کریں گے (متی ۲۵: ۳۱۔۴۶؛ مرقس ۹: ۳۷، ۴۱؛ لوقا ۱۰: ۱۰۔۱۶؛ یوحنا ۸: ۵۱؛ ۱۲: ۲۶؛ ۱۵: ۲۳۔ تا آخر وغیرہ)

ان مقامات سے غبی (کم عقل ،بیو قوف) سے غبی شخص پر بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا کامل احساس تھا کہ آپ انبیائے سلف کی مانند محض فرستادہ پیامبر نہیں تھے بلکہ آپ کو "ابن آدم "ہونے کی حیثیت سے آسمان وزمین کا کل اختیار دیا گیا ہے (متی ۱۱: ۲۷؛۲۸: ۱۸۔ ۲۰؛لوقا ۱۰: ۲۲؛مرقس ۱۲: ۶؛یوحنا ۳: ۳۴۔ ۳۶؛ ۵: ۱۷۔ ۲۷؛ ۸: ۵۸؛ ۱۰: ۳۰وغیرہ)

مذکورہ بالا آیات اور دیگر انجیلی مقامات (مرقس ۸: ۳۸؛ ۱۳: ۲۶؛ ۱۴: ۶۲؛لوقا ۱۷: ۲۴؛ ۲۱: ۲۷؛ ۳۴وغیرہ) ہم پر یہ حقیقت واضح کردیتے ہیں کہ کلمۃ اللہ اپنی رسالت کے حقیقی اور اصلی مفہوم کی تاویل حضرت دانی ایل کے صحیفہ (۷: ۱۳تا آخر) کے الفاظ کی روشنی میں کرتے تھے[1]۔

کلمۃ اللہ نے اپنی ذات پاک میں اور دانی ایل کے تصور "ابن آدم "میں کامل مماثلت پائی جس کو اقوام عالم پر ابدی حکومت کرنے کا اختیار حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کا یہ یقین اس درجہ پر پہنچا ہوا تھا کہ جس صلیب کی ہولناک اور بھیانک موت کا سماں آپ کی مبارک آنکھوں کے سامنے تھا، تب بھی آپ کا یہ ایمان متزلزل ہونے نہ پایا۔آپ کو ایسی جانکنی کی حالت میں بھی یہ کامل احساس تھا کہ تمام ظاہری مخالف حالات کے باوجود فتح کا سہرہ آپ کے سر پر ہی ہوگا اور شیطانی طاقتوں کے ساتھ جنگ کرکے بالآخر آپ ہی فاتح ہوں گے اور ابن آدم مسیح کو ہی "قدرت اور اختیار اور جلال حاصل ہوگا (متی ۲۴: ۳۰؛ ۲۶: ۶۴؛ ۱۶: ۲۷؛ ۲۵: ۳۱وغیرہ اور دانی ایل ۷: ۱۳وغیرہ)

مسیح خالق باذن اللہ

انجیل جلیل اور قرآن مجید میں ابن اللہ مسیح کے لئے جو لفظ "کلمہ "وارد ہوا ہے وہ کلمہ تکوینی ہے۔یعنی وہ "کلمہ "کائنات اور موجودات کو وجود میں لاتا ہے اور ان کو پیدا کرتا ہے۔(سورہ بقر ۱۱۱زبور ۳۳: ۹؛یوحنا ۱: ۱۔ ۴وغیرہ) کلمۃ اللہ کے وسیلے سے خدا نے عالم پیدا کئے (عبرانیوں ۱: ۲) ۔چونکہ پولوس فرماتا ہے:-

"ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے یعنی باپ جس کی طرف سے سب چیزیں ہیں اور ہم اسی کے لیے ہیں اور ایک ہی خداوند ہے۔یعنی یسوع مسیح کے وسیلے سے سب چیزیں وجود میں آئیں اور ہم بھی اس کے وسیلے سے ہیں"۔

قرآن میں بھی وارد ہوا ہے کہ حضرت کلمۃ اللہ خالق باذن اللہ ہیں قرآن میں کلمۃ اللہ فرماتے ہیں:-

(اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ)(سورۃ آل عمران آیت ۴۹)

یعنی مجھ کو خدا نے یہ قدرت دی ہے کہ میں تمہارے اطمینان کی خاطر کے لیے مٹی سے پرندہ کی شکل کی مانند ایک جانور خلق کروں پھر اس میں اپنا دم پھونکوں تو وہ اللہ کے اذن (اجازت) سے پرندہ ہو کر اڑنے لگے۔

پھر وارد ہوا ہے:-

(وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِیْ)(سورۃ المائدۃ آیت ۱۱۰)

(اے مسیح) جب تم ہمارے خدا کے اذن سے مٹی سے پرندہ کی شکل کی مانند خلق کرتے تھے اور اس میں اپنا دم پھونکتے تھے تو وہ ہمارے اذن سے پرندہ ہو کر اڑ جاتا تھا۔

[1] T.W.Manson,Studies in the gospels and epistles 1962(Manchester University press)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ کلمہ جو تخلیق عالم کا موجب اور وسیلہ تھا خود کوئی حادث اور مخلوق شے نہیں ہو سکتا۔ اس وسیلہ کی تخلیق کے لیے ایک اور وسیلہ کی ضرورت لاحق ہو جاتی اور پھر اس کے لیے ایک تیسرے وسیلہ کی ضرورت پڑتی اور یہ ایک لامتناہی (بے حد) سلسلہ ہو جاتا اور مسلسل از روئے منطق باطل ہے۔ جائے غور ہے کہ کلمۃ اللہ کے خلق کرنے میں اور خدا کے خلق کرنے میں کس قدر باہمی مناسبت پائی جاتی ہے۔ دونوں کتب سماوی بائبل شریف اور قرآن مجید کے مطابق خدا نے آدم کو مٹی سے خلق کیا اور اس خاکی کالبد (جسم) میں اپنا دم پھونکا چنانچہ قرآنی الفاظ اور صحائف سلف کے الفاظ ملاحظہ کریں۔ تورات میں لکھا ہے "خداوند خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور پھر اس میں زندگی کا دم پھونکا تب انسان جیتی جان ہوا۔ قارئین قرآنی الفاظ میں ملاحظہ کریں۔

(وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ) (سورۃ الحجر آیت ۲۹)

یعنی میں اپنی زندگی کا دم پھونکا۔ پھر آدم جاندار انسان بن گیا۔

انجیل میں آیا ہے کہ کلمۃ اللہ کے وسیلے سے سب چیزیں پیدا ہوئیں۔ ایں میں زندگی تھی اور یہ زندگی آدمیوں کا نور تھی (یوحنا ۱:۴؛ عبرانیوں ۱:۲) قرآن کے مطابق حضرت کلمۃ اللہ نے پرندہ کی شکل کو مٹی سے خلق کیا پھر فَتَنْفُخُ فِيْهَا میں اپنا دم پھونکا اور وہ جاندار ہو گیا۔ پس خدا نے اپنے ابن محبوب کو اس صفت سے موصوف کیا جو خاص خدا سے مختص ہے یعنی آپ کو خلق کرنے کی صفت سے متصف کیا۔ دونوں کتب سماوی خلق کرنے کی صفت کو خدا سے (اور صرف خدا) سے منسوب کرتی ہیں صرف خدا ہی تنہا خالق ہے اور باقی تمام کائنات مخلوق ہے۔

پھر لکھا ہے۔

(قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ) (سورۃ الرعد آیت ۱۷)

یعنی خدا تمام اشیا کا خالق ہے۔

لیکن تمام مخلوقات میں خدا نے صرف اپنے کلمہ اور روح کو یہ فضیلت بخشی کہ وہ باذن اللہ خلق کرے۔

اگر کوئی کہے کہ یہ تو خدا کے اذن سے تھا تو ہم جواب دیں گے کہ بے شک یہ خدا کے اذن سے تھا لیکن خدا کسی انسان کو ایسا اذن نہیں دیتا جو خاکی انسان کے پتلے کو ایں (یہ) کی خالقیت کی صفت میں شریک کر دے۔ تمام قرآن میں اور انجیل میں بھی کلمۃ اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جسکو خدا نے یہ اذن عطا کیا ہو کہ وہ ادنیٰ ترین شے کو خلق کرے اور اس میں زندگی کا مسیحائی دم پھونکے قرآن مجید ایسے معترض ہی کو مخاطب کرتا ہے۔

(اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ) (سورۃ النحل آیت ۱۷)

تو کیا جو خلق کرے وہ اس کے برابر ہے ہو سکتا ہے جو کچھ بھی خلق نہیں کر سکتے؟ اے لوگو تم سوچتے کیوں نہیں؟

تمام محض مخلوق انسان اور انبیاء اللہ خلق کرنے کی صفت اور فضیلت سے یکسر محروم ہیں کیونکہ نہ صرف شان الوہیت کا ہی خاصہ ہے اور انجیل کے مطابق اس امر میں کلمۃ اللہ باپ کے نام سے باذن اللہ وہی کام کرتا ہے جو باپ کرتا ہے (یوحنا ۵:۳۶؛ ۱۰:۲۵ وغیرہ) ایں قسم کے کام سوائے اللہ کی ذات کے اور کلمۃ اللہ کے جو عین ذات الٰہی ہے۔

مسیح کی صلیبی موت

تاریخ دنیا، انجیل جلیل اور قرآن مجید تینوں متفق اللفظ ہو کر اعلان کرتے ہیں کہ خداوند مسیح کو رومی گورنر پنطوس پلاطوس کے زمانہ میں شقی یہود کی شکایت اور اصرار مر مصلوب کیا گیا تھا۔ ہم نے تاریخ کی شہادت کا مفصل ذکر رسالہ توضیح العقائد میں کیا ہے۔

کہ وہ اپنے لوگوں کی ان کے گناہوں کو نجات دیں (متی ۱:۲۱)۔ کلام اللہ کلمات طیبات اور حدوث پر از محبت زندگی کے نمونے نے گناہگاروں کو جو تاریخی اور موت کے سائے میں بیٹھے تھے خدا کی محبت کا جلوہ دکھادیا اور اس سے بھی زیادہ آپ کی صلیبی موت کا دن نوع انسانی کے لئے نجات و سعادت وارین سلامتی عطا کرنے کا دن ثابت ہوا، اور آپ کی ظفریابی قیامت نے موت اور گناہ کی تاریک طاقتوں پر فتح حاصل کر کے ثابت کر دیا کہ آپ کی موت میں ابدی بقا کا راز مضمر (پوشیدہ) تھا۔ یہی وہ سلامتی ہے جس کا ذکر قرآنی آیت میں ہے اسی قسم کے نہائی (وہ اوزار جس پر لوہا کوٹتے ہیں، اہرن) رموز و حقائق کو جاننے کے لئے قرآن میں حضرت رسول کو اور تمام ایمانداروں کو اللہ کا حکم ہے کہ اگر تم کو کسی شے کا پتہ نہ چلے تو بائبل پڑھنے والوں سے پوچھ لیا کرو (یونس ع ۱۰۔ انبیا آیت ۷۔ نحل ع ۴ وغیرہ) ایں (یہ) رمز اور راز کو ایک صاحب دل اور صاحب نظر ہی کماحقہ سمجھ سکتا ہے جس کے دل کی ہر حرکت میں اہل دنیا کے لئے تڑپ ہے "جس کے کان سننے کے ہوں وہ سنے"۔ جن کے دل دار درس (تسلی و تشفی کا سبق) کے فلسفہ سے مانوس ہیں وہ کان سے اونچا نہیں سنتے اور نہ وہ صلیب کی راہ سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں لیکن بالفاظ نبی "جو دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے ان کے حقوق میں قرآن مجید کہتا ہے۔

(خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ) (سورۃ البقرۃ آیت ۷) یعنی خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ ایسوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔

منجی عالمین نے شیطان کو کچل کر کل دنیا کی اقوام کو گناہ کے پنجہ سے تاابد خلاصی عطا کر کے ان کو از سر نو زندگی بخش کر خدا کے فرزند اور آسمان کی بادشاہی کے وارث بنا دیا۔

دوسری قرآنی آیت میں خدا تاکیداً منجی جہاں کی مبارک موت کا ذکر کر کے فرماتا ہے کہ "اے عیسیٰ، میں تجھ کو کفار نابکار و گنہ گار سے جدا کر کے اپنی طرف اٹھالوں گا۔ انجیل جلیل میں عبرانیوں کے خط میں بھی یہی الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ چنانچہ خط کا ملہم مصنف لکھتا ہے کہ "ہمارا سردار کاہن (مسیح) پاک، بے ریا اور بے داغ تھا جو گنہ گاروں سے جدا اور آسمانوں سے بلند اور آسمانوں سے بھی گذر کر عرش پر کبریا کے تخت کی دہنی طرف جا بیٹھا" (عبرانیوں ۷:۳۶؛ ۴:۱۴؛ ۸:۱)۔

مذکورہ بالا تیسری قرآنی آیہ میں خداوند مسیح کی وفات کا نہایت مختصر لیکن صریح اور واضح الفاظ فلما توفیتنی (جب تو نے مجھے موت دی) میں ذکر کیا گیا ہے ان سے زیادہ مختصر مگر صاف پر معنی اور واضح آیات تمام قرآن میں بمشکل ملیں گی۔

مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کا صحیح مفہوم

ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ مذکورہ بالا قرآنی آیات میں کلمۃ اللہ کی ولادت، موت، قیامت اور رفع آسمانی کا بالترتیب ذکر وارد ہوا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ ان واقعات میں سے ہر واقعہ دوسرے کا مستلزم (کوئی کام اپنے اوپر لازم کرنے والا) ہے۔ منجی عالمین کی صلیبی موت سے پہلے آپ کی ولادت مسعود لازم ہے اور آپ کی ظفریاب قیامت سے پہلے آپ کی صلیبی موت لازم تھی اور آپ کے رفع آسمانی سے پہلے آپ کی ولادت، مبارک

موت اور ظفر مند ہو کر جی اٹھنے کا واقعہ لازم تھا۔آپ کی پیدائش، موت قیامت اور صعود آسمانی کا اقرار لازم وملزوم اور مقدم وموخر میں ایں (یہ) سلسلہ واقعات میں ایک واقعہ کے سے ہر واقعہ کا اقرار لازم ہو جاتا ہے کہ ہم آپ کی صلیبی موت، ظفریاب قیامت اور صعود آسمانی کا بھی اقرار کریں اور ان سب پر ایمان رکھیں۔

اناجیل اربعہ کا سطحی مطالعہ بھی ظاہر کر دیتا ہے کہ کلمۃ اللہ کا مسلک اور منصب ہی یہ تھا کہ افراد اور سماج کی اور بالخصوص مذہبی ظلم وتاریکی کی طاقتوں کے خلاف جہاد کریں۔آپ خدا کے لوگوں کو شیطانی طاقتوں سے اور شر وبدی کی روح سے آزادی اور حریت (غلامی کے بعد آزادی) کے پیغام کے علمبردار ہو کر آئے تھے۔آپ کی تمام زندگی میں انسانیت کے اجتماعی دکھ کا احساس ہر شخص کو نظر آتا ہے۔اس روحانی کرب کا ذکر بار بار اناجیل میں آتا ہے (لوقا ۱۹: ۴۱۔۴۴؛ متی ۲۴: ۱۲۔۳۹؛ لوقا ۲۳: ۲۷۔۳۱ وغیرہ) اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا کہ ''فریسی باہر جا کر ہیر دیوں کے ساتھ اس کے خلاف مشورہ کرنے لگے کہ اسے کس طرح ہلاک کریں (مرقس ۳: ۶؛ متی ۲۲: ۱۵ وغیرہ)۔لیکن کلمۃ اللہ کی کارزار حیات میں مر مٹنے کا جذبہ موجود ہے اور وہ حوارئین کو بھی وار درسن کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں (یوحنا ۱۲: ۲۴۔۳۴؛ متی ۱۰: ۳۴۔۳۹ وغیرہ)

ہر کلی مصلوب ہو کر شاخ کی زینت بنی

دار پر کھینچا گیا جو پھول گلشن ہو گیا (حسن بخت)

کلمۃ اللہ کے لیے زنجیر کی جھنکار الٰہی آواز کا نغمہ بن گئی تھی اور کانٹوں کا تاج ابن اللہ کے فرق مبارک کا نشان اور صلیب دوار آپ کا پرچم ہو گئی۔لیکن دنیا میں ایسے اصحاب کثرت سے موجود ہیں جو وار درسن کے انجیلی سبق سے ناآشنا ہیں کیونکہ ان کے دل درد سے ناواقف ہوتے ہیں۔بالفاظ انجیل ''وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے'' (متی ۱۳: ۱۳۔۱۶ وغیرہ) اور بالفاظ قرآن

(صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ) (سورۃ البقرۃ آیت ۱۸)

یعنی وہ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں وہ کلام حق کی جانب نہیں پھرتے۔

پس وہ منجی جہاں کی صلیبی موت کا انکار کرتے ہیں اور قرآنی آیات بنیات کے صاف صریح اور واضح مطالب کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔حالانکہ مذکورہ بالا تینوں کی تینوں آیات میں مسیح کے حق میں الفاظ ''موت'' اور ''وفات'' صریحاً وارد ہوئے ہیں۔ایسے اصحاب پر قرآنی آیہ

(اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ) (سورۃ البقرۃ آیت ۸۵)

صادق آتی ہے کیونکہ وہ کتب سماوی کی جس کتاب کے جس حصے کو چاہتے ہیں اس کو مانتے ہیں اور جس کو نہیں ماننا چاہتے اس کا بے دریغ انکار کر دیتے ہیں حالانکہ بالا تینوں کی تینوں آیات کے الفاظ صاف اور واضح ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تاویل یا شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

صلیبی واقعہ کے سنکر اپنی پاور ہوا تاویلات کو ایک قرآنی آیہ سے سہارا دینے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ قرآن کا دعویٰ صاف ہے کہ ''وہ کھلی آیتوں میں اترا ہے اور آسان کیا گیا ہے (حج۔۱۶) ''ہم نے سمجھنے کے لئے قرآن کو آسان کر دیا گیا ہے۔سو کیا کوئی ہے جو نصیحت پکڑے''؟ (قمر۔۲۲) یہ نام نہاد مفسرین بالفاظ قرآن ''قرآن میں غور نہیں کرتے اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر قرآن خدا کے پاس سے نہ آیا ہوتا تو اس میں بہت سے اختلاف پاتے'' (نسا آیت ۸۴) یہ اصحاب اپنے نام نہاد علم وفضل پر فخر کر کے قرآن کے ایسے مقامات میں اختلاف ڈال دیتے ہیں جہاں اختلاف نہیں ہوتا۔اور یہ نہیں سوچتے کہ دشمناں قرآن اس اختلاف کی وجہ سے اس کو من دون اللہ ثابت کر دیں گے! پس یہ علماء صلیبی واقعہ کے انکار کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی آیہ میں آیا ہے کہ

(وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَۚ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ)

(سورۃالنسا آیت ۱۵۷)

یعنی یہود نے کہا کہ ہم ہی نے تو عیسیٰ ابن مریم تمہارے اللہ کے رسول کو قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ (یہود نے) نے نہ تو اس کو قتل کیا اور نہ انہوں نے اس کو مصلوب کیا۔

لیکن اول اس آیہ شریفہ میں مسیح کے مصلوب ہونے کے واقعہ کا انکار نہیں کیا گیا بلکہ جس قول کی تردید کی گئی ہے وہ نابکار (بے فائدہ ،شریر) یہود کا قول ہے جو اس آیت کے پہلے حصہ میں درج ہے۔ پس اس آیہ میں قرآن کہتا ہے کہ یہود کا یہ فخر کہ ہم نے تمہارے اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا'' غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ مسیح کو مصلوب کرنے والے یہودی تھے ہی نہیں۔ یہود نے نہ تو اس کو قتل کیا اور نہ مصلوب کیا۔

انجیل متی میں بھی اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جب خداوند مسیح نے اپنے ہم عصر اہل یہود کو متنبہ کر کے کہا تھا کہ تم شیخی مار کر کہتے ہو اور ''اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے''؟(متی ۲۳: ۲۹۔۳۳)

پس مختلف زاویہ نگاہ سے مذکورہ بالا قرآنی آیہ انجیل جلیل کے صلیبی واقعہ اور مسیح کی صلیبی موت کی تصدیق کرتی ہے جس کے مصدق ہونے کا قرآن بار بار دعویٰ کرتا ہے۔

دوم قرآنی آیہ کا یہ مطلب نہ صرف انجیل جلیل کے بیانات کے مطابق ہے بلکہ تاریخ عالم کے واقعات کے ساتھ بھی مطابقت رکھتا ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے صاف اور غیر مبہم الفاظ انجیل جلیل کے اوراق تاریخ عالم کے مطابق ہیں۔ لیکن اگر منکرین صلیب کی باطل تاویل کو بفرض محال صحیح مان لیا جائے تو اس سے قرآنی آیت بالا میں اور دیگر تین متذکرہ آیات زیر بحث ہیں باہمی تضاد لازم آتا ہے اور ایک تاریخی واقعہ کی تکذیب بھی لازم ہو جاتی ہے اور قرآن اور تاریخ عالم میں اختلاف بلکہ خود مقامات قرآن میں اختلاف کا وجود اس کو ''من دون اللہ'' ثابت کر دے گا۔

مَا قَتَلُوْهُ يَاَ مَا صَلَبُوْهُ

ہم کہہ چکے ہیں کہ آیہ شریفہ کا مطلب صاف اور واضح ہے جس کی تاویل کی ضرورت نہیں لیکن بعض مسلم اصحاب نے صلیبی موت کو قبول کر کے قرآن کو اختلاف اور تکذیب سے بچانے کے لیے ایک تاویل کی راہ نکالی ہے۔ چنانچہ قادیانیت کے بانی ''حضرت مرزا غلام احمد علیہ السلام کے قدیم صحابہ میں ایک مستند عالم مولوی محمد احسن صاحب امروہی تھے۔ اس جگہ ہم مرحوم کی فارسی کتاب ''التاویل المحکم فی متشابہ فصوص الحکم'' کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جن کا اردو خواں ناظرین کی خاطر اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے:-

''آنجناب (حضرت مسیح) کو صلیب پر کھینچ دیا گیا۔۔۔ باوجود یہ کہ مسیح علیہ السلام نوجوان تھے۔ آپ نے خوشی سے اپنی جان خدا کے سپرد کر دی کسی دوسرے شخص نے آپ کو قتل نہ کیا۔۔۔ آنجناب کے ساتھ دو چور بھی صلیب پر لٹکائے گئے تھے۔ چونکہ دوسری روز صبح کو سبت کا روز تھا یہود چاہتے تھے کہ تینوں کی ہڈیاں توڑ دی جائیں اور ان کو مار ڈالا جائے پس رومی سپاہیوں نے دونوں ڈاکوؤں کی ہڈیاں توڑ کر ان کو مار ڈالا جائے لیکن جب وہ مسیح کے نزدیک آئے تو انہوں نے آپ کو مردہ پایا پھر بھی احتیاط کی خاطر انہوں نے ایک برچھی آپ کے پہلو میں ماری جس سے خون نکل پڑا۔ پس ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے مسیح کو مصلوب کر دیا جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہم نے اس کی ہڈیاں توڑ کر اس کو مار ڈالا کیونکہ لفظ

مصلوب ''اگرچہ لفظ صلب (بالضم) سے موخوذ ہے جس کے معنی ''ہڈی نکالنا'' ہیں چنانچہ الفاظ لیکن اس مقام میں یہ لفظ صلب سے نہیں نکلا بلکہ اس جگہ یہ لفظ ''صلب بالفتح'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''ہڈی نکالنا'' ہیں چنانچہ الفاظ ''اصحاب صلب'' سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہڈیاں نکال نکال کر جمع کرتے ہیں پس قرآن کی اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کو ہر گز قتل نہیں کیا بلکہ آپ نے خود اپنی جان حق کے سپرد کر دی تھی اور کہ اہل یہود نے آپ کو صلب نہیں کیا یعنی آپ کی ہڈیاں نہ نکالیں۔ لیکن آنجناب مصلوبوں یعنی ہڈیاں توڑے ہوؤں کے مشابہ اور ان کی مانند بن گئے۔ انہوں نے آپ کو قتل نہیں کیا بلکہ آنجناب کو سبت کی شب کو قبر میں رکھ دیا گیا یہ جمعہ کی شام تھی اور اس سے اگلا روز شنبہ (ہفتہ) کا دن سبت تھا۔ آنجناب اتوار کی صبح کتب سابقہ کی اور اپنی پیس گوئیوں کے مطابق اپنے حواریوں پر ظاہر ہوے۔۔۔ بعض نے کہا یہ خواہ مسیح کی صورت پر آگیا تھا حالانکہ وہ مردود ایک دن پہلے پھانسی لے کر مر چکا تھا۔۔۔ قرآن مجید کے مفسرین بھی چونکہ مفصل واقعات سے واقف نہ تھے انہوں نے بھی اس قول کو قبول کر لیا جو قرآن مجید میں مردود ٹھہرایا گیا ہے کہ یہود امسیح کے عوض مارا گیا۔۔۔ قرآنی آیات ''**فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي مُتَوَفِّيكَ**'' حضرت مسیح کی موت پر صریح دلالت کرتی ہیں جیسا اناجیل میں لکھا ہے علاوہ ازیں طلحہ بن علی کی رویت جو ابن عباس سے ہے اور وہب کی روایت جو تفسیر معالم میں ہے۔ اس امر کی شاہد ہیں۔۔۔ پس اب معلوم ہو گیا کہ آیت ''ماصلبوہ'' میں لفظ صلب زبر کے ساتھ ہے جس طرح زبور کی پیس گوئی میں درج ہے اور جس کی تصدیق انجیل بھی کرتی ہے۔ صحیح لفظ پیش کے ساتھ لفظ ''صلب'' بمعنی دار نہیں بلکہ صلب ہے جس کے معنی اخراج استخوان ہے۔۔۔''

بہر حال اب ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ تصلیب مسیح کا واقعہ حق ہے جس کی شہادت تاریخ کے اوراق، اناجیل اربعہ دشمنان دین یعنی اہل یہود اور بت پرست حکام اور فوجی افسر جو واقعہ کے چشم دید گواہ تھے، سب متفق اللفظ ہو کر دیتے ہیں اور قرآن بھی یہی گواہی دیتا ہے (مریم ۳۴؛ عمران ۴۸؛ مائدہ ۱۱۷)

بایں ہمہ (ان تمام باتوں کے باوجود) مسلمان مناظرین یہی کہتے ہیں کہ قرآن میں یوں لکھا ہے ''**مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ**'' (انہوں نے مسیح ابن مریم کو قتل نہیں کیا اور انہوں نے اس کو صلیب نہیں دی) پس یہ بات صاف ہے کہ جس واقعہ کا انجیل نے اثبات کیا، اسی کا قرآن نے انکار کیا ہے۔

اب ان صاحبان کے لئے مشکل یہ آن پڑی کہ مسیح کا مصلوب ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جو نہ صرف انجیل میں مذکور ہے بلکہ تاریخ دنیا میں درج ہے اور رومیوں نے جن کے حکم سے آپ کو مصلوب کیا گیا، اس واقعہ کو قلم بند کر رکھا ہے۔ اگر انجیل نہ بھی ہوتی تو تاریخ دنیا اس پر شاہد رہتی اور کوئی واقعہ سے انکار نہ کر سکتا۔ لیکن یہاں تو ایک چھوڑ دو شہادتیں ہیں جو عینی ہیں جن کو کوئی صحیح العقل (دانش مند) نامقبول نہیں کر سکتا۔ پس اگر قرآن واقعہ کے چھ سو سال بعد آکر ایسے مسلمہ وقوعہ کا انکار کرے تو اس کے انکار میں صرف اس کو خطرہ ہو گا اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ قرآن شریف نے فی الحقیقت تصلیب اور موت مسیح کا انکار کیا ہے تو لاریب بہ قول انجیل کے خلاف ہو گا جس کی صحت صداقت کو اس نے متعدد مقامات میں تسلیم کیا ہے۔ اس مشکل کو ہر فہمیدہ مسلمان محسوس کر سکتا ہے بالخصوص ایسا مسلمان جو قرآن کی صداقت کے لئے غیرت مند ہے۔

ان فہمیدہ اور غیور مسلمانوں میں سے بعض نے اپنی وسعت سے مجبور ہو کر آیہ مذکورہ کی ایسی تاویلیں کی ہیں جو قرآنی آیت اور انجیلی واقعہ میں مطابقت دکھاتی ہیں۔ وہ حسب ارشاد قرآن انجیل کو بھی برحق مانتے ہیں اور قرآنی مقولے کو بھی حق جانتے ہیں۔ پس وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن نے واقعہ صلیب کا انکار کیا ہے کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ اس واقعہ کے انکار کا اثبات ممکن نہیں۔ ایسے مسلمانوں میں علی گڑھ مشہور محقق (وہ شخص جو بات کو دلیل سے ثابت کرے) سید احمد مرحوم کو خاص مقام حاصل ہے۔ انہوں نے تفسیر القرآن میں لکھا ہے کہ

''جس آیت سے لوگ انکار صلیب سمجھتے ہیں،اس کے سمجھنے میں ان کو دھوکا ہوا ہے''

سید مرحوم نے واقعہ صلیب کی حقیقت کو تسلم کر کے آیت قرآن کی ایسی تاویل (بچاؤ کی دلیل) کی جس سے قرآن مجید کے اوپر سے ناواقفیت کا یہ الزام رفع ہو کہ اس نے حقیقت الامر سے انکار کیا ہے۔

ایک اور صاحب کا نام چراغ دین تھا وہ جموں کے رہنے والے تھے اور ایک وقت مرزائے قادیانی کے مرید تھے پر بعد میں انہوں نے توبہ کرلی تھی۔انہوں نے تائب ہونے کے بعد کتاب ''منارۃ المسیح''لکھی جو راقم الحروف کے پاس ریٹائر ہونے تک رہی۔انہوں نے بھی آیہ مذکورہ کی ایسی تفسیر کی جو انجیل جلیل کے بیان سے مخالف نہیں تھی۔ان کی کتاب میں اس آیت پر مفصل بحث ہے۔وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ قرآن شریف کے بیان کو خدا کے کلام سابق کے موافق کریں کیونکہ ان کی عقل یہ نہیں مان سکتی کہ خدا کا ایک کلام اس کے دوسرے کلام کے مخالف ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے مولوی صاحب تھے محمد احسن امروہوی جو قادیان کے نبی کے ''صحابہ''میں سے تھے وہ پرانی وضع کے مسلمان تھے۔منقول پر فدا تھے اور معقول میں کم دخل دیتے تھے۔انہوں نے فارسی زبان میں عربی کی مشہور کتاب ''فصوص الحکم''پر ایک مبسوط شرح لکھی جس کا ہم اس سلسلہ میں اقتباس کر آئے ہیں۔مذکورہ بالا علماء مسلمان تھے مگر ان سے پیشتر ایک مسیحی بزرگ خرسطعورس جبارہ الدمشقی گزرے ہیں۔جو کتاب مقدس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کو بھی الہامی مانتے تھے انہوں نے قرآن کی حمایت میں آیہ مذکورہ کی ایسی بھی تشریح کی جس سے دونوں کتب میں تضاد نہ رہا۔مسلمانوں میں جتنے علمائے مسیح ابن مریم کی تصلیب اور موت کے انجیلی اور قرآنی بیانات کو موافق کرنے کی کوشش کی ہے،وہ سب اس مسیحی فاضل کے مرہون منت ہیں۔

قرآنی آیہ میں مسیحی مخاطب نہیں

قرآن کے (سورہ نساع ۲۲) میں جو آیات اس مضمون سے متعلق ہیں،ان میں مخاطب یہود اور صرف یہود ہیں اور ان کے سوائے کوئی اور مخاطب نہیں ہے اس بیان میں نہ تو انجیل جلیل کا نام آیا ہے اور نہ مسیحیوں کا کہیں ذکر یا اشارہ پایا جاتا ہے۔اس آیہ میں دو امور غور طلب ہیں اول صلیب کا واقعہ اور دوسرا کہ کس نے مصلوب کیا۔یہ دونوں امور ایک دوسرے جدا ہیں اگر کوئی پہلے امر واقعہ صلیب کا انکار کرے تو دوسرے امر کا انکار کرے تو دوسرے امر کا انکار لازم ہو جاتا ہے۔لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی دوسرے امر کا انکار کرے تو پہلے واقعہ صلیب کا انکار لازم ہو جاتا ہے۔لیکن اس کے برخلاف اگر کوئی دوسرے امر کا انکار کرے تو پہلے واقعہ صلیب کا انکار لازم نہیں آتا۔قرآنی بیان میں دوسرے امر کا انکار کیا گیا ہے اور وہ بھی صریحاً(کھلم کھلا) یہ مخالفت یہود! مسلمان علماء نے غلطی سے اس انکار کو اصل واقعہ صلیب کا انکار تصور کر لیا گیا ہے اور وہ بھی صریحاً جدا رکھتا ہے اور ایک کا انکار کرتا ہے۔لیکن علماء ہر دو امور کو یک جا کر کے دونوں کا انکار کر دیتے ہیں! قرآن واقعی صلیب کا انکار نہیں کرتا بلکہ اہل یہود کے قول کا انکار کرتا ہے اور یہ انکار واقعہ صلیب کا انکار لازم نہیں کرتا! پہلا امر ایک ایسا واقعہ ہے جس پر یہود اور مسیحی کلیسیا اور انجیل جلیل سب کے سب اتفاق کرتے چلے آئے ہیں۔اس واقعہ کا قرآن شریف نے بھی انکار نہیں کیا۔اس نے صرف یہودیوں کے قول کا انکار کیا ہے،جس میں اہل یہود کے دعویٰ اور انجیلی بیان میں اختلاف ہے۔قرآن نے اہل یہود کے قول اور دعویٰ کی تکذیب کی ہے پس اس نے انجیل اور مسیحیوں کے دعویٰ کی تصدیق کر دی کیونکہ اگر اس کو انجیلی واقعہ کی تصدیق منظور نہ ہوتی تو وہ یہودیوں کے ساتھ مسیحیوں کو بھی مخاطب بنا کر دونوں کی صاف الفاظ میں تکذیب کر دیتا۔کیونکہ یہود سے مسیحی مخاطبت کے زیادہ سزاوار تھے۔کیونکہ وہ مسیح کی صلیب کو نجات کا ذریعہ مانتے تھے۔اگر مسیحیوں کی تکذیب منظور ہوتی تو قرآن صاف کہہ سکتا تھا کہ نہ مسیح مرے اور نہ مصلوب ہوئے عیسائی غلطی پر ہیں۔جو مسیح کی صلیب کو نجات کا ذریعہ مانتے ہیں۔لیکن

اس مقام میں نہ تو مسیحیوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور نہ ان کے اعتقاد سے تعرض (مزاحمت کرنا) کیا گیا ہے بلکہ یہاں یہود کو مخاطب بنا کر ان کے زعم (غرور) فساد کو رد کیا گیا ہے اور انجیل جلیل کے اعتقاد کو بجائے خود رہنے دیا ہے۔

قرآن مصدق انجیل

اگر ہم اس آیت میں یہودیوں کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس حقیقت پر غور کریں کہ کیسے برجستہ الفاظ میں قرآن مجید نے انجیل کی تصدیق بار بار کی ہے اور اس حقیقت کو مد نظر رکھ کر ان آیات پر کریں

(اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا)(سورۃ آل عمران آیت ۵۵)

یعنی اے عیسیٰ میں ضرور تجھ کو وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا اور تجھ کو پاک کروں گا ان لوگوں سے جنہوں نے کفر اور انکار کیا۔

فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ (یعنی عیسیٰ نے کہا کہ اے خدا جب تو نے مجھ کو وفات دی)

تو کون صحیح العقل شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ان الفاظ کے بجنسہ وہی معنی ہیں جو انجیل میں ہیں کہ مسیح ابن مریم نے وفات پا کر آسمان پر صعود فرمایا جب کو مسیحی یا مسلمان (جو قرآن کی تصدیق انجیل پر شبہ نہیں کرتا) ان آیات بنیات کو خالی الذہن ہو کر پڑھتا ہے تو اس کو نہ لفظ توفی کے معنوں کو حقیقت سے پھیرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور نہ کسی تاویل کو بعید کی تلاش اور سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لفظ توفی کے معنی موت جس پر انجیل شاہد ہے۔ قرآن نے وفات مسیح کو کوئی تفصیل نہیں کی کہ آپ کس موت مرے۔ قرآن کو اس بات کی مطلق ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ ابن مریم کی موت کے طریقہ کا ذکر کرتا کیوں کہ اس واقعہ کے موت کے طریقہ کی تفصیل انجیل میں موجود تھی جس کی وہ بار بار تصدیق کرتا ہے۔ پس وفات مسیح کے اقرار کے ساتھ واقعہ تصلیب کا اقرار لازم آتا ہے۔ اگر یہ اقرار قرآن کو منظور نہ ہوتا تو وہ مسیحیوں کو مخاطب کر کے ان کے اعتقاد کی تردید کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے جیسا ہم سطور بالا میں لکھ آئے ہیں اس بیان میں نہ تو مسیحیوں کو مخاطب کرنا ضروری سمجھا اور نہ ان کے عقیدہ سے تعرض کیا اور انجیلی اعتقاد کو بجائے خود رہنے دیا۔

اس سیدھی اور سچی بات کے نہ سمجھنے سے اہل اسلام کے بعض علماء نے اپنے لئے مشکلات پیدا کر لیں چنانچہ نواب صدیق حسن خاں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

> ''ابن کثیر نے کہا کہ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ '' اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ'' سے کیا مراد ہے قتادہ نے کہا کہ تقدم وتاخیر سے عبارت یوں ہے ''الی رافعک وانی متوفیک''یعنی پہلے آپ کی رفع اور پھر وفات ہوئی۔ ابن عباس نے متوفی کے قیمت کئے۔ وہب بن عتبہ نے کہا کہ یہ وفات دی اللہ نے عیسیٰ کو تین ساعت (گھڑی، معین وقت) اول روز میں جس وقت کہ ان کو اپنی طرف اٹھایا۔ ابن اسحاق نے کہا کہ انصاریٰ کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سات ساعت مرے رہے پھر زندہ ہو گئے۔ وہب کا دوسرا قول یہ ہے کہ تین دن مرے رہے پھر مرفوع (بلند کیا گیا) ہو گئے۔ مطہر وراق نے کہا کہ وفات سے مراد دنیا کی وفات ہے نہ کہ وفات کی موت۔ ابن جریر نے کہا توفی سے مراد رفع ہے۔ مطہر وراق نے کہا کہ وفات سے مراد دنیا کی وفات ہے نہ کہ وفات موت۔ ابن جرر نے کہا توفی سے مراد رفع ہے اکثر اہل علم کا یہ قول ہے کہ اس جگہ وفات سے مراد خواب ہے!!!

غرض یہ کہ جتنے منہ اتنی باتیں اور جتنی نظریں اتنے نظریئے ! ! لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ نہ تو فی کہ معنی بگاڑنے کی ضرورت ہے اور نہ وفات کو قیامت تک ملتوی رکھنے کی ضرورت ہے اور نہ قرآنی آیت کے الفاظ کی ترتیب بگاڑنے کی ضرورت ہے انجیلی بیان کے مطابق پہلے وفات ہوئی ،قرآن نے پہلے وفات کا ذکر کیا اور وفات کے طریقہ اور تفصیل کا ذکر ضروری نہ سمجھا اور نہ کیا کیونکہ امر مسلمہ فریقین نے از اول تا آخر تسلیم کر لیا تھا ۔ پھر واقعہ وفات کے بعد رفع سماوی کا واقعہ ہوا۔ قرآن نے اس کا بھی ذکر کر دیا۔ لیکن رفع سماوی کا بھی طرز اور تفصیل بیان نہ کی کیونکہ اس امر کو بھی فریقین نے سرتاپا تسلیم کر لیا تھا۔

مزید ثبوت

پس قرآنی آیات ''انی متوفیک ورافعک اور فلما توفیتنی'' مسیح ابن مریم کی موت پر صریح دلالت کرتی ہیں طلحہ ابن علی کی روایت جو ابن عباس سے ہے اور وہب کی روایت جو تفسیر معالم میں ہے، سب اس امر کی شاہد ہیں کہ بعد نزول سورۃ نساء (جس میں آیت ماصلبوہ وارد ہوئی ہے) حضرت حاطب (جو بدری صحابہ) رسول عربی کے قاصد ہو کر مقوقش والی سکندریہ کے پاس (جو مسیحی تھا) گئے اور رسول کا خط اس کو دیا۔ مقوقش نے ان سے سوال کیا کہ اگر تمہارا صاحب فی الواقع نبی تھا تو اس نے کیوں خدا سے دعا نہ کی کہ اس کو مکہ سے ہجرت نہ کرنی پڑے۔ اس پر حاطب نے کہا کہ حضرت عیسیٰ بھی تو نبی تھے۔ انہوں نے کیوں دعا نہ کی کہ صلیب پر کھینچے نہ جاتے۔ چنانچہ کتاب استیعاب (کسی کتاب یا مضمون وغیرہ کو شروع سے آخر تک پڑھنا، تمام) سے مدارج النبوۃ میں یہ واقع نقل کیا ہے۔

نہ صرف حضرت حاطب نے شاہ مقوقش کے سامنے طریقہ صلیب کو تسلیم کیا بلکہ حضرت عمر خلیفہ الرسول کے ایک قول سے یہی ظاہر ہے کہ وہ ابن مریم کی وفات کے قائل تھے۔ چنانچہ کتاب ملل و نحل کے شروع میں (ص ۹ مصری) لکھا ہے کہ

> ''حضرت عمر نے وفات رسول کے بعد یہ کہا تھا کہ اگر کوئی کہے گا کہ محمد مر گیا تو میں تلوار سے اس کو قتل کر دوں گا۔ وہ تو آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے ہیں۔ جس طرح عیسیٰ بن مریم اٹھا لیے گئے''۔

اس روایت کو ابوالغدا نے بھی بیان کیا ہے کہ

> ''قاضی شہاب الدین ابی الدم اپنی تاریخ میں یہ لکھتے ہیں کہ بعد وفات پیغمبر خدا، ایک گروہ پیغمبر پر ہجوم کر کے مجتمع (جمع کیا ہوا) ہوا۔ سب لوگ حضرت کو دیکھتے اور مضطرب و پریشان ہو کر یہ کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ فوت نہیں ہوئے بلکہ مثل عیسیٰ مسیح آسمان پر چلے گئے ہیں اور دروازے پر یہ منادی کر دی کہ حضرت کو دفن نہ کرنا کیونکہ آپ فوت نہیں ہوئے۔ چنانچہ آپ کا جنازہ ویسے ہی رکھا رہا اور اس کو دفن کرنے نہ دیا''۔

شمائل ترمذی میں ہے کہ

> ''رسول اللہ شنبہ (ہفتہ) کو فوت ہوئے اور اس روز آپ کی لاش رکھی رہی اور پھر منگل کی رات کو اور منگل کے دن رکھی رہی اور آپ منگل کی رات کو دفن ہوئے''۔

جب ہم یہ واقعہ مد نظر رکھتے ہیں کہ خداوند مسیح کی موت جمعہ کے روز ہوئی اور ہفتہ کی رات بھر اور ہفتہ کا دن اور اتوار کی رات آپ قبر میں رکھے رہے اور اتوار کی صبح کو آپ مردوں میں سے زندہ ہو گئے تو ظاہر ہے کہ صحابہ رسول عربی کو اس حقیقت کا علم تھا کہ آپ تیسرے روز مردوں میں سے جی اٹھے تھے اور کہ وہ خیال کرتے تھے کہ جس طرح ابن مریم وفات کے بعد تیسرے روز زندہ ہو کر اس کے بعد آسمان پر اُٹھا لئے

گئے تھے اسی طرح رسول بھی تیسرے روز زندہ ہو کر آسمان پر اٹھا لیے جائیں گئے۔ لیکن جب یہ مدت گزر گئی اور لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ زندہ نہ ہوں گے تب آپ کو دفن کیا گیا۔

چنانچہ ابوالغد الکھتا ہے کہ

''صحیح روایت یہی ہے کہ حضرت رسول چوتھے روز مدفون ہوئے''۔

مذکورہ بالا واقعات سے ظاہر ہے کہ رسول عربی کے صحابہ کے خیالات کسی طرح بھی مسیحی عقیدہ موت و رفع مسیح کے خلاف نہ تھے۔ مولوی محمد احسن صاحب اپنی کتاب (جس کا ہم نے سطور بالا میں اقتباس کیا ہے) میں لکھتے ہیں کہ

''مسیح نے اپنی جان خود بخود دے دی تھی''

بالکل انجیل شریف کے بیان کے مطابق ہے چنانچہ انجیل یوحنا میں وارد ہوا ہے کہ منجی جہاں نے فرمایا''اچھا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ باپ مجھ سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں تاکہ اسے پھر لے لوں۔ تاکہ اسے پھر لے لوں۔ کوئی اسے مجھ سے نہیں چھینتا بلکہ میں اسے آپ ہی دیتا ہوں مجھے اس کے دینے کا اختیار ہے اور اسے پھر لینے کا بھی اختیار ہے''(یوحنا ۱۰: ۱۱۔۱۸)اور پلاطوس نے آپ سے کہا''کیا تو نہیں جانتا کہ مجھے اختیار ہے کہ چاہوں تجھے صلیب دوں، چاہوں تو تجھے چھوڑ دوں؟''آپ نے فوراً اس کو جواب دیا کہ ''اگر یہ اختیار تجھے قیصر سے نہ دیا جاتا تو مجھ پر تیرا کچھ اختیار نہ ہوتا''۔(یوحنا ۱۹: ۱۰۔۱۱)اسی کے موافق (متی ۲۶: ۲۴) میں آپ کا قول ہے کہ ''ابن آدم تو جاتا ہے جیسا اس کے حق میں لکھا ہے لیکن اس آدمی پر افسوس جس کے وسیلے وہ حوالے کیا جاتا ہے''۔ بجنسہ اسی پہلو سے کہ یہود غلط کہتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کیا۔ مسیح کی موت تو خدائے عزوجل کے مقصد کے مطابق ہے اور مسیح کی اپنی رضا و خوشی سے وقوع میں آئی تھی۔

مسلمان علماء مذکورہ بالا نکات کو نہ انہوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ کا کچھ سمجھتے پھرے اور بھٹک گئے۔ ایسا کہ ان کو کہنا پڑا'' لا یعلم تاویلہ الا اللہ''۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ ان کی تاویلیں صحیح نہیں ہیں کیونکہ وہ خدا کے پہلے کلام، انجیل کی ضد ہیں۔ انہوں نے خدا کے حکم (**فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ**) (سورۃ النحل آیت ۴۳)

(مسلمانو! اگر تم کو کسی بات کا علم نہ ہو تو اہل کتاب (بائبل والوں) سے پوچھ لیا کرو۔

کو بالاطاق رکھ دیا اور راہ راست سے بھٹک گئے۔ اگر وہ اس الٰہی حکم پر عمل کرتے تو من مانی تاویلیں نہ کرتے۔ ان کو اصل واقعات کا علم ہو جاتا اور اپنے خیالوں سے دست بردار ہو کر ایسی تاویلیں کرتے جو خدا کے کلام کے مطابق ہوتیں۔

قرآنی لفظ رفع کا صحیح مفہوم

بعض مسلمانوں معترض ابن اللہ کے رفع آسمانی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآنی آیات کے الفاظ **ورافعک الی** اور **رفعہ اللہ الیہ** سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم بر جسد عنصری آسمان پر زندہ موجود ہیں ان قرآنی الفاظ سے صرف آپ کی رفعت منزلت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ تاویل کوئی نئی تاویل نہیں ہے بلکہ صدیوں پرانی ہے جس کا مسیحی علماء نے بار بار پول کھول دیا ہے چنانچہ ہم مرحوم قدوۃ المتکلمین نے امام المناظرین الحاج مولانا پادری سلطان محمد خاں افغان کابلی کا قاطع اور ساطع جواب معترضین کی تسلی کے لئے ذیل میں درج کئے دیتے ہیں سلطان القلم لکھتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ بہ جسد عنصری آسمان پر زندہ ہیں

مخالفین فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سوال ان کے آسمان پر اُٹھائے جانے کا ہے جس کے ثبوت میں **رافعک الی** اور **رفعہ اللہ الیہ** کے الفاظ یہ پیش کئے جاتے ہیں لیکن یہاں رفع (اٹھانے) سے مراد رفع جسم (جسم کا اٹھانا) نہیں بلکہ رفعت مرتبت مراد ہے۔ جیسا کہ مفردات امام راغب اور تفسیر کبیر میں بھی صراحتاً مذکور ہے۔ عربی میں رفع کے معنی قدر کے بھی آتے ہیں اور رفیع اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو معزز بلند و مرتبت والا ہو"۔ جو سراسر غلط اور قرآن مجید کے ساتھ کھیلنا ہے۔ صراح (کھلی اور صاف بات چیت، ایک عربی لغت) میں جو عربی لغات میں ایک ممتاز لغت ہے "رفع" کے معنی اوپر اُٹھانے کے ہیں اور اس کے بالمقابل لفظ وضع ہے جس کے معنی نیچے رکھنے کے ہیں مصباح منیر میں لکھا ہے کہ **رفعتہ رفعا خلاف خفضتہ** یعنی عرب جب کسی چیز کو اوپر اٹھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "خفضتہ" میں نے اس کو نیچے رکھا۔ یعنی رفع اور خفض دو متقابل الفاظ میں جو ایک دوسرے کے برخلاف استعمال ہوتے ہیں۔

صراح میں لفظ "رفع" کے نیچے ایک محاورہ بھی لکھا ہے کہ "**ومن ذلک قو لھم رفعہ الی السلطان**" جس سے بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ جب لفظ رفع کا صلہ الیٰ آتا ہے تو اس سے مراد "رفت مرتبت" ہوتی ہے جب اس محاورہ کی بنا پر حضرت عیسیٰ کے رفع جسمی سے انکار کرنا نہ صرف عربی سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے بلکہ فارسی تک نہ جاننے کا ثبوت ہے کیونکہ اس عربی محاورہ کے شروع میں یہ فارسی عبارت موجود ہے "ونزدیک گردانیدن کسے رابہ کسے و من ذلک" الخ (جب کوئی بات ادھوری چھوڑ دی جائے تاکہ بات طوالت کی وجہ سے لمبی نہ ہو) یعنی رفع کے دوسرے معنی کو کسی کو کسی کے قریب کرنے کے ہیں اور اسی قبیل (جنس، خاندان) سے عربوں کا یہ محاورہ ہے کہ میں اس کو بادشاہ کے نزدیک لے گیا" اب کوئی ان مدعیان عربیت سے پوچھے کہ "نزدیک گردانیدن کسے رابہ کسے" کے معنی کس طرح رفعت و مرتبت کے ہو سکتے ہیں کسی کو کسی کے نزدیک کرنے میں قرب جسمی ملحوظ ہوتا ہے نہ یہ کہ کسی شخص کو گھر میں بیٹھے بٹھائے عزت و منزلت دلانا۔ پس **رفعتہ الی السلطان** کے یہ معنی ہیں کہ "میں اس کو بادشاہ کے پاس لے گیا۔ عزت اور ذلت کا اس میں کوئی لحاظ نہیں کیونکہ یہی محاورہ عین اس وقت بھی بولا جاتا ہے جب کسی کو شکایتاً بادشاہ کے پاس لے جاتے ہیں **منتہی الارب** میں اس محاورہ کے نیچے کہ **رفعہ الی الحاکم** لکھا ہے کہ "شکایت بردپیش حاکم ونزدیک آں شد باخصم"۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں بھی اس محاورہ کے نیچے کہ "**رفعہ الی الحاکم**" احضرہ للشکوہ لکھا ہے۔ "یعنی شکایت کے لیے اس کو حاکم کے پاس لے گیا (جزء ۹)

نکتہ

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صراح کی عبارت زیر بحث کا مطلب یہ ہے کہ اگر "رفع جسمی" کے ساتھ مرتبت و منزلت کا بھی ارادہ ہو تب رفع کا صلہ الیٰ لانا مناسب ہے کیونکہ رفعت منزلت رفع جسمی کے منافی نہیں۔ لیکن اس صورت میں لانا قرینہ کا ہونا ضروری ہے تاکہ ارادہ اعزازی پر دلالت کرے کیونکہ جب رفع کا صلہ الیٰ آتا ہے تو اکثر اس کے معنی صرف رفع جسمی کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ امثلہ ذیل اس کی شاہد ہیں۔

صحیح بخاری۔ جلد اول۔ وکالہ کا بیان۔ حدیث ۲۲۱۴

مَا هُوَ قَالَ إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَأْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ حَتَّى تَخْتِمَ الْآيَةَ فَإِنَّكَ لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللَّهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرَبَنَّكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ الْبَارِحَةَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ زَعَمَ أَنَّهُ يُعَلِّمُنِي كَلِمَاتٍ يَنْفَعُنِي اللَّهُ بِهَا فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ مَا هِيَ قُلْتُ قَالَ لِي إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَأْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ مِنْ أَوَّلِهَا حَتَّى تَخْتِمَ الْآيَةَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَقَالَ لِي لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللَّهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرَبَكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ وَكَانُوا أَحْرَصَ شَيْءٍ عَلَى الْخَيْرِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوبٌ تَعْلَمُ مَنْ تُخَاطِبُ مُنْذُ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ لَا قَالَ ذَاكَ شَيْطَانٌ

ترجمہ: عثمان بن ہشیم کہتے ہیں کہ ہم سے عوف نے حدیث بیان کی کہ وہ محمد بن سرین سے وہ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ مجھ کو آنحضرت نے صدقہ عید فطر کی نگہبانی پر مقرر کیا تھا کہ ایک شخص آکر اس میں سے لب بھر کر جانے لگا میں نے اسے پکڑ لیا پھر میں نے کہا کہ تجھ کو رسول کے پاس ضرور لے جاؤں گا اور پوری حدیث بیان کی اس نے بتایا کہ جب تو اپنے بستر پر آرام کرے۔ تو آیتہ الکرسی پڑھ لیا کر۔ ہمیشہ تیرے ہمراہ اللہ نگہبان رہے گا اور صبح تک شیطان تیرے پاس بھٹکنے نہ پائے گا۔ آنحضرت نے فرمایا اس نے سچ کہا حالانکہ وہ جھوٹا ہے وہ شیطان تھا۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں ''جملہ لارفعتک الی رسول اللہ'' کی شرح میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے کہ ای ذہبن بک اذذکوک بقال رفعہ الی الحاکم اذا حاضرہ للشکویٰ یعنی میں بالضرور تجھ کو رسول اللہ کی جناب میں تیری شرارت کے سبب لے جاؤں گا اور تیری شکایت بجا ہے۔

بیچارے مخالفین اور ان کے ہمنوا ذرا غور تو کریں کہ کیا حضرت ابو ہریرہ جیسے جلیل القدر صحابی (معاذ اللہ) شیطان کو عزت دلانے کی غرض سے آنحضرت کے پاس لے جانا چاہتے تھے۔

(۲) مصباح منیر میں لفظ ''رفع'' کی تحت میں لکھا ہے کہ

''رفعت از رع الی الیہود جس کا ترجمہ صراح۔ منتہی الارب و منتخب اللغات میں یہ لکھا ہے کہ برداشتم غلہ دور ودہ وبجز من گاہ آوردم یعنی ''کھیت کو کاٹنا اور غلہ اُٹھا کر خرمن گاہ (کھلیان، انبار) میں لے آیا''۔

قاموس اور اساس البلاغہ میں بھی لکھا ہے۔

(۳) صحیح بخاری اور مسلم اور مشکوۃ المصابیح باب البکاء علی المیت کے (صفحہ ۱۵۰) مجتبائی میں آنحضرت کی بیٹی زینب کے فرزند ارجمند کے فوت ہونے کی حدیث میں یہ جملہ ہے کہ

فرفع الیٰ رسول اللہ الصبیی

''یعنی وہ لڑکا آپ کے پاس اٹھا کر لایا گیا''

کیااس محاورہ کوپڑھ کر پھر بھی آپ رفع جسمی کے قائل نہ ہوں گے۔

(۴) مجمع البحار جلد ثانی میں لفظ رفع کے نیچے لکھا ہے کہ

فرفعه الےٰ یدہ ای رفعه الیٰ غلیة طول یدہ لیراہ الناس فیفطرون ۔

''یعنی آنحضرت نے پیالہ کو دست مبارک کی لمبائی کے برابر اوپر کو اٹھایا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں اور روزہ افطار کریں''۔

غرض ہمیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں اس قسم کی مثالیں معلوم ہیں جن سے بہ صراحت ظاہر ہوتا ہے کہ جب رفع کا صلہ الیٰ آتا ہے تو اس قسم کے معنی شے مذکور کو مدخول الیٰ کی طرف اُٹھانے کے ہوتے ہیں۔

بہر کیف نعمت میں ''رفع'' کے حقیقی اور وضعی معنی ''اوپر کو اُٹھانے کے ہیں پس جہاں نہیں کا مفعول مادی ہو وہاں اس سے مراد اوپر کو حرکت کرنا ہو گی اور اگر اس کا متعلق اور معمول کوئی غیر مادی شے ہو تو اقتضائے مقام پر محمول ہو گا چنانچہ مصباح منیر میں لکھا ہے۔ کہ

فی الاجسام حقیقة فی المحرلة والانتقال وفی المعانی علیٰ مایقیضیه المقام۔

یعنی رفع کا تعلق جب اجسام کے ساتھ ہوتا ہے تو اس کے حقیقی معنی حرکت اور انتقال کے ہوتے ہیں اور جب معنی کے متعلق ہوتا ہے تو جیسا موقع ہو ویسی ہی مراد ہوتی ہے۔

مصباح کی اس تصریح سے صاف ظاہر ہے کہ ''رفع'' کے حقیقی معنی وانتقال اور حرکت کے ہوتے ہیں اور امثلہ مافوق سے ثابت ہو گیا ہے کہ رفع کے حقیقی ووضعی معنی انتقال اور حرکت کے ہوتے ہیں اور امثلہ مافوق سے ثابت ہو گیا کہ ''رفع کا صلہ جب ''الیٰ'' آئے تو اس کے معنی شے مذکور کے مدخول الیٰ کی طرف مرفوع ہونے کے ہوتے ہیں ''پس ورافعک الی کے معنی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ حضرت عیسیٰ بہ جسد عنصری آسمان پر زندہ اور موجود ہیں۔

دوسرا نکتہ

چونکہ ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس بحث کا کامل طور پر یقینی تجزیہ کریں۔ لہٰذا یہاں پر ایک اور نکتہ لکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ کنایہ (رمز ،اشارہ) اور مجاز میں یہ فرق ہے کہ کنایات میں اصلی اور حقیقی معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں اور مجازات میں نہیں چنانچہ مختصر معانی میں جو اس فن میں ایک اعلیٰ پایہ کی درسی کتاب ہے لکھا ہے کہ

الکنایة فی اللغته مصدر کنیت بکذاعن کذاوکنوت اذا ترکت التصریح به وفی الاصطلاح لفظ اوبد به لازم معناہ مع جوازادادته معه ای ارادة ذلک المعنی مع لاذمه کلفظ طویل التجاوالمر الدبه طویل القامة مع جواذان یرادحقیقةطول التجا دایضا تظهر انهاتخالف الجارمع ارادةطول القامه مخلاف المجازفانه لایجوزفیه ارادة المعنی الحقیقی الزوم القرینة والمانعة عن ارادة المعنی الحقیقی۔

یعنی کنایہ معتل (کمزور، اصطلاح علم صرف میں وہ فعل یا اسم جس میں حرف علت ہو) یائی یا وادی ہے اور اس کے لغوی معنی مبہم بات کہنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس لفظ کو کہتے ہیں جس کے معنی کا لازم مراد ہو اور اس کے ساتھ اس لفظ کے اصلی معنی کا ارادہ بھی جائز ہو۔ مثلاً

طویل النجاد یہ ایک محاورہ ہے جس کے لازمی معنی ''دراز قامت'' کے ہیں لیکن اس کے ساتھ اس کے حقیقی معنی ایسے پرتلہ والا مراد لینا بھی جائز ہے پس ظاہر ہے کہ کفایہ اور مجاز میں یہی فرق ہے کہ کنایہ میں لازمی اور حقیقی دونوں معنی جمع ہو سکتے ہیں اور مجاز حقیقی معنی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا ہے۔

پس ''رافعک الی'' کے معنی کنائی (بشر طیکہ) ایساہی ہو بھی ہمارے لیے مضر نہیں بلکہ مفید ہے کیونکہ یہ دونوں معنی ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ رفع جسمی کے ساتھ مرتبت کا ہونا ایک نبی برحق کے لیے نور ہے جیسا کہ آیت ذیل میں بھی یہ دونوں باتیں ثابت ہیں کہ ''ورفع والدیہ علی العرش'' ''یعنی یوسفؑ نے اپنے والدین کو تخت پر چڑھا کر بٹھایا''۔ اس رفع جسمی کے ساتھ عزت واکرام بھی ملحوظ ہے۔

جاہلوں سے کچھ بعید نہیں اگر یہ کہیں کہ ہم تو اس کے مجازی معنی مراد لیتے ہیں لہٰذا مناسب ہے کہ ان کو بھی یہ بتلائیں کہ آیت ''ورافعک الی'' کے مجازی معنی بھی مراد نہیں ہو سکتے ہیں کیونکہ مجاز کے لیے یہ شرط ہے کہ حقیقی معنی لینے سے اگر قباحت (خرابی) لازم آجائے یا کوئی قرینہ ایسا ہو کہ حقیقی معنی لینے سے منع کریں۔ چنانچہ مختصر معانی میں لکھا ہے کہ

'' المجاز مفرد ومرکب اماالمفرد فھوالکمۃ المستعملہ فی غیر یا وصنعت فی اصطلاح بہ التخاطب علیٰ وجہ یصح مع قرینہ عدم ارادۃ ای ارادۃ الموضوع لہ''

''یعنی مجاز وہ کلمہ ہے جو اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہ ہو اور کوئی قرینہ بھی قائم ہو جس سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ کلمہ کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں''۔

چونکہ آیت زیر بحث ہے حقیقی معنی لینے میں نہ تو کوئی قباحت لازم آتی ہے اور نہ اس میں کوئی قرینہ اس قسم کا ہے جو حقیقی معنی کے اختیار کرنے کو روکے لہٰذا آیت مافوق کے مجازی معنی لینا سراسر باطل ہے۔

اسی اصل زریں کو مد نظر رکھ کر قرآن مجید نے جہاں کہیں لفظ ''رفع'' کو بہ معنائے ''رفعت مرتبت'' استعمال کیا ہے۔ ان کل مقامات میں کوئی نہ کوئی قرینہ اس قسم کا قائم ہے جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں معنی موضوع لہ (حقیقی) مراد نہیں ہے مثلاً

(وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا) (سورۃ مریم آیت ۵۷)

(نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ) (سورۃ یوسف آیت ۷۶)

(وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ) (سورۃ الانعام آیت ۱۶۵)

(رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ) (سورۃ الزخرف آیت ۳۲) ان تمام آیات میں الفاظ '' مکاناً علیاودرجات '' قرینے (ڈھنگ ترتیب) ہیں اس بات کے کہ لفظ ''رفع'' اپنے اصلی معنی میں مستعمل نہیں ہے۔

امام راغب اور امام رازی پر تہمت

ہمارے مخالفین کا یہ کہنا کہ یہاں رفع (اُٹھانا) سے مراد ہے جیسا کہ مفردات امام راغب اور تفسیر کبیر میں بھی صراحتاً موجود ہے۔ امام راغب اور تفسیر کبیر میں بھی صراحتاً مذکور ہے۔ امام راغب اور امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہما پر بہتان باندھنا اور سفید چشمی کی تہمت لگانا ہے کسی امر کی تحقیق کے لئے قابل وثوق اشخاص کا صرف نام لے لینا کافی نہیں ہو سکتا ہے تاوقتیکہ ان کے تحریری بیان بھی پیش نہ کئے جائیں چونکہ ان کی

کتابیں مخالفین کی نظر سے نہیں گزری ہیں اس لئے سماعی طور پر ان کا نام لکھ دیا جائے۔ مخالفین کی خاطر ہم ان دونوں کی عبارات نقل کئے دیتے ہیں۔

(۱)امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ اسی آیت کے تحت میں لکھتے ہیں کہ

وقد ثبت بالله لیل انه حی ویں دالخبر عن النبی انه سینزل ویقتل الدجال ثم انه تعالیٰ تیوفاہ بعد ذلک

یعنی بے شک یہ بات دلیل سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں اور اس بارے میں رسول عربی سے حدیث بھی آچکی ہے کہ آپ اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے اور پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ آپ کو وفات دے گا (تفسیر کبیر جلد دوم)(ماہنامہ اخوت اپریل ۱۹۴۶ء)۔

مشبہ لھم کی اسلامی تاویل

مذکورہ بالا الفاظ ماقتلوہ وماصلبوہ کی دو تاویلیں (جو سطور بالا میں لکھی گئی ہیں) ہم محض قرآن واسلام پیش کر رہے ہیں تاکہ قرآن مجید پر اس معاملہ میں حرف آنے نہ پائے اور اہل اسلام کے علما کو اس مخمصہ سے نکلنے کی کوئی راہ سوجھے جائے غور ہے کہ انجیل متی کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ یہوداہ غدار جمعہ کی صبح کو یہود کی صدر عدالت کے فیصلہ کے عین بعد خود پھانسی لے کر مر چکا تھا (متی ۲۷: ۱۔۱۰)۔

دریں حال وہ مردود آنخداوند کی شباہت میں صدر عدالت کے سامنے فیصلہ سے پہلے دوران مقدمہ میں کس طرح حاضر کیا جاسکتا تھا؟ سردار کاہن المسیح اور یہوداہ غدار دونوں سے بخوبی واقف تھے کیونکہ وہ آپ کو قتل کروانے پر تلے ہوئے تھے (یوحنا ۱۱: ۴۸۔۵۲)۔ اور یہوداہ سے سودا بازی کر چکے تھے پس وہ اور صدر عدالت کے دیگر شرکا کس طرح دھوکا کھا سکتے تھے؟ علاوہ ازیں صدر عدالت کے ''سرداروں میں سے بھی بہتیرے آنخداوند پر ایمان لا چکے تھے مگر خوف کے مارے علانیہ اقرار نہ کرتے تھے'' (۱۲: ۴۲؛ ۳: ۱؛ ۷: ۱۳ وغیرہ) وہ کس طرح دھوکا کھا گئے۔ ارمیتہ کا ''سردار'' مشیر یوسف جس نے پلاطوس سے مصلوب کی لاش مانگی اور اس کو قبر میں رکھا (لوقا ۲۳: ۵۰۔۵۳) کس طرح دھوکا کھا سکتا تھا؟ اور لوگوں کی بڑی بھیڑ اور بہت سی عورتیں جو خداوند کے واسطے روتی پیٹتی آپ کے پیچھے چلیں'' (لوقا ۲۳: ۲۷) یہ سب کس طرح دھوکا کھا گئے؟ ام المومنین حضرت بی بی مریم جن کا قراۃ العین (جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے، نور چشم، بیٹا) مصلوب ہوا اور آپ کے دوازدہ (بارہ ۱۲) رسول اور ہزاروں متبعین جو عید کے لیے آئے تھے اور اس واقعہ ہائلہ (ہائل کی جمع، ہولناک) کے چشم دید گواہ تھے وہ کس طرح دھوکا کھا سکتے تھے۔ ''کیونکہ یہ ماجرا کہیں کونے میں تو ہوا نہیں تھا'' (اعمال ۲۶: ۲۶)۔ بلکہ دن دہاڑے دوپہر کے وقت ان کے سامنے ہوا تھا جو زیارت اور عید کی خاطر ارض مقدس کے کونہ کونہ سے آئے تھے۔ جن کے اندھے بہروں، لنگروں، کوڑھیوں مفلوجوں، لنجوں، گونگوں، مردوں عورتوں اور بچوں کو آپ نے اپنے مسیحائی دم سے شفا بخشی تھی، جن کے مردوں کو آپ نے زندہ کیا تھا اور جو تین سالوں تک آپ کا پیام سنتے اور معجزات بینات دیکھ کر حیرت زدہ ہوتے رہے تھے اور پاپیدل کشتیوں پر سفر کر کے آپ کے دیدار کی خاطر دوڑتے آتے تھے (مرقس ۶: ۳۴)۔ کیا یہ ہزاروں اشخاص سب کے سب دھوکا کھا گئے؟ قرآنی الفاظ 'شبہ لھم'' کی تاویل صریحاً باطل ہے جس پر عاقل قرآنی الفاظ ''**مالھم به من علم الا اتباع الظن**'' کا اطلاق کر کے اس نظریہ کو رد کرے گا۔

(۲) کیا یہ بات کسی سلیم العقل (عقل رکھنے والا دانا) شخص کے قبول کرنے کے لیے پیش کی جاسکتی ہے کہ ایک طرف تو قرآن مجید دل کھول کر بار بار انجیل جلیل کی تصدیق کرے اور اس کو (ھدی الناس) قرار دے اور دوسری طرف ایک ایسے واقعہ کا انکار کر دے جو اس کتاب کے ہر

صحیفہ کا مرکز ہے ؟مزید براں قرآن اس صلیبی واقعہ کا ذکر تین مختلف مقامات میں اور مختلف سیاق وسباق میں اثبات میں کرے : اگر قرآنی تصدیق اور قرآنی آیات (جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے) صحیح ہیں تو جو نظریہ انکے خلاف ہو گا وہ ان کی تکذیب (جھوٹ بولنے کا الزام لگانا) کرے گا۔ لہٰذا وہ غلط اور باطل تصور ہو گا کیونکہ اس قسم کے در نقیض (اُلٹ، مخالف) دعوے جمع نہیں ہو سکتے اور نہ از روئے منطق محال امر ہے۔

اس آیت کی نسبت امام رازی چند مشکلات کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ

> ''مشکل یہ ہے کہ درآنحال یہ کہ خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو آپ کے دشمنوں کے ہاتھ سے خلاصی دینے پر قادر تھا اور آپ کو آسمان کی طرف اٹھا سکتا تھا پھر آپ کی صورت غیر پر ڈالنے سے کیا فائدہ ہوا؟ کیا ایک غریب مظلوم بے گناہ آدمی کی شکل بدل کر اس کو قتل کے لیے بغیر کسی فائدہ کے حوالے کرنا انصاف سے بعید نہیں ہے ؟ایک اور مشکل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی صورت مبدل گئی اور اس کے بعد آپ کو آسمان پر اٹھایا گیا اور قوم نے یہ یقین کر لیا کہ وہ عیسیٰ تھا جو مارا گیا، حالانکہ وہ عیسیٰ نہ تھا۔ یہ گویا خلقت کو جہالت اور فریب میں ڈالنا ہے جو خدا کی شان کے لائق نہیں۔ علاوہ ازیں نصاریٰ کثرت سے مشرق سے لے کر مغرب تک باوجود یہ کہ وہ مسیح عیسیٰ علیہ السلام سے سخت محبت رکھتے اور آپ کی شان میں سخت مبالغہ کرتے ہیں، پھر بھی وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ آپ کے مقتول و مصلوب ہونے کے گواہ ہیں۔ پس اگر ہم اس سے انکار کریں تو یہ گویا ایسی بات کا جو تواتر کے ساتھ پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، انکار کرنا ہو گا اور تواتر سے انکار کرنا نبوت محمد، موت عیسیٰؑ، بلکہ ان دونوں کے وجود اور تمام انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام کے وجود سے احتمالات پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے احتمال پیدا کرنے والے سوال جو نص قاطع کے مخالف ہوں، منع ہیں اور خدا ہدایت کو دوست رکھنے والا ہے''۔

(رازی جلد دوم صفحہ ۶۹۰تا۶۹۲)

ناظرین۔ دیکھا آپ نے، ملہم رسولوں کے چشم دید واقعہ کا انکار اور قرآن مجید کی صریح نص کا انکار کس طرح ایک مستند مفسر کو ایک مشکل سے نکالنے کی اس کی بجائے مشکلات میں اضافہ کر دیتا ہے اور مجبور ہو کر شکوک کو رفع کرنے کے بجائے خدا کی آڑ لیتا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج

تاثر یامی ردد دیوار کج

ابن اللہ کی صلیبی موت کا مقصد

ہم سطور بالا میں لکھ چکے ہیں کہ خداوند مسیح کی پیدائش کی بشارت دیتے وقت خدا کے فرشتے نے بتلایا تھا کہ آنجناب کی آمد کا اصلی مقصد دنیا کے گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی غلامی سے آزاد کرنا ہے۔ چنانچہ مقدس یوحنا انجیل نویس جو صاحب الہام تھے لکھتے ہیں کہ ''خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا ابن وحید دنیا میں بھیجا تا کہ جو کوئی اس پر ایمان لائے وہ تباہ و برباد نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے''(یوحنا۳:۱۶)۔ کلمۃ اللہ تمام زندگی بھر خدا کی لازوال محبت کو اپنی گفتار اور کردار سے گنہگاروں پر ظاہر کرتے رہے اور فانی زندگی کے تمام ہونے کے بعد آخر میں اپنی صلیبی موت سے آپ نے خدا کی محبت کے جلال کے انوار (نور کی جمع) ضیا پاشوں (روشنی پھیلانے والا) اس گناہ بھری دنیا کے تاریک ترین مقاموں کو روشن کر دیا۔ صلیب نے ثابت کر دیا کہ خدا بنی آدم سے ازلی اور ابدی پیار کرتا ہے اولاد آدم میں کلمۃ اللہ (اور فقط کلمۃ اللہ) ایک واحد انسان ہے جس نے اپنی

موت سے نوع انسانی کو خدا کی محبت اور گناہوں کی مغفرت کا نہ صرف یقین دلایا بلکہ ان کو نئی پیدائش کی بشارت دے کر از سر نو خدا کے فرزند بنا دیا یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ محبت کا جوہر ایثار اور قربانی ہے منجی عالمین کے بے عدیل ایثار اور بے نظیر قربانی ہے یہ حقیقت اظہر من الشمس کر دی ہے کہ خدا کی ذات محبت ہے جس کا کامل اور اکمل ظہور اس کے مظہر ابن وحید کی تعلیم، زندگی، کردار اور سب سے زیادہ صلیبی موت پر ہوا۔

داد دیتے ہیں ظرف کی اس کے
جس نے دشمن گلے لگایا ہے

(بخت)

کلمۃ اللہ کی صلیب نے دنیا کو دار درسن کا فلسفہ سکھا دیا ہے۔ گذشتہ پچاس سال میں ہمارے ملک کے ہم وطنوں نے خداوند مسیح کی تقلید کر کے کل دنیا کے ممالک و اقوام پر یہ روشن کر دیا ہے کہ۔

جو بھی زیب صلیب ودار ہوئے
دونوں عالم کے شاہکار ہوئے

(رفعت سلطان)

ابن اللہ نے صلیب پر سے عالم و عالمیان کو خدا کی محبت و ایثار کا ایسا سبق سکھایا ہے جو گناہگار انسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

مریم کی آبرو کا یوں جاگا ہے اب نصیب
ہر داغ دل چراغ ،تو ہر شاخ گل صلیب

(بخت)

کلمۃ اللہ سے پہلے کسی ماں جائے نے نہ یہ سبق سیکھا اور نہ کسی کو سکھایا۔ اسی واسطے ان کی یاد تک محو ہو گئی۔ نہ ان کی یاد تک محو ہو گی نہ ان کے نام زندہ رہے اور نہ ان کے مذاہب اور نہ ان کے پیرو۔

از ہستی باز بروے زمیں تک نشاں نماید

سچ ہے۔

بجھے چراغ پہ آتے نہیں ہیں پروانے

یہ فضیلت خداوند مسیح اور صرف خداوند مسیح ہی کو حاصل ہے۔

بن گئے جب چراغ محفل ہم
اک جہان کو ملی ضیا ہم سے

(بخت)

کلمۃ اللہ نے نہ صرف اپنی زندگی سے خدا کی محبت لوگوں پر ظاہر کی بلکہ آپ نے اپنی صلیبی موت سے تمام دنیا پر ظاہر کر دیا کہ بنی آدم سے ازلی اور ابدی محبت رکھتا ہے۔ مذاہب عالم میں سے کسی مذہب کے بانی نے اپنی موت سے خدا کی محبت رکھتا ہے۔ مذاہب عالم میں سے کسی مذہب کے بانی نے اپنی موت سے خدا کی محبت کا جلال ظاہر نہ کیا۔ بنی آدم میں سے صرف ابن اللہ کی شخصیت ہی ایک ایسی واحد شخصیت ہے جس نے اپنی

موت سے بنی نوع انسان کو خدا کی محبت اور مغفرت کا یقین دلایا یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ محبت کا جوہر ایثار اور قربانی ہے اور خداوند مسیح کے بے عدیل ایثار اور بے نظیر قربانی نے یہ حقیقت اظہر من الشمس کر دی ہے کہ خدا محبت ہے جس کا وہ خود مظہر ہے۔انشاءاللہ ہم باب چہارم میں اس موضوع پر مفصل بحث کریں گے۔

ابن اللہ کی ظفریاب قیامت

انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں صحف سماوی اس حقیقت پر اتفاق ہیں کہ خداوند مسیح اپنی موت کے بعد اور قبر پر فتح پاکر پھر خدا کی قدرت سے زندہ ہوگئے۔ہر چہارانا جیل میں واقعہ قیامت مسیح کو مفصل طور پر لکھا گیا ہے (متی ۲۷: ۶۲؛ ۲۸: ۱۵؛ مرقس ۱۶ باب ؛لوقا ۲۴ باب ؛یوحنا ۲۰۔۲۱ باب)انجیلی بیانات کی تفصیل سے ہر روشن دماغ شخص پر عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ افسانے نہیں بلکہ تاریخی بیانات کی تفصیلات ہیں ۔انجیل جلیل کے دیگر مقامات میں اس اہم ترین تاریخی واقعہ کے ثبوت دئے گئے ہیں۔چنانچہ مقدس پولوس رسول کرنتھیوں کے پہلے خط کے پندرھویں طویل باب میں آنخداوند کی قیامت چشم دید شہادت اور دیگر دلائل پیش کرتے ہیں۔خود کلمۃ اللہ کی زبان حقیقت ترجمان پر اس واقعہ کا بار بار ذکر آتا ہے مثلاً لکھا ہے کہ جب آپ آخری بار یروشلیم کو جارہے تھے تو آپ نے اپنے رسولوں کو جو آپ کے ہمراہ تھے فرمایا ''ہم یروشلیم کو جاتے ہیں وہاں ابن آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے حوالہ کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے رومیوں کے حوالہ کریں گے۔جو اس کو ٹھٹھوں میں اڑائیں گے۔اس پر تھوکیں گے اور اس کو کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے پر وہ تیسرے روز مردوں میں جی اٹھے گا لیکن وہ اس بات کو نہ سمجھے اور اس سے پوچھتے ہوئے ڈرتے تھے (مرقس ۱۰: ۳۳۔۳۴؛ ۹: ۳۱۔۳۲ وغیرہ)

قرآن مجید میں کلمۃ اللہ کی قیامت کا واقعہ صرف مجملاً وارد ہوا ہے چنانچہ ایک آیہ میں ہے کہ حضرت کلمۃ اللہ نے فرمایا والسلام علی یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیا۔یعنی مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا۔

جس دن میں مروں گا اور

ہر چہار انا جیل قیامت مسیح کے واقعہ کو مفصل طور پر لکھتی ہیں (متی ۲۷: ۶۲؛ ۲۸: ۱۵؛ مرقس ۱۶ باب ؛لوقا ۲۴ باب ؛یوحنا ۲۰۔۲۱ باب)ان بیانات کی تفصیل ہر عاقل شخص پر یہ حقیقت روشن کر دیتی ہے کہ یہ بیانات افسانے نہیں بلکہ تاریخی بیانات ہیں۔جس دن میں پھر جی کر اُٹھ کھڑا ہوں گا (سورہ مریم آیت ۳۴) قرآن میں ایک اور آیت ہے جو نہایت معنی خیز ہے۔

(وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ) (سورۃ الزخرف آیت ۶۱)

یعنی عیسیٰ تو قیامت کی نشانی ہے۔پس تم مردوں کی قیامت کے بارے میں کوئی شک نہ کرو۔

اس آیہ شریفہ کا مطلب ظاہر ہے کہ چونکہ یہ ایک تواریخی حقیقت اور امر واقعہ ہو گذرا ہے کہ حضرت عیسیٰ مردوں میں سے جی اٹھا ہے اور اس نے موت اور قبر کے بندوں کو توڑ دیا ہے پس وہ قیامت کی نشانی ہے اور چونکہ اس کا مردوں میں سے جی اٹھنا یقینی اور برحق ہے پس مردوں کی قیامت بھی برحق امر ہے۔تم اس معاملے میں کسی قسم کا شک وشبہ دل میں نہ لاؤ۔

اس قرآنی آیہ کی مفصل تفسیر انجیل جلیل میں موجود ہے چنانچہ مقدس پولوس رسول جو صاحب وحی والہام تھے شہر کرنتھس کی کلیسیا کو لکھتے ہیں:۔''میں نے سب سے پہلے تم کو وہی بات پہنچادی جو مجھے ملی تھی کہ مسیح کتاب مقدس کے مطابق ہمارے گناہوں کے لئے موا اور دفن ہوا

۔اور تیسرے روز کتاب مقدس کے مطابق جی اٹھا اور پطرس کو اور اس کے بعد بارہ (۱۲) رسولوں کو دیکھائی دیا۔ پھر پانچ سو (۵۰۰) سے زیادہ ایمانداروں کو دکھائی دیا جن میں سے اکثر اب بھی زندہ موجود ہیں پھر سب سے پیچھے مجھ کو دیکھائی دیا۔۔۔ پس جب مسیح کی یہ منادی کی جاتی ہے کہ وہ مردوں میں سے جی اٹھا تو تم میں سے بعض کس طرح کہتے ہیں کہ مردوں کی قیامت ہے ہی نہیں

(وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا) (سورہ الزخرف آیت ۶۱)

اگر مردوں کی قیامت نہیں تو مسیح بھی نہیں جی اُٹھا اور اگر مسیح نہیں جی اٹھا تو تمہارا ایمان بے فائدہ ہے اور تم اب تک اپنے گناہوں میں گرفتار ہو۔ لیکن مسیح فی الواقع مردوں میں سے جی اُٹھا اور جو مر گئے ہیں ان سب میں وہ پہلا ہے جو جی اٹھا ہے۔ جیسے آدم میں سب مرتے ہیں ویسے ہی مسیح میں سب زندہ کئے جائیں گے لیکن ہر ایک اپنی اپنی باری سے پہلا پھل مسیح ہے۔ پھر مسیح کے آنے میں اس کے ایماندار۔ اس کے بعد آخرت ہے۔ اس وقت وہ تمام حکومت اور سارا اختیار اور سب قدرت نیست کر کے بادشاہی کو خدا باپ کے حوالہ کر دے گا جب سب کچھ اس کے تابع ہو جائے گا تو ابن اللہ خود باپ کے تابع ہو جائے گا جس نے سب چیزیں اپنے ابن کے تابع کر دیں تا کہ سب میں خدا ہی سب کچھ ہو" (۱۔ کرنتھیوں ۱۵ باب)۔

اب ناظرین پر انجیلی بیانات کی روشنی میں قرآنی آیہ (سورۃ مریم آیت ۳۴) کا صحیح مفہوم بھی ظاہر ہو گیا ہو گا۔ کلمۃ اللہ کی پیدائش صلیبی موت اور ظفریاب قیامت فرداً فرداً اور مجموعی طور پر کلمۃ اللہ کے لئے اور بنی نوع انسان کے لیے سلامتی کے دن تھے جب کلمۃ اللہ پیدا ہوئے تو گنہگار دنیا کے لیے سلامتی اور نجات کا سامان ہو گیا۔ جب تک کلمۃ اللہ زندہ رہے آپ گنہگاروں کو خدا کی مغفرت اور ابدی محبت کا جان فزا اور سلامتی بخش پیغام دیتے رہے۔ جب رومی حکومت نے آپ کو مصلوب کیا تو آپ نے صلیب پر سے آخری دم پکار کر فرمایا کہ سلامتی اور نجات کا کام، میں نے تمام کا تمام پورا کر دیا (یوحنا ۱۹: ۳۰) جب آپ مردوں میں سے زندہ ہو کر جی اٹھے تو آپ نے دنیا جہاں کے گنہ گاروں کو سلامتی اور نجات عطا فرمائی۔ اور تب سے لے کر آج تک جو گناہ میں گرفتار ہیں ان سب کو وہ سلامتی اور آرام جان بخشتا ہے۔

قیامت مسیح بے نظیر اور لاثانی واقعہ

نسل انسانی کی ابتدا سے دور حاضرہ تک اور اب سے لے کر ابد تک کوئی فرزند آدم ایک دفعہ مر کے دوبارہ مردوں میں سے سوائے کلمۃ اللہ کے نہیں جی اُٹھا۔ ابوالبشر آدم سے لے کر اب تک کسی فرد بشر نے کبھی موت اور قبر پر فتح نہیں پائی۔ اس قاعدہ کلیہ سے طبقہ انبیا بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ اگر بنی نوع انسان میں کوئی فرد مستثنیٰ ہوا ہے تو انجیل و قرآن کی متفقہ شہادت کے مطابق کلمۃ اللہ اور صرف کلمۃ اللہ کی واحد ہستی ہی مستثنیٰ ہے۔ یہ حقیقت غور و تدبر کے قول ہے۔

کتاب مقدس اور قرآن مجید دونوں صحف سماوی کل کائنات اور اولاد آدم کو فانی بتلاتے ہیں۔ کتاب مقدس اور انجیل جلیل کے ہر صحیفہ میں اس حقیقت کا صریحاً ارشاداً ذکر پایا جاتا ہے۔ قرآن شریف میں بھی وارد ہے (كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ) (سورۃ آل عمران ۱۸۵) یعنی ضرور ہے کہ ہر شخص ایک دن موت کا مزہ چکھے۔

لیکن ایک دوسری آیت کے مطابق اس قاعدہ کلیہ سے خدا کی ذات کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے کیونکہ صرف اسی واجب الوجود کو بقا حاصل ہے اور اس کا وجود بقا کا اصل ہے چنانچہ لکھا ہے۔ (كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ) (سورۃ قصص آیت ۸۸) یعنی خدا کی ذات کے سوا سب فانی ہیں۔

جب ہم ان آیات کا مقابلہ ان انجیلی مقامات سے کرتے ہیں جن میں وفات اور قیامت مسیح کے بیانات لکھے ہیں اور قرآنی آیہ والسلام علی یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیاسے بھی گرتے ہیں تو انجیلی بیانات کی روشنی میں سطور بالا کی ہر سہ آیات کے صحیح معانی اور اصلی صحیح مطالب ہم پر روشن کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت ثانی میں آیا ہے کہ تمام بنی نوع انسان کے حصہ میں فنا ہے اور کہ بقا صرف خدا کی ذات کو ہی حاصل ہے ۔چونکہ بردے ہر دو کتب سماوی بقا صرف خدا کی ذات کا حاصل ہے اور دونوں کتب کے مطابق ابن اللہ کو بقا حاصل ہے۔ پس ابن اللہ نے موت اور فنا کو فنا کر کے ثابت کر دیا کہ فقط آپ ہی ابن اللہ ہیں اور آپ کی ذات پاک خدا کی ذات میں سے ہے کیونکہ بقا صرف آپ کو ہی حاصل ہے (۲۔ کرنتھیوں ۱۳: ۴) چنانچہ انجیل میں وارد ہوا ہے کہ ''ہمارے جنابِ مسیح نے مردوں میں سے جی اٹھ کر کل عالم پر بغیر کسی شک وشبہ کے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ ابن اللہ ہیں'' (رومیوں ۱: ۴؛ افسیوں ۱: ۱۹۔ ۲۲) قرآنی اصطلاح میں روح اللہ کے ابعث حیا نے تمام عالم وعالمیان پر اس حقیقت کو آفتاب عالم تاب کی طرح روشن کر دیا کہ کلمہ منہ اور روح منہ اسی ایک حقیقت ہستی کے جوہر ہیں اور ذات سے صادر ہے جو بقا کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ وہ ازل سے خدا کا کلمہ اور خدا کا روح ہے کیونکہ وہ ازل سے خدا کے ساتھ ہے اور ابد تک خدا کے ساتھ رہے گا اسی نکتہ کو ادا کرنے کے لیے قرآن وانجیل میں مسیح کی پیدائش، وفات اور قیامت کے واقعات کو مذکورہ بالا آیت میں یک جا کر دیا گیا ہے (سورۃ مریم آیت ۳۴) اور ہر ایک واقعہ کے معانی ومطالب کے ساتھ منسلک اور پیوستہ کر دیا گیا ہے۔

ابن اللہ کی ظفریاب قیامت آپ کو تمام مخلوقات سے مراد سب سے اعلیٰ بالا اور افضل ثابت کر دیتی ہے (کلسیوں ۱: ۱۸) پس آپ اور دیگر انبیائے عظام (عظیم کی جمع، بزرگ) ایک ہی قطار میں شمار نہیں ہو سکتے۔

یقیں ہر چند می گوئد گماں ہر چند پوید
نہ محصور یقیں استی نہ مغلوب کمانستی

بنی نوع انسان میں فقط ابن اللہ ایک ایسی واحد ہستی ہیں جو زندہ جاوید ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور قرآنی آیت قابل غور ہے کیونکہ خود قرآن اس آیہ کے نکتہ پر غور کرنے کے لئے حکم دیتا ہے۔ (وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ) (سورۃ فاطر آیت ۲۲) یعنی زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے۔

انجیل جلیل وقرآن دونوں کے رو سے کلمۃ اللہ دیگر مردہ انسانوں کی طرح اب مردہ نہیں بلکہ زندہ جاوید ہیں زندگی اور بقا صرف کلمۃ اللہ وروح اللہ کی ہے کیونکہ اس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اسی واسطے وہ موت اور گناہ پر غالب آکر فاتح ہوئے۔ جس طرح زندہ مردہ سے افضل ہے اسی نسبت سے ابن اللہ کل بنی نوع انسان سے افضل ہے۔ آپ کے سوا تمام کائنات میں کوئی دوسری ہستی ہے ہی نہیں جس کو خدائے الحی القیوم نے خود اپنی الٰہی صرف ابن اللہ ہی ابدالا باد زندہ ہے (مکاشفہ ۴: ۹: ۵؛ ۱۴: ۱۰؛ ۶: ۱۵؛ ۷ وغیرہ)۔ وہی ہے جو ''یہ کہہ کر اپنا دہنا ہاتھ ہر گنہگار مرد اور عورت پر رکھ کر کہتا ہے کہ خوف نہ کر میں آخر ہوں (ھوالاول والاخر) فقط میں زندہ ہوں۔ میں مر گیا تھا اور دیکھ ابدالآباد زندہ رہوں گا موت اور عالم ارواح کی کنجیاں میرے پاس ہیں (مکاشفات ۱: ۱۸)۔

پس صرف وہی ایک واحد شخص ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ ''قیامت اور زندگی میں ہوں۔ جو مجھ پر ایمان لاتا ہے گو وہ مر جائے تو بھی زندہ رہے گا اور جو کوئی زندہ ہے اور مجھ پر ایمان لاتا ہے وہ ابد تک کبھی نہ مرے گا (یوحنا ۱۱: ۲۵) چونکہ ابن اللہ فاتح اور زندہ ہے پس ''باپ کی مرضی یہ ہے کہ جو کوئی بیٹے کو دیکھے اور اس پر ایمان لائے وہ ہمیشہ کی زندگی پائے'' (یوحنا ۶: ۳۹) کیونکہ اس نے موت کو نیست کر دیا ہے اور انجیل کے وسیلے زندگی اور بقا کو روشن کر دیا ہے (۲۔ تیمتھیس ۱: ۱۰)۔

ابن اللہ نے نہ صرف موت اور قبر پر فتح حاصل کی بلکہ اس کی زندہ شخصیت نوع انسانی کی "ابد تک "رفیق اور مونس ہے (یوحنا۱۴:۱۶۔۱۹) وہ ہم میں ہمیشہ قائم رہتا ہے (۱۔یوحنا۲:۲۷؛یوحنا۱۷:۲۱) جس طرح انگور کے درخت میں قائم رہتی ہیں (یوحنا۱۵ باب) یا جس طرح بدن کے اعضا بدن میں قائم رہتے ہیں اور تقویت حاصل کرتے ہیں (رومیوں ۱۲:۵؛۱۔کرنتھیوں ۱۲:۱۲؛افسیوں ۵:۳۰) مسیح کے ساتھ مومنین کا تعلق ہے اس قسم کا ہو جاتا ہے کہ ایماندار کہہ سکتا ہے کہ "میں جو جسم میں زندگی گزارتا ہوں تو خدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے گزارتا ہوں جس نے مجھ سے محبت رکھی پس اب میں زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندگی ہے" (گلتیوں ۲:۲۰؛ایوب ۳:۶؛۴:۱۳؛۵:۱۲ وغیرہ)

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی

تا کہ کس نگوید بعد ازیں من دیگر تو دیگری

اس قسم کا رشتہ اور تعلق کسی دوسرے مذہب کا ہادی یا نبی اپنے پیروؤں کے ساتھ نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ خود مر گیا ہے اور روز حشر دیگر انسانوں کی طرح اپنے اعمال کا حساب دے گا۔ لیکن خداوند مسیح زندہ اور فاتح ہے جو قیامت کے روز دنیا کی عدالت کرے گا لیکن خداوند مسیح زندہ اور فاتح ہے جو قیامت کے روز دنیا کی عدالت کرے گا (متی ۲۵:۳۱تا آخر)

مذکور بالا وجوہ (وجہ کی جمع، دلائل) کے سبب مسیحیت اپنے بانی کو خدا کا مظہر مانتی ہے اور دنیا کے کسی نبی کو بھی خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان ہو اس کا ہمسر نہیں گردانتی ابن اللہ کی خصوصیات ایسی ہیں جو روئے زمین کے کسی دوسرے مذہب کے بانی ہادی یا مصلح میں موجود نہیں۔ پس مسیحیت کا یہ ایمان ہے کہ جس طرح خدا کا کوئی ہمسر نہیں اسی طرح خدا کے بیٹے کا بھی کوئی ہمسر نہیں۔

آں کس است اہل بشارت کہ اشارت داند

نکتہ ہاست بسے محرم اسرار کجاست ؟

مسیح مردوں کو زندہ کرنے والا ہے

انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں اس حقیقت کو نہایت صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت کلمۃ اللہ مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ گو انجیل میں بالتفصیل مختلف مردوں کو زندہ کرنے کا بیان ہے اور قرآن میں مجمل طور پر یہ بیان موجود ہے لیکن دونوں الہامی کتابیں اس حقیقت الامر کی شہادت دیتی ہیں کہ ابن اللہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ چنانچہ ہر چہار اناجیل میں مردوں کے زندہ کرنے کے متعدد واقعات تفصیل کے ساتھ درج ہیں (یوحنا ۱۱ باب؛ متی ۹:۱۸۔۲۶؛ مرقس ۵:۲۱۔۴۸؛ لوقا ۷:۱۱۔۱۷ وغیرہ) قرآن میں بھی آیا ہے کہ کلمۃ اللہ نے اہل یہود کو مخاطب کر کے فرمایا (اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ) (سورۃ آل عمران آیت ۴۹)

یعنی میں تمہارے پاس تمہارے رب سے ایک نشان لے کر آیا ہوں۔ میں مٹی سے تمہارے لیے پرندہ کی صورت پیدا کر کے اس میں دم پھونکتا ہوں تو وہ خدا کے اذن سے اڑنے لگے جاتا ہے میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔

انجیل میں بھی مختصراً وارد ہوا ہے کہ کلمۃ اللہ نے حضرت یوحنا اصطباغی کے پیامبر یہودیوں سے فرمایا ''جو کچھ تم سنتے ہو اور دیکھتے ہو، جا کر یوحنا سے بیان کر دو کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے پھرتے ہیں۔ کوڑھی پاک صاف کئے جاتے ہیں بہرے سنتے ہیں اور مردے زندہ کئے جاتے ہیں۔ غریبوں کو خوشی کی خبر سنائی جا رہی ہے۔ مبارک ہیں وہ جو میرے بارے میں ٹھوکر نہ کھائیں'' (متی ۱۱: ۴۔۶)۔

ہم سطور بالا میں بتا آئے کہ قرآن میں آیا ہے (وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ) (سورۃ الزخرف آیت ۶۱) یعنی عیسیٰ تو قیامت کی نشانی ہے۔ پس تم مردوں کی قیامت کے بارے میں کوئی شک نہ کرو۔ قرآن فرماتا ہے (وَ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ) (سورۃ مومنوں آیت ۸۰) یعنی صرف خدا ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔

لیکن فطرت کے اس قاعدہ کلیہ سے اللہ جل شانہ نے کلمۃ اللہ کو مستثنیٰ کر دیا ہے وَ اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ بالفاظ قرآن اور ''مردے زندہ کئے جاتے ہیں'' بالفاظ انجیل جس سے ظاہر ہے کہ خاکی انسانوں میں ایک بشر بھی حضرت کلمۃ اللہ و روح اللہ و ابن اللہ کا ہم پایہ ہم رتبہ یا ثانی نہیں ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔ بنی آدم میں صرف ابن اللہ کی ہی شخصیت بے نظیر، بے عدیل اور بے مثال ہے۔ چنانچہ ابن اللہ نے خود ہی زبان حقیقت ترجمان سے ارشاد فرمایا (اور یہ ارشاد قرآن وہ انجیل کی آیات کے الفاظ کو روشن کر دیتا ہے) کہ ''میں تم سے ایک بات حق کہتا ہوں بیٹا آپ سے کچھ نہیں کر سکتا سوا اس کے جو وہ باپ کو کرتے دیکھتا ہے (بِاِذْنِ اللّٰهِ) کیونکہ جن جن کاموں کو باپ کرتا ہے بیٹا بھی ان کو اسی طرح کر رہا ہے اس لیے کہ باپ بیٹے کو عزیز رکھتا ہے اور جتنے کام وہ خود کرتا ہے اسے دکھاتا ہے جس طرح مردوں کو اٹھاتا ہے اور زندہ کرتا ہے (وَ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ) اسی طرح بیٹا بھی جن کو چاہتا ہے ان کو زندہ کرتا ہے (وَ اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ)'' باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا بلکہ اس نے عدالت کا تمام کام بیٹے کے سپرد کیا ہے تاکہ سب لوگ بیٹے کی عزت کریں جس طرح باپ کی عزت کرتے ہیں'' (یوحنا ۵: ۱۹۔۲۳؛ ۶: ۳۳؛ ۱۱: ۲۵؛ متی ۲۵: ۳۱۔۴۶ وغیرہ)

بعض قادیاں کے مسلمان قرآن و انجیل کی متفقہ شہادت کو دراء ظہور ہم پس پشت پھینک کر قرآن مجید کی عین ضد میں سیدھے سادھے مومن مسلمانوں کو بہکاتے ہیں اور کہتے ہیں ''وہ لوگ جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح ناصری علیہ السلام مردے زندہ کیا کرتے تھے۔ وہ اسلام کی تعلیم سے کس قدر بیگانا ہیں اور مشرکانہ عقائد میں مبتلا ہیں۔ اس قسم کے عقائد رکھنے والے مسلمان اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر مسیح ناصری کی طرف جسمانی مردوں کے احیاء کا معجزہ منسوب کیا جائے تو اس میں رسول کریم کی کھلی ہتک (بے حرمتی) ہے۔ ہمارا آقا جو افضل الرسل تھا وہ اپنی تمام زندگی میں ایک جسمانی مردہ بھی زندہ نہ کر سکے اور پرندہ کیا، پرندے کا ایک پر بھی پیدا نہ کر سکے اور مسیح ناصری جو آپ سے درجہ میں بہت کم تھے۔ ان کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ مردے زندہ کیا کرتے تھے اور پرندے پیدا کرتے تھے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے؟ قرآن تو بتلاتا ہے کہ رسول کریم جب اپنے معجزات کفار کے سامنے پیش کرتے تو وہ جواب میں کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے معجزات کو نہیں مانتے۔

(اْئْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ) (سورۃ جاثیہ آیت ۲۵)

یعنی اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھا دو۔

اس کا جواب رسول یہی دیتے ہیں کہ ''اللہ ہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے''۔ (سورۃ مومنوں آیت ۸۲) مگر مسلمانوں کی حالت پر افسوس کہ وہ کہتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے کہ حضرت مسیح نے جسمانی مردے زندہ کئے اور اس طرح عیسائیت کی تقویت اور اسلام کے ضعف کا باعث بنتے ہیں۔

(الفضل قادیان ۴، ستمبر ۱۹۴۲ء)

ہمارا روئے سخن اس قسم کے نام نہاد مسلمان قادیانیت کے شیدائیوں کی طرف نہیں جو نہ خدا پر، نہ اس کے فرستادہ (قاصد) رسول پر، نہ اس کے قرآن پر صحیح ایمان رکھتے ہیں اور کتب سماوی کی کھلی اور واضح آیات بینات کا انکار کر کے خدا اور اس کے انبیاء اور اس کی کتب کی بے عزتی اور ہتک کرنے سے ذرا نہیں جھجکتے۔ اس قسم کے مسلمانوں کے ایمان کی نسبت قرآن میں ارشاد ہے۔

(قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ) (سورۃ البقرۃ آیت ۹۳)

ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ۔

حقیقی ایماندار مذکورہ بالا قرآنی ارشادات اور انجیلی بیانات کو پڑھ کر آمنا وصدقنا کہہ کر تسلیم کر کے کہتے ہیں۔ سبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم یعنی تیری ذات پاک ہے ہم کو کچھ علم نہیں مگر اتنا ہی ہے جو تو نے ہم کو سکھلا دیا تو ہی دانا پختہ کار ہے۔

مسیح مردہ روحوں کو زندہ کرتا ہے

انجیل جلیل سے ظاہر ہے کہ ابن اللہ نہ صرف جسمانی طور پر مردوں کو جلاتے اور زندگی بخشتے تھے۔ بلکہ آپ ان تمام مردوں اور عورتوں کی روحوں کو بھی اپنے مسیحائی دم سے از سر نو زندگی عطا فرمایا کرتے تھے جو گناہ کے لاعلاج اور زہریلی مرض سے مردہ ہو چکی تھی۔ مسیحی اصطلاح میں اس حقیقت کو لفظ ''نجات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن اللہ نے فرمایا ہے ''میں تم کو ایک حق بات بتلاتا ہوں، جو میرے کلام کو سنتا ہے ہمیشہ کی زندگی اسی کی ہے۔ اس پر سزا کا حکم نہیں ہوتا کیونکہ وہ موت سے نکل کر زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ وقت آتا ہے بلکہ اب آگیا ہے مردے ابن اللہ کی آواز سنیں گے اور جو سنیں گے وہ زندہ ہو جائیں گے کیونکہ جس طرح باپ اپنے آپ میں زندگی رکھتا ہے اسی طرح اس نے بیٹے کو بھی یہ بخشا ہے کہ اپنے آپ میں زندگی رکھے بلکہ باپ نے بیٹے کو عدالت کرنے کا بھی اختیار بخشا ہے''۔ (یوحنا ۵: ۲۴۔۲۷؛ ۱۔ یوحنا ۳: ۱۴؛ ۵: ۲۱؛ یوحنا ۵: ۹۔۱۳؛ ۴: ۲۱۔۲۳؛ ۱۰: ۱۶؛ ۱: ۴؛ ۱۷: ۲۰؛ رومیوں ۵: ۱، ۸تا۱۱، ۱۵تا۲۱؛ ۶: ۱تا۱۴ وغیرہ)

ابن اللہ نے گذشتہ دو ہزار سالوں میں دنیا کے کل ممالک و اقوام کی کروڑوں مردہ روحوں کو از سر نو زندگی بخشی ہے جن مردہ دلوں نے خدا کے بیٹے کی آواز ''تم'' کو سنا ہے وہ ''موت سے نکل کر زندگی میں اسی دنیا میں داخل ہو گئے'' انہوں نے اپنے ملک و قوم اور سماج کی کایا پلٹ دی اور مردہ روحوں کو بچانے کا وسیلہ بن گئے۔ اور ابدی نام پا کر زندہ جاوید ہو گئے۔ خداوند مسیح نے خود فرمایا ہے۔ ''میں تم سے ایک حق بات کہتا ہوں، جو میرے کلام پر عمل کرے گا وہ ابد تک کبھی موت کو نہ دیکھے گا (یوحنا ۸: ۵۱؛ افسیوں ۵: ۱۴؛ یسعیاہ ۲۶: ۱۹ وغیرہ) ابن اللہ اپنی حین حیات میں ان کو جو گناہ میں پڑے کراہتے تھے، اپنے لطف و محبت سے گناہوں کی مغفرت کا کلمہ سناتے تھے (مرقس ۲: ۵؛ لوقا ۷: ۴۷۔۴۹؛ یوحنا ۵: ۱۴؛ ۸: ۱۔۱۱) بنی نوع انسان کے کروڑوں گنہگار دو ہزار سال سے اپنے گناہوں کے ہاتھوں لاچار ہو کر اقرار کرتے چلے آئے ہیں کہ ''نیکی کرنے کا ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے عمل بن نہیں پڑتے۔ جس نیکی کا میں ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا۔ میں اس کو کر لیتا ہوں ہائے میں کیسا کمبخت انسان ہوں۔ اس گناہ کی موت سے مجھے کون چھڑائے گا؟ میں اپنے جنابِ مسیح کے وسیلہ خدا کا شکر کرتا ہوں جس نے مجھے گناہ کی زنجیروں سے اور شیطان کی غلامی سے نجات سے نجات بخشی'' (رومیوں ۷ باب) ہر گنہگار جس نے ابن اللہ سے خدا کی لازوال محبت اور مغفرت کا پیغام سن کر نئی روحانی زندگی حاصل کی ہے وہ اپنی نئی پیدائش کے تجربہ سے اس حقیقت سے کماحقہ واقف ہے کہ گناہ کی مزدوری موت ہے مگر خدا کی بخشش ہمارے خداوند یسوع میں ہمیشہ کی زندگی ہے''۔

آدم سے ملی موت ،حیات ابن خدا سے
آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا

(واعظ)

انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں کتب سماوی میں مسیحی نجات یافتگاں کی برکت وعظمت کا ذکر آیا ہے۔انجیلی مجموعہ کے ہر صحیفہ میں بار بار مفصل طور پر وضاحتاًاور صراحتاًان کی مبارک حالی اور روحانی اوج کا بیان موجود ہے۔چنانچہ ایک شخص جو اپنے آپ کو بدترین خلائق (خلق کی جمع، مخلوقات) کہتا تھا نجات حاصل کر کے پکار اٹھتا ہے کہ ''اب میں زندہ نہیں رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے''۔قرآن میں مجمل طور پر ان گنہگاروں کی روحانی تبدیلی۔۔۔کا ذکر پایا جاتا ہے جو ابن اللہ پر ایمان لا کر شیطان اور نفس امارہ کی غلامی سے آزاد ہو گئے تھے۔چنانچہ ان کی نسبت وارد ہوا ہے کہ

(وَ جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً)(سورۃ حدید آیت ۲۷)

یعنی جو لوگ عیسیٰ کے تابع ہو گئے اللہ نے ان کے دلوں کو تبدیل کر کے ان میں شفقت اور رحمت ڈال دی ہے۔

چنانچہ مفسرین بیضاوی لکھتا ہے کہ

''حضرت عیسیٰ مسیح روح اللہ مردوں کو اور مردہ دلوں کو زندہ کرتے تھے اور اسی لئے ان کو روح منہ کہا گیا ہے''۔(جلد اول صفحہ ۲۱۹)

آپ کے سوا قرآن میں کسی دوسرے شخص کو روح اللہ کا لقب نہیں دیا گیا جس سے ظاہر ہے کہ آپ کے علاوہ کوئی انسان خواہ وہ کیسا ہی عظیم الشان نبی ہو بنی نوع انسان کو روحانی موت سے زندہ نہیں کر سکتا۔پھر لکھا ہے۔

(وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ)(سورۃ آل عمران آیت ۵۵)

خدا فرماتا ہے کہ اے عیسیٰ میں تیرے ماننے والوں کو ان پر جو تیرا انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک غلبہ عطا کروں گا۔

رسول عربی کی بعثت کے زمانہ سے سالہا سال پہلے مسیحی کلیسیا میں ہزاروں کی تعداد میں مغربی ایشیا کے ممالک کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی تھیں اور دن بدن روحانی ترقی کرتی چلی جارہی ہے عرب کے متعدد قبائل مشرف بہ مسیحیت ہو چکے تھے۔اور ''مونوفی زائٹ''فرقہ سے متعلق تھے جس کا یہ عقیدہ تھا کہ مسیح کی ذات واحد تھی اور اس مشیت (مرضی) کا فعل بھی واحد تھا(طبیعۃ واحدۃ ومشیۃ واحدۃ وفعل واحد) چنانچہ مغربی عربوں کا بادشاہ الملک الحارث البدوی اس فرقہ کا زبردست حامی تھا نجران اور ہرمس جیسے دور دراز مقامات اور بادیہ عرب کے قبائل مسیحی تھے۔غسان کا تمام قبیلہ مسیحی تھا۔مصر اور ایران اور شام کے گوشہ گوشہ میں مسیحی گرجے کھڑے تھے طے کا قبیلہ اور نبو حیرہ کا قبیلہ مسیحی تھے حضرت رسول عربی نجات یافتہ مسیحیوں کی روزمرہ کی روحانی زندگیوں اور ان کی شفقت ورافت اور علم وحلم سے ایسے متاثر تھے کہ قرآن میں آیا ہے۔

(وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ)(سورۃ مائدہ آیت ۸۲)

یعنی مسلمانوں کے لئے دوستی کے لحاظ سے تو ان کو زیادہ قریب پائے گا جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔یہ اس لیے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

محمد عربی ان عالموں اور رہبانیت سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے کہ قرآن میں ان کے علم کی وجہ سے رسول کو حکم ہوا

(فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ)(سورۃ یونس آیت ۹۴)

یعنی اے محمد اگر تجھ کو اس میں جو ہم نے تیری طرف اتاری ہے کسی چیز کا پتہ نہ لگے تو ان لوگوں سے پوچھ جو تجھ سے پہلے بائبل (الکتاب) پڑھتے ہیں۔

پھر یہی حکم تمام اسلامی دنیا کو ہوا کہ

(فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ)(سورۃ النحل آیت ۴۳)

اے مسلمانو، اگر تم کو کسی بات کا علم نہ ہوا کرے تو تم اہل ذکر (بائبل والوں) سے پوچھ لیا کرو۔

پھر یہی حکم مکرر قرآن میں وارد ہوا ہے (انبیاء ۷) رسول عربی نے مسیحیوں کی روحانی زندگی اور ان کے اونچے اخلاق کو دیکھ کر مسلمانوں کو تاکیداً حکم دیا، (وَ لَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ)(سورۃ عنکبوت آیت ۴۶)

یعنی مسلمانو۔ تم اہل کتاب سے جھگڑا مت کرو پر جو سب سے اچھا ہے۔

(وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ اِلٰـهُنَا وَ اِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ)(سورۃ عنکبوت آیت ۴۶)

اور اہل کتاب سے یہ کہو کہ اے بائبل والو ہم ایمان رکھتے ہیں۔ اس قرآن پر جو ہم پر اترا اور اس بائبل پر جو تم پر اتری اور ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے محکوم ہیں۔

صحیح مسلم میں عیاض بن حمار کی حدیث ہے کہ آنحضرت نے ایک خطبہ میں عیسائیوں کی نسبت یہ شہادت دی کہ **نظر انی اھل الارض فمقتھم عربھم وعجمھم الا بقایا من اھل الکتاب**۔ یعنی اللہ نے زمین پر رہنے والوں پر نظر کی تو سب سے متنفر ہوا۔ عربوں سے اور عجموں سے بھی۔ سوا ان کے جو اہل کتاب سے باقی تھے (کتاب صفات المنافقیں اہل الجنہ واہل المناد)۔

ہم دیگر متعدد حدیثوں کا اقتباس بخوف طوالت نہیں کرتے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ اہل انصاف پر واضح ہو گیا ہو گا کہ قرآن اور صحیح حدیث کی بھی یہی شہادت ہے کہ منجی عالمین ابن اللہ ایمانداروں کو گناہ پر اور نفس امارہ پر اور بدی کی طاقتوں پر اور دوزخ کی قوتوں پر غالب آنے کی روحانی قوت اور توفیق عطا فرماتا ہے اور انجیل جلیل کے تمام صحیفے بیک زبان یہی شہادت دیتے ہیں۔

ہم کو ظلمت بدوش کہتے ہو
ہم نے لاکھوں روپے جلائے ہیں

(بخت)

انبیائے سابقین اور مسیح کے معجزات

جنابِ مسیح کے معجزات اور دیگر انبیاء کے معجزات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دیگر انبیاء اپنی اعجازی (کرامت، کرشمہ) طاقت کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر استعمال کرنے سے کبھی ہچکچاتے نہیں تھے۔ مثلاً ایلیاہ نے صارف (صارپت) کی بیوہ سے کہا کہ پہلے میرے لیے روٹی بنا اور پھر اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے (۱۔ سلاطین ۱۷: ۱۳)۔ لیکن جیسا گزشتہ فصل میں ہم ذکر کر چکے ہیں کلمۃ اللہ نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر قوت اعجازی کا کبھی استعمال نہ کیا (متی ۴ باب) آپ نے اس طاقت کو عامۃ الناس کو مرغوب کر کے اپنا تسلط قائم کرنے کی غرض سے کبھی استعمال نہ فرمایا حالانکہ یہ بات آپ کے قبضہ قدرت میں تھی (متی ۲۶: ۵۳) آپ نے اپنی معجزانہ طاقت سے دیگر انبیا کی طرح (۲۔ سلاطین ۱: ۹) لوگوں کو سزا نہ دی (لوقا ۹: ۵۵) بلکہ آپ نے قوت اور طاقت رکھنے کے باوجود کسی پر جبر و تشدد روا نہ رکھا۔ کلمۃ اللہ کی اعجازی طاقت کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ اس طاقت کا صحیح اور جائز استعمال کیا اور اپنے ذاتی مفاد حتیٰ کہ اپنی جان کی حفاظت کی خاطر بھی اس کو استعمال نہ فرمایا (متی ۲۶: ۵۳ ؛ یوحنا ۷: ۱۰؛ ۸: ۵۹؛ ۱۰: ۱۸؛ ۱۲: ۳۷) اگر ہم اس حقیقت کا دیگر انبیا (۲۔ سلاطین ۱: ۹) اور دیگر مذاہب کے بانیوں کی زندگی کے ساتھ مقابلہ کریں تو ہم پر فرق عیاں ہو جاتا ہے۔ آپ نے بے شمار لوگوں کو شفا بخشی اور ساتھ ہی تاکید بھی فرمائی کہ کسی کو نہ بتانا (مرقس ۱: ۴۰؛ ۵: ۴۳؛ ۷: ۳۶؛ ۸: ۲۶؛ متی ۹: ۳۰؛ ۱۷: ۹ وغیرہ) جس سے ظاہر ہے کہ آپ اپنی شہرت کو بڑھانے کی خاطر اس اعجازی قوت کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ آپ یہاں تک محبت جسم واقع ہوتے تھے کہ اپنی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تک کو آپ نے اعجازی قوت سے شفا عطا کی (لوقا ۲۲: ۵۱) حقیقت تو یہ ہے کہ آپ خدا کی معجزانہ طاقت کے استعمال کی شان اعجازی سے اور خدا باپ کی جلال کا عکس ہے (یوحنا ۱: ۲۸؛ متی ۵: ۴۵ وغیرہ)۔

اگرچہ کلمۃ اللہ کے معجزات اس امر کے گواہ تھے کہ آپ خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ تاہم ان معجزات سے آپ کا یہ مقصد نہ تھا کہ آپ اپنی رسالت کو ثابت کریں۔ (متی ۱۶: ۳؛ ۱۱: ۴؛ ۱۱: ۲۰؛ ۹: ۳۳؛ یوحنا ۳: ۴؛ ۹: ۳۲؛ ۱۵: ۲۴؛ ۱۰: ۳۷؛ ۱۴: ۱۱ وغیرہ) ان معجزات کی گواہی وہی شخص رد کر سکتا تھا جس نے حق کے خلاف اپنے دل کو سخت کر لیا ہو (متی ۲۳: ۳۷؛ یوحنا ۵: ۴۰ وغیرہ) لیکن کلمۃ اللہ کی نظر میں ایسا ایمان جس کی بنا محض معجزات پر ہو نہایت کمزور قسم کا ایمان تھا (یوحنا ۲: ۲۳؛ ۴: ۴۸؛ ۲۰: ۲۹ وغیرہ) اسی واسطے آپ نے نشان مانگنے والوں کو یقین دلانے کے لیے بھی معجزانہ طاقت کا استعمال نہ کیا (متی ۱۲: ۳۸؛ ۱۶: ۱؛ لوقا ۲۳: ۸؛ مرقس ۱۵: ۳۰) دیگر مذاہب کے ہادی اور انبیائے سابقین اپنے دشمنوں کی مخالفت پر غالب آنے کی خاطر معجزانہ طاقت استعمال کرتے تھے لیکن آپ نے یہ وطرہ کبھی استعمال نہ کیا (یوحنا ۶: ۳۰) آپ کا دلی منشا اور خواہش یہ تھی کہ لوگ آپ کی قوت اعجازی پر نہیں بلکہ آپ کی شخصیت اور آپ کے پیغام پر ایمان لائیں (یوحنا ۶: ۶۸) اور خدا کی محبت کا جلوہ دیکھ کر اس کی طرف رجوع کریں۔ انبیائے سابقین دیگر انسانوں کی طرح گنہگار اور خاطی انسان تھے لہٰذا ان کو یہ ضرورت تھی کہ وہ خدا کی مدد پا کر اپنی رسالت کے ثبوت میں خارجی معجزات کو پیش کریں۔ لیکن خداوند ایک کامل انسان تھے لہٰذا یہ اعجازی طاقت آپ کے اندر سے خود بخود نکلتی تھی (مرقس ۵: ۳۰؛ لوقا ۲۲: ۵۱ وغیرہ) کلمۃ اللہ کی کامل شخصیت خود ایسی قائل کرنے والی شے تھی کہ اس کے مقابل میں خارجی معجزات کچھ حقیقت ہی نہیں رکھتے تھے۔

انبیائے سابقین معجزانہ لیاقت کے ذریعہ خدا کا جلال ظاہر کرنا چاہتے تھے (خروج ۷: ۳۔ ۵؛ ۱۶: ۷؛ ۲: ۷۔ سلاطین ۵: ۱۵۔ ۱۷ وغیرہ)۔ لیکن کلمۃ اللہ کے معجزات سے آپ کا اپنا جلال ظاہر ہوتا تھا (یوحنا ۱۱: ۴؛ ۲: ۱۱ وغیرہ) تمام لوگوں پر آپ کے معجزات سے یہ عیاں ہو جاتا تھا کہ آپ خدا میں ہیں اور خدا آپ میں ہے (یوحنا ۱۰: ۳۸؛ ۳: ۲؛ ۱۴: ۱۱)۔ دیگر انبیا سے معجزات کبھی کبھی ظہور پذیر ہوتے تھے لیکن کلمۃ اللہ کی شخصیت معجزات کا

ایک سمندر تھی جو آپ کی زندگی کے بحر ذخار و بے کنار کی طرح ہمیشہ رواں رہتا تھا(لوقا۸:۴۶وغیرہ)آپ کی شخصیت کا اندرونی جلال اور آپ کے معجزات کا بیرونی جلال دونوں ایک ہی قسم کے تھے اور دونوں لاثانی تھے(یوحنا۲:۱۱؛۵:۹؛۱۱:۴؛۱۱:۴۰وغیرہ)۔

انبیائے سابقین اعجازی قوت کو استعمال کرنے سے پہلے خدا سے دعا مانگا کرتے تھے (۱۔سلاطین ۱۷:۲۰؛ ۲۔سلاطین ۴:۳۳ وغیرہ)۔لیکن حیرت کی یہ بات ہے کہ کلمۃ اللہ کے معجزات میں یہ خصوصیت ہے کہ آپ نے رسولوں کو ہدایت کی کہ اعجازی قوت استعمال کرنے سے پہلے دعا کیا کریں(مرقس ۱۱:۲۲؛۹:۲۸)لیکن آپ نے خود اس بات کی ضرورت محسوس نہ کی۔

انبیائے سابقین اپنے معجزات کو خدا کا نام لے کر کیا کرتے تھے (۱۔سلاطین ۱۳:۲۱؛۱۷:۱۴؛۲۔سلاطین ۱:۱۶؛۴:۴۳ مقابلہ یسعیاہ ۷:۱۱)۔لیکن کلمۃ اللہ نے کبھی ایسا نہ کیا اور آپ کے بعد آپ کے رسول خدا کا نام لینے کی بجائے ''یسوع کے نام'' سے معجزات کیا کرتے تھے(اعمال ۳:۶ وغیرہ)۔وہ خدا کی بجائے ابن اللہ کو پیش کرتے تھے (اعمال ۳:۱۲) کیونکہ ان کو یہ علم تھا کہ کلمۃ اللہ لوگوں کے سامنے خدا کی بجائے اپنی شخصیت کو پیش کرتے تھے۔کیونکہ آپ کی ذات خدا کا کامل مظہر اور اکمل مکاشفہ تھی(متی ۸:۳؛لوقا ۵:۲۴؛۷:۱۴؛مرقس ۹:۲۵؛۱۰:۵۱؛لوقا ۵:۲۴وغیرہ)اور جس طرح خدا تعالیٰ نے بحیرہ قلزم کو جھڑکا تھا(زبور ۱۰۶:۹؛نحوم ۱:۴)اسی طرح ابن اللہ نے بحیرہ گلیل کو جھڑکا(متی ۸:۳۶)۔

انبیائے سابقین لوگوں کو کہتے تھے کہ معجزات کے لئے خدا کا شکر کریں لیکن کلمۃ اللہ کا یہ رویہ نہ تھا اس کے برعکس آپ کا یہ رویہ تھا کہ لوگ درخواست اور عرض کریں تو آپ سے عرض کریں۔ایمان رکھیں تو آپ پر ایمان رکھیں(متی ۹:۲۸؛یوحنا ۴:۵۰وغیرہ)اور شکر کریں تو آپ کا شکر ادا کریں(لوقا ۱۷:۱۶)آپ کو اس بات کا احساس تھا کہ آپ کا دست قدرت خدا کا ہاتھ ہے(یوحنا ۱۰:۲۸تاآخر)اور ایسی قدرت رکھنے کا سبب بھی بتلادیا(یوحنا ۵:۳۰)آپ کے قبضہ قدرت میں اعجازی طاقت کا یہ حال تھا کہ آپ نے یہ طاقت رسولوں کو بھی عطا کردی(مرقس ۱۶:۲۰؛لوقا ۹:۵۴؛۱۰:۱۷؛اعمال ۳:۶؛۹:۳۴وغیرہ)۔یہاں تک کہ بدروحوں اور شیاطین پر بھی ان کو اختیار بخش دیا(مرقس ۶:۷؛متی ۱۰:۸؛لوقا ۱۰:۱۸تاآخر) ۔لیکن کلمۃ اللہ نے ان کو یہ حکم نہ دیا کہ اعجازی طاقت کو استعمال کرتے وقت خدا سے دعا کریں یا خدا کا نام لیں بلکہ حکم یہ دیا کہ وہ آپ کے تابع رہیں (لوقا ۱۷:۷؛یوحنا ۱۴:۱۲تاآخر)اور فرمایا جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں تو ایسا ہی کریں(یوحنا ۱۴:۱۲تاآخر) کیونکہ آپ نے فرمایا''میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے(متی ۱۱:۲۷)آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے(متی ۲۸:۱۸؛۹:۵؛یوحنا ۱۷:۲؛۲۰:۱۰؛۳۰:۱؛۵۱:۳؛۳۵:۳وغیرہ)

معجزات مسیح

ابن اللہ کے معجزات کا ذکر انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں میں جابجا آیا ہے ہر چہار اناجیل میں آپ کے معجزات کا مفصل اور قرآنی سورتوں میں مجمل طور پر آیا ہے۔

چنانچہ درج ہے(وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ)(سورۃ البقرۃ آیت ۸۷)

یعنی ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے معجزے عطا کئے۔

سورہ مائدہ میں آسمانی خوراک کے معجزہ کا ذکر زیادہ تفصیل سے موجود ہے۔''جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم۔کیا تیرے خدا میں ایسی قدرت ہے کہ ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان (تھال،طبق)اتارے عیسیٰ نے جواب دیا۔اگر تم ایمان رکھتے ہو تم اللہ سے ڈرو۔انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے آسمانی خواں میں سے کھائیں اور ہمارے دل کو اطمینان نصیب ہو اور ہم سب پر عیاں ہو جائے کہ آپ صادق القول ہیں اور ہم اس پر گواہ ہیں۔پس عیسیٰ بن مریم نے کہا اے ہمارے رب آسمان پر سے ہم پر ایک خوان نازل کر کہ ہمارے لیے عید ہو۔ہمارے پہلوں اور

پچھلوں کے لئے اور وہ تیری طرف سے ایک نشان ہو اور ہمیں یہ رزق عطا کر کیونکہ تو ہی بہتر رزق دینے والا ہے (سورۃ مائدہ آیات ۱۱۲ تا ۱۱۴)۔اس قسم کے آسمانی کھانے اور پانی کے معجزات کا ذکر ہر چہار اناجیل میں بھی موجود ہے (یوحنا ۲: ۱۔۱۱؛ ۶: ۱۔۱۴؛ ۳۰۔۴۲؛ مرقس ۸: ۱۔۱۰؛ ۱۸۔۲۱؛ متی ۱۴: ۱۷۔۲۱؛ لوقا ۵: ۱۔۱۰؛ ۹: ۱۰۔۱۷ وغیرہ) ایک اور قرآنی آیت میں مختلف اقسام کے معجزات کا ذکر ہے چنانچہ لکھا ہے کہ عیسیٰ نے کہا "میں تمہارے پاس تمہارے رب سے ایک نشان لے کر آیا ہوں تو وہ بحکم خدا ایک پرندہ ہو جاتا ہے۔ میں مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو چنگا کرتا ہوں اور باذن اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہوں" (سورۃ آل عمران آیت ۴۳)۔ چہار اناجیل کے مصنف لکھتے ہیں کہ "ابن اللہ نے بہتوں کو جو طرح طرح کی بیماریوں میں گرفتار تھے اچھا کیا اور بہت سی بدروحوں کو نکالا" (لوقا ۷: ۱۸؛ مرقس ۱: ۳۴؛ متی ۴: ۲۴؛ ۶: ۵۳؛ ۱۵: ۲۰۔۲۱)۔آپ کے جانی دشمن بھی مانتے تھے کہ آپ معجزات کرتے ہیں لیکن وہ کہتے تھے کہ آپ ان معجزات کو شیاطین کی مدد سے کرتے ہیں (مرقس ۳: ۶؛ ۳: ۲۲)۔ خداوند نے خود اپنی زبان مبارکہ سے فرمایا "دیکھو اندھے دیکھتے ہیں لنگڑے چلتے پھرتے ہیں۔ کوڑھی پاک صاف کیے جاتے ہیں۔ بہرے سنتے ہیں۔ مردے زندہ کئے جاتے ہیں۔ غریبوں کو انجیل کی خوشخبری سنائی جاتی ہے۔ وہ شخص مبارک ہے جو ٹھوکر نہیں کھاتا (لوقا ۷: ۱۸۔۲۳) ابن اللہ سے نہ صرف خود معجزات صادر ہوتے تھے بلکہ آپ نے اپنے رسولوں اور مبلغوں کو بھی قدرت بخشی کہ وہ بھی ناپاک روحوں کو نکالیں اور ہر طرح کی بیماری اور ہر طرح کی کمزوری کو دور کریں" (متی ۱۰: ۱؛ لوقا ۱۰: ۱۷) چاروں اناجیل کے مصنف مختلف ابواب میں ابن اللہ کے مختلف معجزات کا بالتفصیل ذکر کرتے ہیں ہم مشتے نمونہ از خروارے چند ایک فرائض کے حوالہ جات دئے جاتے ہیں۔ ناپاک اور بدارواح وشیاطین کو نکالنے کے معجزے (مرقس ۱: ۲۱۔۲۸؛ ۵: ۱۔۱۵؛ لوقا ۴: ۳۲۔۳۶) بخار سے شفایابی (مرقس ۱: ۲۹) سوکھے ہاتھ میں جان ڈالنے کا معجزہ (مرقس ۳: ۱۔۶) قریب المرگ کا شفا پانا (یوحنا ۴: ۴۶۔۵۴) سمندر کے طوفان کو بند کرنا (مرقس ۴: ۲۵۔۴۱) مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ (مرقس ۵: ۳۵۔۴۳؛ لوقا ۷: ۱۱۔۱۶؛ ۸: ۴۹۔۵۶؛ یوحنا ۱۱ باب) بہروں گونگوں کو شفا بخشنا (مرقس ۷: ۳۱۔۳۷) اندھوں کو بینائی بخشنا (۸: ۲۲۔۲۶؛ ۱۰: ۴۶۔۵۲) کوڑھیوں کے کوڑھ صاف کرنا (لوقا ۵: ۱۲۔۱۶) مفلوجوں کو شفا عطا کرنا (لوقا ۵: ۱۷۔۲۶، متی ۹: ۱۔۸) جلندھر کے مریض کو چنگا کرنا (لوقا ۱۴: ۱۔۶) مادر زاد اندھوں کو بصارت عطا کرنا (یوحنا ۹ باب) پرانے اڑتیس برس کے لاعلاج مریض کے مرض کو رفع کرنا (یوحنا ۵: ۱۔۹) مرگی والے مصروع (جس کو مرگی کا مرض ہو) کو شفا عطا کرنا۔ ابن اللہ نہ صرف مردوں کو چنگا کرتے تھے بلکہ آپ کی بخشش عام تھی۔ آپ بچوں، لڑکیوں اور عورتوں کو بھی شفا عطا کرتے تھے اور مردہ لڑکیوں کو بھی دوبارہ زندہ کرتے تھے (مرقس ۵: ۲۵۔۳۴؛ ۷: ۲۵۔۳۰؛ لوقا ۸: ۱۔۲ وغیرہ)۔

معجزات مسیح آیات اللہ ہیں

ہم نے گذشتہ صفحات میں کئی جگہ معجزات مسیح کا اشارتاً یا مجملاً ذکر کر کے بتایا ہے کہ ابن اللہ کا ہر معجزہ آیت اللہ تھا اور نشان دیتا تھا کہ کلمۃ اللہ کی ذات پاک کا جو زندہ جاوید اور زندگی بخش ہستی ہے اور بالفاظ قرآن "ایتہ للعالمین دنیا جہاں کے تمام لوگوں کے لیے نشانی قرار دیا گیا ہے" (انبیاء آیت ۹۱؛ مریم آیت ۲۱)۔ قرآن خداوند مسیح کے معجزات کو آیات بینات "یعنی کھلی اور صاف نشانیاں قرار دیتا ہے (بقر ۸۱؛ ۲۵۴؛ آل عمران ۴۳؛ مائدہ ۱۱۰ وغیرہ) جو روشن دلیلیں" (سورہ زخرف ۶۳) تھیں۔ انجیل وقرآن دونوں صحف سماوی کہتے ہیں کہ یہ معجزات اور نشانیاں روح القدس کی قدرت اور پائید سے ظہور میں آتی تھیں (سورہ بقر ۲۵۴ وغیرہ۔ متی ۱۲: ۲۸ وغیرہ) قرآن مجمل طور پر چند ایک کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں کو بینائی عطا کرنا، کوڑھیوں کو شفا بخشنا (آل عمران ۴۳) خوان کا نازل کرنا (مائدہ ۱۱۲ وغیرہ) قرآن مجید کہتا ہے کہ ان روشن دلیلوں کے باوجود شقی یہود ان کا انکار کرتے اور کہتے تھے۔

(فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ) (سورۃ المائدہ آیت ۱۱۰)

کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

انجیل جلیل میں بھی وارد ہوا ہے کہ جب ابن اللہ سے حیران کن نشانیاں اور معجزے ظاہر ہوتے تھے تو اہل یہود کے فقیہہ جو یروشلیم سے آئے کہتے تھے کہ اس کے ساتھ بعلزبول ہے اور یہ بھی کہ وہ بدروحوں کے سردار کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے"(مرقس ۳:۲۳؛ متی ۱۰:۲۵ وغیرہ)۔ جس کے جواب میں کلمۃ اللہ نے فرمایا"جو کوئی روح القدس کے حق میں کفر بکے وہ ابد تک معافی نہ پائے گا"(مرقس ۳:۲۳۔۳۰؛ لوقا ۱۱:۱۷۔۲۲؛ متی ۱۲:۲۵۔۲۹ وغیرہ)۔

اناجیل اربعہ میں ابن اللہ کے اعجازی کاموں اور معجزات کے لئے الفاظ "نشانی"۔ "نشانیاں" استعمال ہوئے ہیں اور قرآن کی مختلف سورتوں میں بھی کلمۃ اللہ کے مختلف معجزات کے لیے الفاظ "نشانی" کھلی نشانیا ں "استعمال ہوئے ہیں ۔انجیل چہارم میں الفاظ "نشان" اور "نشانی" خصوصیت کے ساتھ کلمۃ اللہ کے معجزات اور قدرت والے کاموں کے لیے استعمال ہوئے ہیں اناجیل اربعہ سے ظاہر ہے کہ آپ نہ صرف قادرالکلام تھے (یوحنا ۸:۴۶؛ ۷:۲۹؛ ۱۳:۵۴؛ ۲۲:۳۳؛ مرقس ۱:۲۲؛ ۱:۲؛ ۱۱:۱۸؛ لوقا ۴:۳۲) بلکہ آپ جس مقام میں بھی ہوتے آپ کے مسیحائی دم سے "قدرت کے کام" معجزات" اور نشان" صادر ہوتے تھے (متی ۸:۱۶)۔آپ کی قدوس شخصیت کی حضوری میں شیطانی طاقتیں اور ارواح بد کھڑی نہ رہ سکتیں (متی ۸:۲۸؛ ۱۵:۲۸؛ ۱۷:۱۸؛ مرقس ۱:۲۵) آپ کا مسیحائی نفس ہر قسم کے بیماروں کو شفا عطا کرتا تھا ۔مفلوج، گونگے بہرے، اندھے، کوڑھی وغیرہ کے قوائے جسمانی اور روحانی بحال کر دیے جاتے تھے (متی ۸:۱۳؛ ۹:۶؛ یوحنا ۵:۹؛ متی ۱۲:۱۳؛ لوقا ۱۳:۱۲؛ ۱۴:۲؛ متی ۹:۳۳؛ ۱۲:۲۲؛ مرقس ۷:۳۵؛ متی ۹:۲۹؛ ۳۰:۳۴؛ مرقس ۸:۲۵؛ یوحنا ۹:۷؛ لوقا ۱۷:۱۹ وغیرہ)۔آپ خود قیامت اور زندگی تھے۔ پس آپ مردوں کو "قم" کہہ کر قبروں میں سے زندہ کرتے تھے (یوحنا ۱۱:۴۴؛ متی ۹:۲۵؛ لوقا ۷:۱۵)۔ابن اللہ ایسے صاحب قدرت تھے کہ آپ سے ہر وقت قوت نکلتی تھی (لوقا ۸:۴۶) ایسا کہ "سب لوگ اسے چھونے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ قوت اس سے نکلتی تھی اور سب کو شفا بخشتی تھی (لوقا ۶:۱۹) اور جو ہجوم کی وجہ سے آپ کے مبارک ہاتھوں کو چھو نہ سکتے تھے وہ آپ کی پوشاک کے کنارے ہی چھو لیتے اور "جتنے چھوتے تھے شفایاب ہو جاتے تھے (متی ۱۴:۳۴۔۳۶)۔جونہی ابن اللہ کسی بیمار کو دیکھتے آپ کو اس پر ترس آتا اور آپ اس کو شفا بخشتے (مرقس ۳:۱۔۶ وغیرہ) جب آپ شہر نائین کو گئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ ایک مردہ کو شہر کے پھاٹک کے باہر لئے جا رہے تھے جو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ماں کی حالت زار کو دیکھ کر آپ سے نہ رہا گیا۔ "خداوند کو ترس آیا اور اس سے فرمایا مت رو۔آپ نے جنازہ کو چھوا اور کہا "اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ اور مردہ اُٹھ بیٹھا اور اس نے اس کی ماں کو سونپ دیا" (لوقا ۷:۱۱۔۱۷)۔ علی ہذاالقیاس جب بیت عنیاہ کا لعزر مر گیا تو اس کی بہنوں کی حالت کو دیکھ کر آپ کے دل کو سخت رنج پہنچا اور آپ کے آنسو بہنے لگے"۔اور قبر پر آکر "چار دن کے مردے کو بلند آواز سے پکارا۔اے لعزر نکل آجو مر گیا تھا وہ کفن سمیت نکل آیا (یوحنا ۱۱:۱۔۵۳)۔

ابن اللہ کے یہ قدرت کے کام لوگوں کو اعجازی قوت دکھانے کی خاطر نہیں تھے۔اس کے برعکس جو لوگ محض اعجازی قوت کو دیکھنے کی خاطر معجزہ کرنے کو کہتے آپ صاف انکار کر کے ان کو سخت ملامت کرتے تاکہ وہ آپ کی الٰہی طاقت اور انسانوں کے کرشموں شعبدوں وغیرہ میں چشم بصیرت کو استعمال کر کے تمیز کرنا سیکھیں اور توبہ کریں (متی ۱۲:۳۸۔۴۳؛ مرقس ۸:۱۱۔۱۳؛ لوقا ۱۱:۱۶؛ ۱۰:۱۲۔۱۶؛ ۲۳:۸؛ یوحنا ۲:۸؛ ۴:۴۸؛ ۶:۳۰ وغیرہ) اسی واسطے اناجیل اربعہ اور بالخصوص مقدس یوحنا کی انجیل میں معجزات کو "نشانات" کہا گیا ہے تاکہ ان کا اعجازی عنصر لوگوں کے لیے نشان دہی کا کام سرانجام دے۔ان نشانات کا واحد مقصد ہی یہ تھا کہ ان کا ذریعہ ہر خاص وعام پر خدای محبت آفتاب کی طرح ظاہر ہو جائے کیونکہ وہ ابن اللہ کی شخصیت کے مظہر تھے۔

چنانچہ صرف ایک انجیل (یوحنا کی انجیل) کے سات نشانات کو لیں ہر معجزہ پر معنی ہے اور کسی خاص حقیقت کا نشان دیتا ہے جو ابن اللہ کی شخصیت کے وسیلے خدا کی محبت کے کسی پہلو کا نشان دیتا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو:-

(۱) باب ۲: ۱۔۱۱ اس واقعہ کے نشان سے عالم و عالمیاں پر ظاہر ہو جائے کہ مسیحی جہاں گنہگار انسان کی فطرت و طبیعت کو بالکل تبدیل کرتا ہے

(۲) ۴: ۴۶۔۵۴ یہ نشان خدا کی محبت پر ایمان رکھنے کی ضرورت کا اعلان کرتا ہے۔

(۳) ۵: ۲۔۱۹ اس واقعہ اور نشان سے دنیا کے گنہگاروں کو جو برسوں سے شیطان کی غلامی میں گرفتار ہو کر بے کس ولاچار پڑے ہیں۔ یہ واثق یقین ہو جاتا ہے کہ خدا کی محبت مسیح کے ذریعہ ان کی قوت ارادی کو جو سلب ہو گئی تھی دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اور ہر گنہگار شیطان دنیا اور نفس امارہ (انسان کی خواہش جو بری کی طرف مائل کرتی ہے) پر قابو حاصل کر کے از سر نو خدا کا فرزند اور نجات کا وارث ہو جاتا ہے۔

(۴) ۶: ۴۔۱۳ اس نشان کا ذکر قرآن کی سورہ مائدہ آیات ۱۱۲ تا ۱۱۵ میں بھی ہے اور یہ اس حقیقت کا نشان ہے کہ جس طرح خدا کی محبت و رضا ابن اللہ کی خوراک تھی (یوحنا ۴: ۳۶) اسی طرح کلمۃ اللہ کی تعلیم زندگی موت و قیامت ہر ایماندار کی روٹی ہے (یوحنا ۴: ۵۔۲۶؛ ۶: ۲۷۔۳۵)۔

(۵) ۶: ۱۶۔۲۱ یہ معجزہ اس سچائی کا نشان دیتا ہے کہ اس دور روزہ فانی زندگی میں ابن اللہ ہماری زندگیوں کا راہنما ہے اور اس کی ذات ہماری روحانی زندگی کا سہارا ہے۔

(۶) ۹: ۱۔۷ یہ اس حقیقت کا نشان دیتا ہے کہ آنخداوند جو دنیا کا نور ہے ہر ایمان دار کی روح اور زندگانی کا آفتاب ہے جو شخص آپ کی پیروی کرتا ہے وہ گناہ کی تاریکی میں نہیں بھٹکتا پھرتا کیونکہ زندگی کا نور اس کو حاصل ہے (یوحنا ۸: ۱۲؛ ۹: ۵؛ ۱۲: ۴؛ ۱: ۹ وغیرہ)۔

(۷) ۱۱: ۱۔۴۴۔ اس ابدی صداقت کا نشان ہے کہ فقط ابن اللہ ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے اور مبدا و انتہا ہے۔ کیونکہ وہی "قیامت اور زندگی ہے۔ جو اس پر ایمان لاتا ہے گو وہ مر جائے تو، بھی زندہ رہے گا اور جو کوئی زندہ ہے اور اس پر ایمان لاتا ہے وہ ابد تک کبھی نہ مرے گا" (یوحنا ۱۱: ۲۵)۔

اب ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ کن معنوں میں ابن اللہ کے معجزے بالفاظ انجیل و قرآن "آیات بینات" کھلے اور واضح روشن نشانات تھے۔ خداوند مسیح کے تمام معجزات خدا کی محبت اور ابن اللہ کی ذات جو اس محبت کی مظہر ہی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ ابن اللہ کی ذات بابرکات گنہگار انسان کے روحانی قوائے مردہ کو اپنے مسیحائی دم سے زندہ کر کے اس کو ایک نیا مخلوق بنا دیتا ہے، ابن اللہ ہماری روحوں کی خوراک بن کر ہم کو یہ طاقت بخشتا ہے کہ اپنے ایمان کے بانی اور رہبر کے نقش قدم پر چل کر اس دنیا کے طوفانوں سے محفوظ رہ کر دنیا کے نور یعنی مسیح کی سی زندگی بسر کر سکیں تاکہ آئندہ کو ہم نہیں بلکہ مسیح ہم میں زندہ رہے (گلتیوں ۲: ۳۰)۔

یہ خصوصیت ایسی ہے جو کسی دوسرے نبی کے معجزات میں نہیں پائی جاتی اور صرف ابن اللہ کی ذات پاک سے ہے ایسے نشانات مخصوص ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ رسول عربی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ)(سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۲تا۲۵۳)

یعنی اے محمد۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو برحق ہیں جو ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں اور بے شک تم رسولوں میں سے ایک ہو۔ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت اور برتری دی ہے چنانچہ ان میں سے کوئی تو ایسا ہے جس سے خدا نے کلام کیا اور کسی کے درجے بلند کئے اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے کھلے کھلے نشانات دیے اور ان کی روح القدس سے مدد کی۔۔۔اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ابن مریم کی برتری درجہ کی بلندی اور فضیلت آپ کے نشانات کی خصوصیات اور دیگر خصوصیات میں ہے جن کا ذکر ہم اوپر کے عنوانات میں کر آئے ہیں۔

عصمت مسیح

اس موضوع پر ہم گذشتہ باب میں مفصل لکھ کر آئے یہاں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انجیل جلیل، قرآن مجید اور حدیث سب کے سب اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ کلمۃ اللہ خطا، گناہ اور بدی سے پاک تھے۔ چنانچہ ہم زیر عنوان ''مقامات مریم وابن مریم''قرآن کی آیات نقل کر آئے۔ جن میں لکھا ہے کہ ''خدا نے اپنی مسیح کو'' شیطان مردود سے اپنی پناہ میں رکھا(آل عمران ع ۴آیت ۳۱) تمام کے تمام قرآن مجید میں سوائے کلمۃ میں سوائے کلمۃ اللہ کے کوئی دوسری معصوم ہستی نہیں ملتی۔اس کے برعکس قرآن میں تمام اولوالعزم انبیا اپنے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اللہ سے معافی کے خواستگار ہیں (سورۃ یہود آیت ۴۶)(ابراہیم آیت ۴۰، ۴۱؛ قصص آیت ۱۶؛ مومن ۱۵؛اعراف ۲۲: وغیرہ) لیکن کلمۃ اللہ کی طرف کبیرہ تو الگ رہا کبھی کوئی گناہ صغیرہ کا خیال تک بھی کہیں منسوب نہیں کیا گیا ہے تمام قرآن میں نہ صرف آپ کی طرف نہ صرف کوئی گناہ یا اقرار گناہ یا استغفار منسوب ہے اور ان سے آپ کو مستغنی (بری، آزاد) کیا گیا ہے۔ بلکہ آپ کی معصومیت کا صریح کھلے اور واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے اور آپ کو وجیھا فی الدنیا والاخرۃ و من المقربین کہا گیا ہے۔ قرآن نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ آپ کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ قرار دے کر آپ کی زندگی کو انسانیت اور بنی نوع انسان کا معیار مقرر کر دیا ہے۔

خدا کی رحمت و فضل نے آپ کے مبارک وجود کے چاروں طرف سایہ کر رکھا ہے (سورہ ۲۲: ۵۱؛ ۲۴: ۱۱؛ ۳۳: ۴؛ ۶۶: ۱) ایسا کہ پیدائش سے لے کر صلیبی موت تک آپ ابلیس کی ہر آزمائش پر غالب آئے اور صلیب پر آپ نے شیطان کے سر کو کچل دیا جس پر آپ کی ظفر مند قیامت گواہ ہے۔

پس انجیل و قرآن دونوں کتب سماوی کے مطابق کلمۃ اللہ میں انسانیت کے کمال نے ظہور پکڑا اور یہ انسانیت آدم کی اولین صورت کا مبدا تھی جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا تھا۔ چنانچہ تورات شریف میں آیا ہے ''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا ''(پیدائش ۱: ۲۷)۔ پس کلمۃ اللہ کی انسانیت الوہیت کی صورت پر تھی اور ذات باری تعالیٰ کا عکس تھی ایسا کہ آپ نے اپنے رسولوں کو فرمایا کہ ''جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا''(یوحنا ۱۴: ۹) میں اور باپ ایک ہیں (یوحنا ۱۴: ۲۰) آپ کا وجود مبارک ''خدا کی ذات کا نقش'' تھا کیونکہ آپ مظہر ذات الٰہی تھے۔ اس وجود میں دنیا کے خاکی اور خاطی انسانوں نے خدا کے جلال کا پرتو دیکھا (عبرانیوں ۱: ۳)۔ کلمۃ اللہ کی قدوس اور پر محبت انسانی ذات میں الوہیت کے کمال کا ظہور تھا اور آپ کے وجود میں الوہیت اور انسانیت دونوں موجود تھیں۔ کیونکہ کامل انسانیت الوہیت کی ''صورت'' تھی۔ جب ہم کلمۃ اللہ کی قدوس زندگی پر الٰہی پہلو سے نظر کرتے ہیں تو اس میں ہم کو ''الوہیت کی ساری معموری سکونت کرتی

(کلسیوں ۱:۱۹) نظر آتی ہے اور ہم کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ خدا کس قسم کا خدا ہے اور جب ہم اس قدوس زندگی پر انسانی زاویہ نگاہ سے نظر کرتے ہیں تو ہم اس میں انسانیت کا کمال دیکھتے ہیں اور ہم کو علم ہو جاتا ہے کہ کامل انسان کس قسم کا انسان ہوتا ہے ہم کو انجیلی خطاب ''ابن اللہ اور قرآنی خطاب کلمۃ اللہ و روح اللہ'' کے حقیقی اور اصلی معنوں کا علم ہو جاتا ہے۔

وجووز باقضاتوام زجودش ماسواخرم

حدوثش باقدم ہمدم حیاتش باابدہمتا

حوارینِ مسیح صاحبِ وحی والہام اور رسول تھے

انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں الہامی صحیفے اس حقیقت کا ذکر کرتے ہیں کہ ابن اللہ کے شاگرد رسول اور صاحب وحی تھے۔ چنانچہ انجیلی مقامات (متی ۱۰:۳؛ مرقس ۶:۳۰؛ رومیوں ۱:۱ وغیرہ) سے ظاہر ہے کہ انجیلی مجموعہ تحریرات کے لکھنے والے خدا سے الہام پاکر نوشتوں کو لکھتے تھے (۱۔ کرنتھیوں ۱۴:۳۷ وغیرہ)۔ ابن اللہ نے خود اپنی زبان مبارک سے اپنے بارہ رسولوں کو ''رسول'' کا لقب دیا (لوقا ۶:۱۳؛ عبرانیوں ۵:۴)۔ قرآن میں بھی آیا ہے کہ حضرت کلمۃ اللہ کے یہ دوازدہ (بارہ) رسول مسلم یعنی اطاعت میں گردن رکھنے والے، مومن، انصار اللہ اور صاحب وحی اور الہام تھے (سورہ آل عمران آیت ۵، ۴۵؛ سورۃ صف آیت ۱۴؛ سورۃ المائدہ آیت ۱۱۱ وغیرہ)۔ ان رسولوں پر خدا کی طرف وحی نازل ہوئی تھی (اعمال ۲:۴؛ ۱۰:۱۹؛ ۱۱:۲۲) اور وہ خدا کی طرف سے رسول ہو کر ارض مقدس اور بیرونجات کے مختلف مقامات کو جاتے تھے تاکہ ان کو نجات کی خوشخبر کا پیغام دیں (اعمال ۸:۲۶؛ ۱۳:۲ وغیرہ) اور جہاں ان کو لے جاتا وہ جاتے (اعمال ۸:۲۶؛ ۱۳:۲ وغیرہ) جہاں ان کو جانے سے منع کیا جاتا وہ نہ جاتے (اعمال ۱۶:۶ وغیرہ) قرآن مجید میں غالباً اعمال الرسل کے (۱۵:۳۲) اور (۱۸ باب) کے واقعات کا مختصر بیان بھی آیا ہے۔

(وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ) (سورۃ یس آیت ۱۳۔۱۴)

یعنی تو ان کے لیے مثال کے طور پر ایک بستی والوں کا حال بیان کر۔ جب اس بستی میں رسول آئے۔ جب ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو ان کو بستی والوں نے جھٹلایا اور پھر ہم نے تیسرا رسول بھیج کر ان کی مدد کی۔ تب اس نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن نہ صرف ابن اللہ کے دوازدہ رسولوں کو ہی ''رسول'' بتلاتا ہے بلکہ ان سب کو بھی رسول کے لقب سے ملقب کرتا ہے۔ جو انجیلی نجات کے پیامبر ہو کر ارض مقدس کے اندر اور باہر اقصائے عالم تک پہنچ گئے تھے (متی ۲۸:۱۹؛ اعمال ۱:۸ وغیرہ) یہ پیامبر بھی اپنے آپ کو رسول کہتے تھے کیونکہ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کو ابن اللہ اور خدا باپ کی طرف سے رسالت کا درجہ عطا ہوا ہے (رومیوں ۱:۱؛ ۱۔ کرنتھیوں ۹:۱؛ افسیوں ۱:۱؛ ۱:۴؛ اعمال ۱۱:۲۷؛ ۳:۱؛ ۱۵:۲۲؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۲:۲۸ وغیرہ)

مذکورہ بالا حقائق میں ظاہر ہے کہ ابن اللہ نہ صرف خود نبی اور رسول تھے (متی ۱۳:۵۷؛ یوحنا ۴:۴۴؛ مرقس ۱۱:۳۲؛ لوقا ۷:۱۶؛ یوحنا ۱۷:۲)۔ بلکہ آپ رسول گر بھی تھے۔ کلمۃ اللہ نے نبوت کا دروازہ جو بنی اسرائیل میں سالہا سال سے بند اور مقفل (تالا لگا ہونا) تھا کھول دیا (متی ۱۰ باب؛ لوقا ۱۰ باب؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۴:۱۔۶ وغیرہ) اور آپ کی ظفریاب قیامت اور رفع آسمانی کے بعد آپ کے پیامبر اور نبی ہر جانب آپ کی نجات کی اشاعت کرنے گئے۔ اور انہوں نے نبوت کا درجہ حاصل کر کے دنیا کے مختلف گوشوں میں آپ کا جان فزا پیغام دیا (۱۔ کرنتھیوں ۱۲:۲۸؛ ۱۴:۲۹، ۳۲؛ اعمال ۱۱:۲۷؛ ۱۳:۱؛ ۱۵:۳۲؛ افسیوں ۲:۲۰؛ ۳:۵؛ ۴:۱۱؛ متی ۳:۲۴؛ لوقا ۱۱:۴۹؛ اعمال ۲۱:۹۔۱۰؛ ۲۸:۱۶، ۲۸۔۳۱ وغیرہ) نبوت کا یہ

دروازہ جو کلمۃ اللہ نے کھولا وہ دو ہزار سال سے تا حال کھلا ہے اور مختلف ممالک و اقوام میں بیسوں ناموافق اور مخالف حالات میں کھلا رہا ہے اور اس دروازہ کو تا قیامت کوئی بند نہیں کر سکتا (مکاشفات ۳:۷)۔

مسیح کی رفع آسمانی

انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں کلمۃ اللہ کی ظفریاب قیامت کے بعد آپ کے رفع آسمانی کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں وارد ہوا ہے۔

(یَا عِیسَیٰ إِنِّي مُتَوَفِّیكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ) (سورۃ آل عمران آیت ۵۵)

یعنی اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف اُٹھانے والا ہوں۔

سورہ مریم میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا

(وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا) (سورۃ مریم آیت ۳۳)

یعنی مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن میں پھر جی کر اٹھ کھڑا ہوں گا۔

انجیل میں بھی ابن اللہ کی ظفریاب قیامت کے واقعہ کے بعد رفع آسمانی کے واقعہ کا ذکر آیا ہے چنانچہ کلمۃ اللہ کی زبان حقیقت ترجمان نے خود فرمایا ہے ''تم ابن آدم کو اوپر جاتے دیکھو گے جہاں وہ پہلے تھا'' (یوحنا ۶:۶۲)۔ مقدس مرقس لکھتا ہے ''جنابِ مسیح اپنی قیامت کے بعد رسولوں سے کلام کرنے کے بعد آسمان پر اٹھایا گیا اور خدا کی دہنی طرف بیٹھ گیا'' (مرقس ۱۶:۱۹) مقدس لوقا لکھتا ہے ''پھر یسوع رسولوں کو بیت عنیاہ کے سامنے تک باہر لے گیا اس نے اپنے ہاتھ اُٹھا کر ان کو برکت دی جب وہ ان کو برکت دے رہا تھا تو وہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا اور وہ اس کو سجدہ کر کے بڑی خوشی سے یروشلیم کو لوٹ گئے اور ہر وقت ہیکل میں حاضر ہو کر خدا کی حمد کرتے تھے'' (لوقا ۲۴:۵۔۵۳)۔ انجیل جلیل کے مجموعہ کے دیگر مصنف بھی کلمۃ اللہ کے جلالی رفع آسمانی کا اکثر ذکر کرتے ہیں (اعمال ۷:۵۵۔۵۶؛ رومیوں ۸:۳۴؛ افسیوں ۱:۲۰؛ کلسیوں ۳:۱؛ عبرانیوں ۱:۳؛ ۸:۱؛ ۱۰:۱۲؛ ۱۲:۲؛ ۱۔ پطرس ۳:۲۲؛ مکاشفات ۳:۲۱ وغیرہ)۔

قرآن مجید میں حضرت کلمۃ اللہ کے رفع سماوی کا ذکر ہے لیکن کسی دوسرے نبی یا انسان کے لئے یہ وارد نہیں ہوا کہ خدا نے اس کو اپنی طرف اُٹھا لیا تھا ابن اللہ کا رفع آسمانی اس لیے ہوا کہ ''آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوا اس کے جو آسمان پر سے اترا۔ یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے'' (یوحنا ۳:۱۳) ابن اللہ آسمان پر سے اترے تا کہ اپنے آسمانی باپ کی رضا پر عمل کریں (یوحنا ۶:۳۸)۔ ابوالبشر حضرت آدم اور تمام فرزند آدم یعنی بنی نوع انسان ''خاکی'' تھے لیکن ''آدم ثانی'' ''ابن اللہ'' آسمانی تھے (۱۔ کرنتھیوں ۱۵:۴۷) جو اپنے آسمانی باپ کے محبوب ابن وحید تھے (متی ۳:۱۷) جس کے آپ کامل اور اکمل مظہر تھے (یوحنا ۱:۱۸)۔ آپ دنیا کو آسمانی باپ کی ازلی محبت کی حقیقت اور آسمان کی باتیں بتلا کر ''آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ اور باپ کی دہنی طرف جا بیٹھے (یوحنا ۳:۱۲، ۱۶؛ مرقس ۱۶:۱۹)۔

مسیح کی آمد ثانی

انجیل اور قرآن مجید کے ماننے والے سب کے سب ابن اللہ کی آمد ثانی کے چشم براہ ہیں۔ آپ نے قائفین یہود جو آپ کے خون کے پیاسے تھے فرمایا ''تم ابن آدم کو قادر مطلق کی دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے'' (مرقس ۱۴:۱۶)۔ آپ نے اپنے متبعین سے فرمایا تھا ''ابن آدم اپنے جلال میں آئے گا اور سب فرشتے اس کے ساتھ آئیں گے'' (متی ۲۴:۳۰؛ ۲۵:۳۱)۔

کسی دوسرے رسول وپیغمبر کی نسبت سے ایسا دعویٰ نہیں کرتے۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی اور مسیحی دنیا کے لوگ صرف کلمۃ اللہ کی آمد ثانی کا اس شد و مد سے انتظار کر رہے ہیں۔

ابن اللہ منصف و عادل

(۱)

انجیل جلیل میں وارد ہوا ہے کہ کلمۃ اللہ کی زبان حقیقت ترجمان نے فرمایا کہ عدالت کے روز اقوام عالم ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھیں گے (متی ۲۴:۳۰)۔جب ابن آدم اپنے جلال میں اپنے فرشتوں کے ساتھ آئے گا اور اس وقت ہر ایک کو اس کے کاموں کے مطابق بدلہ دے گا"(متی ۱۶:۲۷)۔جب ابن آدم اپنے جلال میں آئے گا اور سب فرشتے اس کے ساتھ آئیں گے۔تب وہ اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا اور سب قومیں اس کے سامنے جمع کی جائیں گی"۔

"کیونکہ باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کر دیا ہے"اور "اسے عدالت کرنے کا اختیار بخشا ہے"۔ (متی ۲۵:۳۱؛یوحنا ۵:۲۲؛۵:۲۷وغیرہ)

(۲)

ابن اللہ نے وہ بنیادی اصول بھی بتلا دیئے ہیں جن کی بنا پر آپ قوموں کی عدالت کریں گے جب کلمۃ اللہ خدا کی ذات پاک کا مظہر ہے اس دنیا میں آئے تھے آپ نے یہ تعلیم دی تھی کہ خدا کی ذات محبت ہے اور وہ مخلوق کا ازلی اور ابدی باپ ہے کیونکہ وہ بنی نوع انسان سے لازوال محبت کرتا ہے آپ نے فرمایا تھا کہ "تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ اور ہر انسان سے اپنے برابر محبت رکھ۔انہی دو حکموں پر تمام تورات اور صحائف انبیاء کا مدار ہے"(متی ۲۲:۳۴۔۴۰؛لوقا ۱۰:۲۵۔۳۷وغیرہ)۔

پس روز عدالت ابن اللہ ان دو اصولوں کی بنا پر اقوام وافراد کی عدالت کریں گے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ بادشاہ (ابن اللہ خود) اس روز اقوام عالم کے افراد کو ایک دوسرے سے جدا کر کے تخت عدالت کے دہنی اور بائیں طرف والوں سے کہے گا،آؤ میرے باپ کے مبارک لوگو جو بادشاہت بنائے عالم سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔اسے میراث میں لو۔کیونکہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی پلایا۔میں پردیسی تھا تم نے مجھے گھر میں اتارا۔ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔بیمار تھا تم نے میری خبر گیری کی۔قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔تب راستباز جواب میں اس سے کہیں گے اے خداوند۔ہم نے کب تجھے بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا؟ یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا؟ہم نے کب تجھے پردیسی دیکھ کر گھر میں اتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تیرے پاس آئے؟ بادشاہ جواب میں ان سے کہے گا میں تم کو سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا پھر بادشاہ بائیں طرف والوں سے کہے گا کہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا۔پیاسا تھا پر تم نے مجھے پانی نہ پلایا۔ پردیسی تھا تم نے مجھے گھر میں نہ اتارا۔میں ننگا تھا پر تم نے مجھے کپڑے نہ پہنائے۔بیمار اور قید میں تھا پر تم نے میری خبر نہ لی۔تب وہ بھی جواب میں کہیں گے اے خداوند ہم نے کب تجھے بھوکا یا پیاسا پردیسی یا ننگا یا بیمار یا قید میں دیکھا اور ہم نے تیری خدمت نہ کی؟اس وقت وہ ان سے جواب میں کہے گا کہ جب تم نے ان سب سے چھوٹوں میں سے کسی کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا تو میرے ساتھ نہ کیا(متی ۲۵:۳۱۔۴۶)۔

پس جو شخص خدا کی رضا پر چل کر بنی نوع انسان کے ساتھ رنگ ذات،مذہب قوم وغیرہ کی تمیز کئے بغیر محبت،اخوت اور مساوات کا سلوک کرے گا وہی مبارک ہو گا اور عدالت کے روز ابن اللہ کی عدالت میں دائیں ہاتھ کھڑا ہو گا۔لیکن جو شخص خدا اور انسان کے ساتھ زبانی جمع

خرچ کا سلوک کرے گا اور نہ خدا کی محبت کا جواب اس کے دل میں ہو گا اور نہ انسان کی محبت واخوت و مساوات کے اصول اس کے دل میں ہوں گے وہ ابن اللہ کی نظر میں ''ملعون'' ہو گا (متی ۵: ۴۱)۔ کیونکہ جب ابن اللہ اس دنیا میں خدا کا مظہر ہو کر آئے نور رضائے الٰہی اور محبت خداوندی آپ کا ''کھانا پینا تھا'' (یوحنا ۴: ۳۴)۔ آپ یہی چاہتے ہیں کہ جو آپ کی پیروی کرتا ہے وہ زبانی جمع خرچ کے ایمان کی ''تاریکی میں نہ چلے'' بلکہ خدا کی محبت بھری رضا پر چلے اور ''نور کی پیروی'' کرے اور آپ کے سے کام کرے۔ اسی واسطے کلمۃ اللہ نے فرمایا ''تم ان کے پھلوں سے ان کو پہچان لو گے۔ جو مجھ کو اے خداوند، اے خداوند کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک آسمان کی بادشاہی میں دخل نہ ہو گا مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ اس روز عدالت کے وقت بہتیرے مجھ سے کہیں گے اے خداوند، اے خداوند کیا ہم نے تیرے نام سے معجزے نہیں کئے؟ اس وقت میں ان سے صاف کہہ دوں گا کہ میری تم سے کبھی واقفیت ہی نہ تھی۔ اے بدکردار لوگو! میرے پاس سے چلے جاؤ (متی ۷: ۲۰۔۲۳)۔

(۳)

پس انجیل جلیل کے مطابق ابن اللہ ''زندوں اور مردوں کی عدالت کریں گے (۲۔ تیمتھیس ۴: ۱؛ ۱۔ پطرس ۴: ۵ وغیرہ) آپ کی زبان معجز بیان نے فرمایا ''میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں جیسا سنتا ہوں ویسی عدالت کرتا ہوں۔ میری عدالت راست ہے کیونکہ میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہوں۔ میں آسمان سے اس لئے نہیں اترا ہوں کہ اپنی مرضی کروں بلکہ اس لیے آیا ہوں کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں یہ اس لئے ہے تاکہ دنیا جان لے کہ میں باپ سے محبت رکھتا ہوں اور جس طرح باپ نے مجھے حکم دیا ہے میں ویسا ہی کرتا ہوں (یوحنا ۵: ۳۰؛ ۶: ۳۸؛ ۱۴: ۳۱ وغیرہ) ''پس میری عدالت درست ہے اور میرا فیصلہ سچا ہے کیونکہ فیصلہ کرنے والا میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ میں ہوں اور باپ ہے جو میری گواہی دیتا ہے'' (یوحنا ۸: ۱۸ وغیرہ)۔

آنخداوند کو قیامت کا علم کلی طور پر ہے کیونکہ بالفاظ قرآن آپ ''علم للساتمہ'' ہیں اور ''علم اللہ'' ہیں کلمۃ اللہ روح اللہ ہیں اب ظاہر ہے کہ علم ملت سے علم معلول لازم ہے پس آپ کو جمیع حوادثات (حادثہ کی جمع، مصیبتیں) وواقعات عالم کا علم ہے اور ہر بشر کے ظاہر و باطن سے آپ واقف ہیں پس قیامت کے روز سبحانہ تعالیٰ نے عدالت کا کام المسیح ابن اللہ کے سپرد کر دیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ آپ مالک یوم الدین ہیں اور آپ ہی ملک اور بادشاہ ہیں اور یہی انجیل جلیل کے الفاظ ہیں (متی ۲۴: ۳۰؛ ۱۶: ۲۷؛ ۲۵: ۳۱؛ یوحنا ۵: ۲۲؛ ۵: ۲۷؛ ۲۔ تیمتھیس ۴: ۸ وغیرہ)۔

زماں راعدل اوزیور جہاں راذات او مفخر
زماں رااوزماں پرور جہاں رااوجہاں پیرا
جہاں رااوبعد آمر چہ درباطن چہ در ظاہر
بآمر اوشود صادر زد یوان قضا طغرا

(قاآنی)

خدا نے عدالت کا سارا کام ابن اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ لیکن یہ سرفرازی خدا نے کسی اور انسان یا نبی کو عطا نہیں فرمائی۔ پس اس لحاظ سے بھی کلمۃ اللہ دیگر انبیاء کی قطار میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ حق تو یہ ہے کہ جس زاویہ سے بھی کلمۃ اللہ کی پیدائش، زندگی، تعلیم، صلیبی موت، ظفر مند قیامت، رفع سماوی کو دیکھ جائے وہ کتب سماوی کے مطابق بے عدیل، بے نظیر اور لاثانی نظر آتی ہے۔ آپ بشر ہوتے ہوئے بھی فوق البشر تھے۔ ایسا

کہ ''الوہیت کی ساری معموری کلمۃ اللہ میں موجود تھی اور آپ کی کامل انسانیت کے پردے میں الوہیت کامل اور اکمل ظہور جلوہ گر تھا۔ کامل الوہیت کا ظہور آپ کی کامل انسانیت میں پایا جاتا ہے اور آپ کی انسانیت کے کمال میں خاکی اور خاطی انسان کو الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے۔

در بشر روپوش کردہ است آفتاب
فہم کن اللہ اعلم بالصواب
صورتش برخاک وجاں بر لامکاں
لامکا نے فوق وہم سالکاں

(مولانا روم)

اگر کوئی شخص یہ سوال پوچھے کہ قدیم اور حادث کس طرح باہم پیوند ہو سکتے ہیں تو ہم اس کی توجہ قرآن مجید کی (سورہ قصص کی آیت ۳۰) کی جانب مبذول کریں گے۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ ''جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچا تو میدان کے دائیں کنارے مقدس جگہ میں جھاڑی سے یہ آواز آئی کہ اے موسیٰ میں رب العالمین ہوں'' پھر وارد ہوا ہے کہ ''یہ آواز دی گئی کہ مبارک ہے وہ جو آگ میں ہے اور اس کے آس پاس ہے'' (سورہ نحل آیت ۸) تورات مقدس میں بھی یہی لکھا ہے کہ ''خدا ایک جھاڑی میں آگ کے شعلہ کی صورت میں حضرت موسیٰ کو نظر آیا اور اس میں سے آواز آئی کہ میں تیرے باپ کا خدا ہوں'' (خروج ۳: ۱۔۶) جب لامحدود خدا مادی اشیاء کے ذریعہ اپنے جلال کا جلوہ خاطی انسان پر ظاہر کر سکتا ہے تو وہ اپنی ذات کا کامل ظہور (کلمۃ اللہ وروح اللہ وجھا فی الدنیا والاخرۃ ومن المقربین) کی اعلیٰ، برتر، پاک اور قدوس انسانیت کے وسیلے بدرجہ احسن دکھلا سکتا ہے کیونکہ ابن اللہ خدا کی ذات کا نقش ''اور اس کے جلال کا پرتو ہے الوہیت کا جلوہ مظہر یزدانی ابن اللہ کی نورانی زندگی کے انوار کی ضیا پاشیوں میں ظہور پذیر ہوا۔

پدر نور وپسر نور یست مشہور
ازیں جا فہم کن نور علیٰ نور

مسیح کی ہمہ گیری

ہم نے ان سطور میں ناظرین پر کلمۃ اللہ مسیح ابن مریم کی عظمت وجلالت اور تورات وانجیل وقرآن کی شہادت کی بنا پر آپ کے صحیح مقام کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ کتب سماوی ہم کو بتلاتی ہیں کہ دیگر انبیاء مختلف اقوام عالم کی جانب اللہ کے مرسل ہو کر آئے تھے اور ہر رسول کا پیغام اس کی خاص قوم اور اس کی بعثت کے وقت کے خاص حالات سے وابستہ تھا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ دیگر حالات پیدا ہو گئے اور اس رسول کا خاص پیغام خود اس کی قوم کی آنے والی نسلوں کے لئے بھی مشعل ہدائت نہ رہا۔ کیونکہ وہ قوم کے خاص حالات سے ہی مختص تھا اس کی قوم کی آنے والی نسلوں نے اس کے قوانین اور اصول وآئین کو جامد اور ٹھوس پایا جن کا اطلاق ان کے زمانہ کے حالات پر نہیں ہو سکتا تھا۔ پس وہ پیغام اس قوم کے مصرف کا بھی نہ رہا دیگر ممالک واقوام نے بھی اس کے پیغام کو اپنے خصوصی حالات سے ناسازگار پا کر اس کو خیر باد کہہ دیا۔

اس کے برعکس کلمۃ اللہ دنیا کے لئے ایسا پیغام لائے جو نہ تو کسی خاص قوم وملک سے وابستہ تھا اور نہ کسی خاص زمانہ اور حالات زمانہ سے متعلق تھا۔ ابن اللہ نے دنیا کے ہر بشر کو خدا کی ازلی اور ابدی محبت کا ابوت الٰہی کا اور اخوت ومساوات انسانی کا سبق دیا جو زمان ومکان کی قیود سے بلند وبالا اور ان سے آزاد ہونے کی وجہ سے عالمگیر اور ہمہ گیر تھا۔ یہ سنہرے جہانگیر نتیجہ خیز اصول اور کلمۃ اللہ کے کلمات طیبات دنیا کے ہر ملک وقوم

کے کروڑوں انسانوں کی زندگی کو دو ہزار سال سے متاثر کرتے چلے آئے ہیں۔تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ کا پیغام آخری، قطعی اور بے مثال ولازوال مکاشفہ ہے جو ہر پہلو سے بے نظیر اور بے عدیل ہے۔ہر قوم وملک کی تاریخ کے اوراق (سورہ مریم کی آیت ۲۱) پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں

۔

(وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا) (سورۃ مریم آیت ۲۱)

ہم (خدا) اپنے کلمہ اور روح عیسیٰ مسیح ابن مریم کو اپنی طرف سے دنیا کے آدمیوں کے لیے رحمت اور نشان بنانا چاہتے ہیں اور یہ امر مقدر ہو چکا ہے۔

کلمۃ اللہ نے اپنے بے مثال پیغام پر خود عمل کر کے بنی نوع انسان کو ایسا کامل اور اکمل نمونہ دیا ہے جو ہر پہلو سے خدا کی اس لازوال اور ازلی محبت کا مظہر ہے جو وہ ہر فرد بشر سے اور بدترین گنہگاروں سے کرتا ہے۔ابن اللہ کی زندگی اور موت ایک صاف اور شفاف آئینہ ہے جس میں خدا کی ذات اور اس کی محبت کی جھلک ہر صاحب بصیرت کو دکھائی دیتی ہے حضرت روح اللہ کی قدوس ذات میں ایک بات بھی ایسی نہیں پائی جاتی جو مقامی ہو اور امتداد زمانہ کے ساتھ قابل تقلید نہ رہی ہو۔کلمۃ اللہ کے کلام کے اصولوں کی طرح آپ کی پاک ذات بھی عالمگیر اور ہمہ گیر ہے کیونکہ آپ کی کامل انسانیت میں ''الوہیت کی ساری معموری'' کا ظہور ہے۔ابن اللہ الٰہی الاصل تھے اور خدائے واحد و برحق کے کلمہ تھے جو پیکر انسانی میں ظاہر ہوئے

وجودش باقضاتوام ، زجودش ماسوا خرم

حدوثش باقدم ہمدم ،عیاتش باابد ہمتا

(حکیم قاآنی)

ہم نے اس فصل میں کلمۃ اللہ کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے جو انجیل وقرآن میں مشترکہ ہیں۔ہم نے ناظرین کو بتلایا ہے کہ آنخداوند کی فوق العادت اور اعجازی پیدائش میں کوئی دوسرا انسان یا نبی آپ کا ہمسر نہیں ہوا کیونکہ کوئی دوسرا فرزند آدم خدا کی خاص قدرت سے پیدا نہیں ہوا ۔آنخداوند مادرزاد نبی تھے جن کو خدا نے خود کلمۃ اللہ ،روح اللہ اور ابن اللہ کے القاب سے معزز فرمایا۔ان خطابات سے ظاہر ہے کہ ابن اللہ ''خدا میں سے خدا'' ہیں اور آپ کو وہ مقام حاصل ہے جو کسی دوسرے انسان کو کبھی حاصل نہ ہوا۔کلمۃ اللہ خدا کی قدرت اور خدا کی وہ حکمت ہیں ان صفات سے کسی انسان ضعیف البنیان (جس کی بنیاد کمزور ہو) کو خدا نے متصف (صفت رکھنے والا) نہیں کیا۔آپ کی جانب وہ قدرت وحکمت اور جلال وعظمت منسوب کی گئی جو کسی بشر کے حصہ میں نہ آسکتی ہے اور نہ آئی۔آپ خالق باذن اللہ ہیں اور خدا کا وہ کلام ہے جس کے وسیلہ سے کل موجودات اور کائنات وجود میں آئی۔آپ نہ صرف جسمانی مردوں کو ہی زندہ کرتے تھے بلکہ آپ گنہگاروں کی مردہ روحوں کو ابلیس کے پنجہ سے رہا کرتے تھے اور ان کو از سر نو زندگی عطا کر کے خدا کے فرزند بنا دیا اور گذشتہ دو ہزار سال سے ہر قوم نسل ملک کے کروڑوں روحانی مردوں کو زندہ کرتے چلے آئے ہیں۔ان تمام باتوں میں دنیا کا کوئی انسان یا نبی آپ کا ہمسر نہیں ہوا۔

کہ عدیم است عدیلش جو خداوند کریم

آپ نہ صرف خود رسول تھے بلکہ آپ رسول گر تھے اور رسول گر ہیں۔آپ کے رسول صاحب وحی والہام ہیں۔آپ کے معجزات خدا کے وہ نشانات ہیں جو خدا کے قدوس اور محبت بھرے دل کا اظہار ہیں۔آپ کی صلیبی موت بھی آپ کی زندگی کی طرح خدا کی ذات کا کامل اور اکمل مکاشفہ ہے ۔آپ کی ظفریاب قیامت نے عالم وعالمیان پر اس حقیقت کو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن کر دیا ہے کہ ''موت فتح کا لقمہ

ہو گئی"۔اور آپ نے ابلیس اور اس کی تمام طاقتوں کو کچل کر رکھ دیا اور موت کے ڈنک کو نکال دیا۔ایسا کہ اب تمام مومنین اور مومنات موت اور شیطان کو للکار کر کہتے ہیں "اے موت تیری فتح کہاں رہی ؟اے موت تیرا ڈنک کہاں رہا؟موت کو ڈنک گناہ ہے مگر خدا کا شکر ہے جو ہمارے جنابِ مسیح کے وسیلے سے ہم کو فتح بخشتا ہے"(۱۔کرنتھیوں ۱۵: ۵۴۔۵۷) کیا کسی دوسرے انسان یا نبی نے ان امور کو ایسی نمایاں کامیابی سے سرانجام دیا ہے ؟کیا کسی دوسرے فرزند آدم کا رفع آسمانی ہوا ہے کہ وہ عرش معلیٰ پر "خدا کے دہنے ہاتھ جا بیٹھا" ہو؟کیا کسی شخص نے اس دنیا میں کسی گنہگار کو اپنے اختیار سے اس کے گناہوں کی مغفرت بخشی ہے ؟کیا کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ بات آئی ہے کہ خدا نے قیامت دن بنی نوع انسان کی عدالت کا سارا کام اس کے سپرد کر دیا ہے؟ یہ عزت ،رتبہ ،درجہ اور سرفرازی ابن اللہ اور صرف ابن اللہ کو ہی حاصل ہوئی ہے جس نے بنی آدم پر اپنی ذات میں انسانیت کا کمال اور ذات الوہیت کی محبت ازلی کا جلال دکھلا دیا۔

خدا نے اپنے محبوب ابن کو دنیا اور مافیہا (جو کچھ اس میں ہے) پر قدرت اور و مخلوق فرد بشر پر اور ہر مرسل ، نبی اور رسول پر فضیلت بخشی ابن اللہ کی اعجازی پیدائش خارق (پھاڑنے والا، کرامت) عادت تھی آپکا مسیحی نفس مردوں کو زندگی بخشتا تھا اور زندوں کی زندگی کا اصل تھا۔آپ کی صلیبی موت نے تمام دنیا کو داد و رسن کے فلسفہ کا سبق سکھا دیا آپ کی ظفریاب قیامت نے تاریکی کے تمام قوتوں اور شیطانی طاقتوں پر فتح حاصل کر کے دنیا جہان کے گنہگاروں کو ابلیسی لعین کی غلامی سے نجات بخش کر از سر نو خدا کے فرزند اور آسمان کی بادشاہی کے وارث بنا دیا اور ان کو نیا مخلوق بنا کر اس قابل کر دیا کہ وہ دنیا کی کایا پلٹ دیں۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می گیرم

کرشمہ دامن دل کشد کہ جا اینجاست

اب کیا ہر گنہگار شخص کا فرض نہیں کہ وہ کلمتہ اللہ کی پاک اور پر از محبت ہستی پر نظر کرے اور اس کے فضل سے توفیق پا کر دلی توبہ کرے اور "دنیا کے منجی" پر ایمان لا کر نجات ابدی اور سعادت سرمدی حاصل کرے۔

چسیت یاران طریقت بعد ازیں تدبیرما

فصل سوئم

المسیح کی خصوصیات معجزات اور دعاوی

خصوصیاتِ مسیح

مسیحیت کا ابتدا ہی سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ جنابِ مسیح خدا کے بے عدیل مظہر اور کل دنیا کے منجی ہیں۔ مسیحیت نے اپنی تاریخ کے کسی زمانہ میں بھی آنخداوند کو دیگر انبیاء، اولیا، صالحین، مصلحین یا مرسلین کی قطار میں شمار نہ کیا۔ اس کے کبھی وہم و گمان میں بھی نہ آیا کہ کلمۃ اللہ کو محض ایک رسول قرار دے دے جس کی زندگی دیگر انبیاء کی زندگیوں سے بہتر تھی اور جو انسانی کمزوریوں میں دیگر انسانوں سے کم مبتلا تھا اور جس کا کام دیگر اقوام کے انبیاء اور مصلحین کی طرح یہودی قوم اور مذہب کی محض اصلاح کرنا تھا۔ چنانچہ مورخ لیکی (Lecky) کہتا ہے

> ''مسیحیت نے عصبیت (طرف داری) کے زور سے اپنے نظام کو جس قدر مضبوط اور مستحکم بنالیا تھا یہ بات کسی اور مذہب کو نصیب نہ تھی۔ مسیحیت کے سے انضباط و عصبیت سے اس کے حریف یکسر معریٰ (بلکل پاک صاف) تھے۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کے سوا دنیا کے تمام مذاہب باطل ہیں۔ نجات صرف اس کے پیروؤں کے لئے ہیں اور بدنصیب ہیں وہ جو اس کے حلقہ کے باہر ہیں''۔

انجیل جلیل میں کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ تمام مذاہب یکساں ہیں اور کہ مسیحیت دیگر مذاہب میں سے ایک مذہب ہے جس کا بانی دیگر مذاہب کے بانیوں میں سے ایک ہے۔ اس کے واحد ادیان کے عقیدہ کے برعکس انجیل شریف کا ایک ایک صفحہ اس بات کا گواہ ہے کہ مسیحیت اور دیگر مذاہب کے درمیان بعد المشرقین کا فرق ہے۔

مسیحیت کا دعویٰ

جب ہم انجیل شریف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ خداوند مسیح خود اس عقیدہ کے منبع اور سرچشمہ تھے کہ آپ انبیاء کی قطار میں شمار نہیں ہو سکتے گو آپ کی روحانی نشوونما عہد عتیق کی کتب کے ذریعہ ہوئی۔ حتیٰ کہ یہودی انبیاء کی کتب مقدسہ آپ کو زبانی یاد تھیں۔ لیکن آپ کو یہ احساس اور علم تھا کہ آپ کے اختیار میں اور عہد عتیق کے دیگر انبیاء عظام کے اختیار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دیگر انبیاء کہتے تھے ''خداوند یوں فرماتا ہے'' (یسعیاہ ۴۲: ۵؛ ۲۔ تواریخ ۱۸: ۱۳ وغیرہ)۔ لیکن آپ کہتے تھے ''میں تم سے کہتا ہوں'' (متی ۵ باب) آپ رسول کی طرف نہیں بلکہ بھیجنے والے کی طرح کلام کرتے تھے کیونکہ آپ کو یہ احساس تھا کہ آپ خدا کی باتیں کہتے ہیں (یوحنا ۳: ۲۴)۔ دیگر انبیاء کہتے تھے کہ ''خدا کا کلام ابد تک رہتا ہے (یسعیاہ ۴۰: ۶، ۸) لیکن آپ نے فرمایا ''آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی (لوقا ۲۱: ۳۳) ۔آپ کے زمانہ میں انبیاء یہود کی کتب چٹان کی مانند مضبوط اور استوار خیال کی جاتی تھیں لیکن آپ کے عظیم الشان پیغام کے ایک لفظ سے ان کو تبدیل کر دیا (توبت ۵: ۳؛ لوقا ۹: ۵۹ الخ؛ توبت ۵: ۱۶؛ متی ۷: ۱۲؛ توبت ۵: ۱۸؛ متی ۹: ۱۰) آپ کو یہ احساس تھا کہ موسوی شریعت کے احکام صادر کر رہے ہیں لیکن جائے حیرت یہ ہے کہ جب آپ اس قسم کی تبدیلیاں کرتے اور اپنے اصول کی تلقین کرتے ہیں تو آپ یہ نہیں فرماتے کہ خدا کا فرمان یہ ہے ۔ان معاملات میں آپ خدا کے نام کا ذکر تک نہیں کرتے بلکہ شریعت کے اختیار کے مقابلہ میں آپ اپنا اختیار پیش کر کے فرماتے ہیں ''میں تم سے

کہتاہوں"(متی ۵: ۲۲، ۲۸، ۳۳، ۳۴، ۳۹، ۴۴)ادیان عالم کے انبیاء میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی کبھی نہ آیا کہ وہ ابن اللہ کی مانند کہے "تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا ہے۔۔۔ لیکن "میں تم سے کہتا ہوں"۔ تمام جہاں کے مذاہب کی کتب چھان مارو تم کہیں اس قسم کا اختیار نہ پاؤ گے لیکن کلمتہ اللہ ان احکامات کو اس طرح صادر فرماتے ہیں کہ وہ آپ کے ذہن کی قدرتی باتیں ہیں۔ حضرت موسیٰ کے خواب وخیال میں بھی یہ بات کبھی نہ آئی (خروج ۲۰: ۱) لیکن ابن اللہ کو یہ احساس تھا کہ آپ بنی نوع انسان کے سامنے ایک الٰہی مقنن (قانون بنانے والا) کے طور پر خدا باپ کی طرح حکم دے سکتے ہیں (یوحنا ۱۳: ۳۴؛ ۱۴: ۱۵؛ ۱۵: ۱۰ وغیرہ) آپ نے اپنے پیغام کو انبیائے سابقین کے پیغام سے اعلیٰ اور ارفع اور اپنی زندہ شخصیت کو کتب متداولہ (ایک دوسرے سے باری باری لیا گیا) کے الفاظ سے بلند وبالا قرار دے دیا (متی ۱۲: ۴۱۔ ۴۲) آپ کو یہ احساس تھا کہ انبیائے سابقین نے خدا کا پیغام غیر مکمل طور پر ادا کیا ہے۔ پس آپ نے فرمایا "میں شریعت اور صحف انبیاء کو کامل کرنے آیا ہوں (متی ۵: ۱۷) آپ نے ان کتب مقدسہ اور انبیا کے کلام کی تنقیح اور تنقید بھی کی (لوقا ۹: ۵۴؛ متی ۱۸: ۲۲؛ ۹: ۱۳)۔ آپ کو یہ احساس تھا کہ آپ کی ذات بابرکات خود کتب عہد عتیق کا حقیقی مطمح نظر اور نصب العین ہے (یسعیاہ ۴۲: ۲۔ ۳؛ ۴۱: ۱۔ ۲؛ یوحنا ۳: ۱۴، متی ۱۲: ۴۰؛ ۲۲: ۴۲)۔ پس آپ اپنے پیغام کو ان سے اعلیٰ اور ارفع (متی ۵: ۳۹؛ ۵: ۴۵؛ ۶: ۴۱۔ ۴۲؛ مرقس ۱: ۲۲ وغیرہ) اور اپنی زندہ شخصیت کو ان کتب کے الفاظ سے بلند وبالا قرار دیتے تھے (یوحنا ۹: ۳۵؛ ۷: ۳۸؛ ۶: ۵۸ وغیرہ) کہاں آپ کی تعلیم اور کہاں یہودی ربی حلیل اور ربی شمعون اور ربی نقودیمس اور ربی گملی ایل کی تعلیم! یہی وجہ ہے کہ سامعین بے اختیار بول اٹھتے تھے کہ آپ "صاحب اختیار کی طرح" تعلیم دیتے تھے (مرقس ۱: ۲۲؛ متی ۷: ۲۸ وغیرہ)۔

ببین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

کلمتہ اللہ کی تعلیم میں ایسے عناصر تھے جن کو اہل یہود نے کبھی نہ سنا تھا اور جو مروجہ یہودیت کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھے۔ چنانچہ یہودی عالم ڈاکٹر مانٹی فیوری کہتا ہے

> "اسرائیل کی مذہبی تاریخ میں یہ ایک نئی بات تھی جو ناصرت کے ربی نے سکھائی کہ محبت سے لوگوں کو خدا کی طرف لایا جائے"۔

خدا کے مسیحی تصور کی نسبت یہ یہودی نقاد لکھتا ہے کہ

> "عبرانی کتب مقدسہ میں کسی نبی کی زبان سے خدا کی نسبت یہ الفاظ نہ نکلے "باپ" "تمہارا باپ" "ہمارا باپ"، جس طرح متی کی انجیل میں یسوع کی زبان سے نکلے"

یہودی عالم ڈاکٹر کلاسز (Klusner) کہتا ہے کہ

> "اخلاقیات اور الٰہیات کے معاملہ میں یسوع کے خیالات ایسے عجیب اور نرالے تھے کہ اہل یہود کے لئے ان کو تسلیم کرنا غیر ممکن تھا۔ ان حالات میں یہود اور یسوع کا کسی بات پر اتفاق کرنا ممکن نہ تھا یسوع کی تعلیم نہ صرف فریسیوں کی تعلیم کے خلاف تھی بلکہ وہ یہودی کتب مقدسہ کے بھی خلاف تھی"۔

مسیح اور علم غیب

انجیل جلیل اور قرآن مجید دونوں اس حقیقت پر اصرار کرتے ہیں کہ کلمتہ اللہ ایک بشر تھے (رومیوں ۱: ۳۰؛ ۱۔ تیمتھیس ۲: ۵) (سورہ مائدہ آیت ۷۹ وغیرہ) لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں صحف سماوی کلمتہ اللہ کو بشر ماننے کے باوجود ان سے غیب کا علم منسوب کرتے ہیں حالانکہ دونوں آسمانی کتابوں کے مطابق غیب کا علم صرف علیم وخبیر کو ہی حاصل ہے (متی ۲۴: ۳۶؛ سورۃ جن آیت ۲۶ وغیرہ) دونوں صحائف سماوی کہتے

ہیں کہ نوع انسانی میں سوائے مسیح کے کوئی دوسرا انسان غیب کا علم نہیں رکھتا (سورۃ ہود آیت ۳۳) چنانچہ قرآن میں آیا ہے کہ کلمۃ اللہ لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ''جو کچھ تم لکھا کے آؤ اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں رکھ کر آؤ وہ سب میں تم کو بتلا دیتا ہوں (سورۃ آل عمران آیت ۴۳)۔ انجیل میں بھی آیا ہے کہ ابن اللہ لوگوں کے دلوں کے خیالات تک سے واقف تھے (متی ۹:۴؛ ۱۲:۲۵؛ لوقا ۶:۸؛ ۱۱:۱۷ وغیرہ) آپ کے حواری اور رسول بار بار لکھتے ہیں کہ سب کے دل کے باطنی اور اندرونی پوشیدہ خیالات کو جانتے تھے (یوحنا ۲:۲۴۔۲۵؛ ۱:۴۷؛ ۶:۱۵، متی ۲۶:۲۱ وغیرہ)۔ پس اس لحاظ سے بھی حضرت روح اللہ ایک عدیم النظیر اور یکتا ہستی تھے۔ اگر آپ کو کسی سے نسبت دی جاسکتی ہے تو فقط خدائے واحد لاشریک سے نسبت دی جاسکتی ہے باقی تمام انبیاء دیگر انسانوں کی مانند ہیں ان میں اور دوسرے انسانوں میں فرق صرف یہی ہے کہ ان پر وحی آتی ہے (سورۃ کہف آیت ۱۱۰) لیکن علم غیب کی خصوصیت کسی نبی میں بھی نہیں پائی جاتی۔ آپ کی مختلف خصوصیات کی وجہ سے قرآن میں آپ کو آیہ للعالمین قرار دیا گیا ہے۔ آپ کی ذات پاک کل انبیا کی جامع صفات ہے۔ کسی ایک نبی کو بھی کوئی ایسی صفت خدا کی طرف سے عطا نہیں کی گی۔ جو کلمۃ اللہ میں بوجہ احسن موجود نہیں۔

انجیل شریف سے ظاہر ہے کہ ابن اللہ لوگوں کے دلوں کے خیالات اور بھیدوں تک سے واقف تھے۔ دیگر انبیا اپنے ہم جنسوں کی طرح لوگوں کے خیالات کا اپنے فہم اور ذکادت (ذہن کی تیزی) کی طرف سے قیاس کر سکتے تھے۔ لیکن ابن اللہ انسانوں کے دلوں کے پوشیدہ رازوں تک سے واقف تھے۔ مثلاً ایسے لوگ آپ کے پاس آئے جن کو آپ نے پہلے نہ دیکھا تھا لیکن آپ ان کے خفیہ خیالوں سے واقف تھے (یوحنا ۱:۴۸۔۴۹؛ مرقس ۱۰:۲۱؛ ۹:۳)۔ آپ نے فریسیوں کو ان کے پنہانی خیالات کی وجہ سے ملامت کی (لوقا ۷:۳۹؛ مرقس ۲:۸؛ یوحنا ۸:۸؛ ۱۲:۲۵ وغیرہ)۔

آپ گنہگار لوگوں کے دلوں کے خفیہ رازوں سے واقف تھے (یوحنا ۴:۳۹ وغیرہ) لہٰذا آپ گناہوں کو معاف کرتے وقت ان کو جتلا دیتے تھے کہ وہ توبہ کریں اور اپنے گناہوں سے آئندہ پرہیز کریں (متی ۹:۲؛ یوحنا ۵:۱۴؛ ۸:۸، ۱۱ وغیرہ)۔ آپ اپنے حواریوں کے اندرونی خیالات کو جانتے تھے (مرقس ۹:۳۳؛ یوحنا ۱۱:۶، ۱۱، ۱۴ وغیرہ) آپ کو اپنے مخالفوں کی پنہانی سازشوں اور ارادوں کی واقفیت تھی (مرقس ۲:۸؛ متی ۶:۶۴؛ ۱۲:۲۵؛ یوحنا ۱۳:۲۱ وغیرہ) آپ کے حوارئین، تابعین اور مخالفین تک حیران تھے کہ آپ کو یہ علم کہاں سے آیا (یوحنا ۱:۴۸؛ ۵:۴۲؛ ۱۶:۳۰ وغیرہ)۔ لیکن یہ سب جانتے تھے کہ ''وہ آپ چاہتا تھا کہ انسانی فطرت کیسی ہے اور کہ انسان کے دل میں کیا ہے (یوحنا ۲:۲۵)۔

لیکن سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ گو آپ سب کچھ جانتے تھے اور اس کی حاجت نہ رکھتے تھے کہ کوئی آپ کو کچھ بتلائے (یوحنا ۲:۲۴) تاہم آپ نے اس غیبی علم کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کبھی استعمال نہ فرمایا۔ دیگر انبیاء اور ہادیان دین نے لوگوں سے صورت حالات معلوم کر کے اس علم کو اپنے اقتدار اور حشمت اور جاہ و عزت بڑھانے کے لیے استعمال کیا لیکن ابن اللہ نے غیب کا علم رکھتے ہوئے بھی اپنے علم کو اس قسم کے استعمال سے پرہیز فرمایا بلکہ اس کے برعکس آپ نے اس علم کو صرف خدا کی بادشاہت اور استواری کی خاطر اور بنی نوع انسان کے اخلاق سدھارنے کی خاطر استعمال فرمایا (یوحنا ۴:۳۹؛ لوقا ۵:۱۰ وغیرہ)۔

مسیح کے مشن کی فضیلت

جب ہم دیگر مذاہب عالم کے انبیاء کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے لوگوں کے اخلاق سدھارے اور اپنی اصلاح کے مشن کی ناکامی کو محسوس کر کے اپنی قوم کی طرف سے اکثر مایوس ہو جاتے تھے۔ مثلاً حضرت موسیٰ بار بار بنی اسرائیل کی جانب سے مایوس ہوئے۔ حضرت ایلیاہ بھی مایوس ہوئے (۱۔ سلاطین ۱۹:۴) یرمیاہ نبی کا بھی یہی حال تھا (یرمیاہ ۱۵:۱۰؛ ۲۰:۱۴۔ الخ) یوحنا بپتسمہ دینے والا بھی مایوس ہوا (متی ۱۱:۲)۔ لیکن ابن اللہ کبھی اپنی قوم کی طرف سے مایوس نہ ہوئے اور نہ آپ کے دل میں کبھی اپنے مشن اور رسالت کے متعلق

شکوک پیدا ہوئے۔ مہاتما بدھ کو اپنے مشن کے متعلق شک تھا۔ رسول عربی کے شکوک مسیحی عالم ورقہ بن نوفل نے دور کئے۔ لیکن ابن اللہ کو اپنے مشن اور اس کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ حتیٰ کہ جب حالات کلیتہً (مکمل) ناموافق تھے آپ نے دم واپسیں صلیب پر سے پکار کر اعلان کیا اور فرمایا کہ ''آپ نے سب باتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے'' (یوحنا ۱۹: ۲۸۔ ۳۰؛ ۱۷: ۴) آپ کو اول سے لے کر آخر تک اپنی رسالت اور ابنیت کا احساس اور کامل یقین رہا (یوحنا ۶: ۳۸، ۶۲، ۴۶؛ ۸: ۲۳، ۴۲؛ ۱۴: ۱۲، ۲۸؛ ۱۶: ۱۰ وغیرہ)۔

انبیائے سابقین اور مسیح کے معجزات

ہم نے گذشتہ فصل میں معجزات مسیح کا مجمل طور پر ذکر کر کے بتلایا تھا کہ آپ کا ہر معجزہ ''آیت اللہ'' (سورۃ انبیا آیت ۹۱) اور نشان دیتا تھا اس ذات پاک کا جو زندہ جاوید ہستی ہے اور عالم و عالمیان کے لیے آیتہً للعالمین ہے۔

مسیح کے دعاوی اور اناجیل اربعہ

اگر کوئی شخص ابن اللہ کے اقوال کا سطحی مطالعہ بھی کرے تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں دیگر انبیا لوگوں کو خدا کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں وہاں ابن اللہ لوگوں کو اپنی ذات کی جانب رجوع کرنے کی دعوت دیتا ہے (متی ۱۱: ۲۸؛ ۲۳: ۳۷؛ ۵: ۱۱ وغیرہ)۔ آپ نے علانیہ لوگوں کو فرمایا کہ وہ آپ کی باتوں پر کان لگائیں (متی ۷: ۲۴؛ یوحنا ۱۸: ۲۷ وغیرہ) جہاں دیگر انبیا نے اپنے پیروؤں کو کہا تم خدا پر ایمان لاؤ وہاں آپ نے حکم دیا کہ لوگ آپ کی شخصیت پر ایمان لائیں (یوحنا ۱۴: ۱؛ ۹: ۳۵؛ ۱۴: ۲ وغیرہ)۔ آپ یہ نہیں فرماتے تھے کہ لوگ آپ کی رسالت پر یا معجزات پر یا تعلیم پر ایمان کبھی کسی دوسرے نبی نے طلب نہ کیا۔ آپ نے صاف صاف کہا کہ روز محشر انسان کی قسمت کا فیصلہ اس پر ہو گا کہ آیا وہ آپ کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں یا کہ نہیں (متی ۱۰: ۳۲؛ مرقس ۸: ۳۸ وغیرہ) اور لطف یہ ہے کہ یہ ایمان بعینہ اس قسم کا ہے جو خدا ہم سے طلب کرتا ہے۔

توبدیں جمال وخوبی بر طور گر خرامی
ارنی بگوید آنکس کہ بگفت لن ترانی

ابن اللہ کی عین یہ خواہش ہے کہ بنی نوع انسان آپ کی زیر حفاظت آجائیں (متی ۲۳: ۳۷) کیونکہ صرف آپ ہی ان کے دلوں کی بے قراری اور بے چینی کو دور کر کے اطمینان قلب عطا کرتے ہیں (متی ۱۱: ۲۸؛ یوحنا ۱۴: ۲۷؛ ۲۰: ۱۹؛ لوقا ۲۶: ۳۲ وغیرہ)۔ اگر ہم رفاقت الٰہی چاہتے ہیں تو آپ کی بے چوں وچرا خدمت کریں (مرقس ۱۰: ۴۵؛ یوحنا ۱۳: ۴۔ تا آخر وغیرہ) ابن اللہ ہر انسان کا دل طلب کرتے ہیں جس طرح خدا طلب کرتا ہے اور حکم دیتے ہیں کہ کل بنی نوع انسان آپ کی تابعداری کریں آپ کی رہنمائی میں زندگی بسر کریں اور اپنے آپ کو کلیتہً ابن اللہ کے سپرد کریں (متی ۱۱: ۲۹؛ ۱۰: ۳۸؛ ۱۶: ۲۴؛ یوحنا ۸: ۱۲؛ ۱۲: ۲۶ وغیرہ)۔ کیونکہ صرف آپ ہی نوع انسانی کے اکیلے واحد ہادی اور برحق استاد ہیں (متی ۲۳: ۸۔ تا آخر) ابن اللہ نے حکم دیا کہ تمام قوموں کو آپ کے نام سے بپتسمہ دیا جائے جس کا یہ مطلب ہے کہ اقوام عالم آپ کی مقبوضہ ملکیت ہو جائیں گی اور آیندہ آپ اور صرف آپ ہی ان پر حکمران ہوں گے جن پر ''مخلصی کے دن آپ کے مہر لگی ہے'' (افسیوں ۴: ۳۰) ابن اللہ ہر شخص سے یہ طلب کرتے ہیں کہ وہ آپ کی ذات کے ساتھ اسی قسم کی محبت کرے (یوحنا ۲۱: ۱۵۔ ۱۷؛ ۱۵: ۹ وغیرہ) جو عہد عتیق کی کتب میں خدا کے ساتھ کی جاتی تھی (استثنا ۳۳: ۲۹؛ متی ۱۰: ۳۷۔ تا آخر؛ لوقا ۱۴: ۲۶ وغیرہ)۔

غرض یہ کہ منجی عالمین کے اپنے اقوال کی بناپر مسیحیت میں آپ کی ذات کو مرکزی جگہ دی گئی ہے۔ابن اللہ ہمارے ساتھ ابد تک ہے (متی ۱۸:۲۰؛یوحنا ۱۴:۲۳)آپ کی حشمت وجلال تاابد ہے (مرقس ۱۲:۳۶؛ ۱۴:۶۲)آپ خود ''راہ حق اور زندگی ''ہیں (یوحنا ۱۴:۱۶؛ متی ۱۱:۲۷)آپ زندگی کا وسیلہ ہیں (یوحنا ۱۴:۶)۔آپ نجات کا دروازہ ہیں (یوحنا ۱۰:۹)۔آپ وہ حقیقی روٹی ہیں جو آسمان پر سے اتری جو روح کی بھوک کو دور کر سکتی ہے (یوحنا ۶:۵۱)۔آپ زندگی کا پانی ہیں (یوحنا ۷:۳۷)۔آپ دنیا کے نور ہیں (یوحنا ۸:۱۲)۔کل نوع انسانی آپ میں پیوند ہے۔آپ کا دیگر انسانوں کے ساتھ درخت اور شاخوں کا سا تعلق ہے (یوحنا ۱۵:۴)اور اپنی زندگی اور قدرت کاملہ سے بنی نوع انسان کو نئی مخلوق بناتے ہیں (لوقا ۱۹:۵۔تاآخر)اوران کو نئی زندگی بخشتے ہیں۔

ہست بہ تخت گاہ دل جلوہ قرب روز وشب

لیک بجلوہ چناں چشم خیال کے رسدہ

''ابن آدم کو زمیں پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے ''(متی ۹:۶)آپ نے فرمایا کہ ''آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے ''(متی ۲۸:۱۸)۔''اب سے ابن آدم قادر مطلق خدا کی دہنی طرف بیٹھا رہے گا''(لوقا ۲۲:۶۹)۔ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا (متی ۱۹:۲۸) یہاں وہ ہے جو ہیکل سے بھی بڑا ہے ''(متی ۱۲:۶)۔ابن آدم اپنے فرشتوں کو بھیجے گا (متی ۱۳:۴۱)۔جب ابن آدم اپنے جلال میں آئے گا اور سب فرشتے اس کے ساتھ آئیں گے تو وہ اس وقت اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا''اور عدالت کرے گا (متی ۲۵:۳۱)''میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہے ''(متی ۱۱:۲۷)۔جیسے میرے باپ نے میرے لیے ایک بادشاہت مقرر کی ہے میں بھی تمہارے لیے مقرر کرتا ہوں (لوقا ۲۲:۲۹)''جہاں دو یا تین میرے نام پر اکٹھے ہیں وہاں میں ان کے بیچ میں ہوں ''(متی ۱۸:۲۰)۔''یہ میرا (خدا کا) پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں ''(متی ۱۷:۵)۔''میں خدا کا بیٹا ہوں ''(متی ۱۴:۳۳)آپ نے ایک تمثیل میں اپنے آپ کو ''ابن ''ایسے معنوں میں قرار دیا جن معنوں میں دیگر انسان خدا کے بیٹے نہیں ہو سکتے (یوحنا ۱:۱۲۔۱۴؛۲۰:۱۷؛یوحنا ۵:۱ وغیرہ) جس کا مطلب ہے کہ آپ کو علم تھا کہ آپ کی ابنیت بے نظیر اور لاثانی ہے اور آپ کا پیغام دیگر انبیا سے جدا ہے جن کو آپ نے ''خادموں ''کا درجہ دیا (مرقس ۱۲:۶۔۷)۔

مذکورہ بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ کا یہ مطلب تھا کہ اس ابوت اور ابنیت کے وجود میں صرف خدا اور مسیح واحد طور پر موجود ہیں اور دیگر انسان اس خاص الخاص رشتہ کے باہر ہیں [1]۔کلمۃ اللہ کی ہستی کل بنی نوع انسان سے جداگانہ اور الگ ہے کیونکہ وہ اور خدا دونوں ایک ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ذات کا کامل طور پر علم رکھتے ہیں (یوحنا ۱۰:۲۲؛۱۷:۵؛ متی ۱۱:۲۷)اوران کی زندگی ایک دوسرے سے چھپی نہیں (یوحنا ۱:۱۸)ابن اللہ کے حواری آپ کو ''خداوند'' کہتے ہیں اور جب آپ کے رسول اپنی تقریرات وتحریرات میں عہد عتیق کی کتب کے اقتباسات پیش کرتے ہیں تو وہ خداوند یہواہ کی بجائے آپ کے مبارک وجود کا ذکر کرتے ہیں اور خدا کے خاص نام ''یہواہ کی بجائے نام'' لیتے ہیں۔ابن اللہ نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا''میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اس کو ظاہر کرنا چاہے ''(متی ۱۱:۲۷)۔خدا کے متعلق آپ کا علم الیقین اس درجہ تک یقینی تھا کہ آپ نے یہود کو فرمایا کہ میں خدا کو کامل طور پر جانتا ہوں (یوحنا ۸:۱۹)اور ''اگر میں کہوں کہ اس کو نہیں جانتا تو تمہاری طرح جھوٹا ہوں گا مگر میں اسے جانتا ہوں اور

---

1 ۔ہم نے اس موضوع پر اپنے رسالہ ''ابوت الٰہی کا مفہوم''میں بالتفصیل بحث کی ہے۔یہ رسالہ پنجاب ریلجس بک سوسائٹی سے مل سکتا ہے۔(برکت اللہ)

اس کے کلام پر عمل کرتا ہوں"(یوحنا۸: ۵۵)۔ دیگر انبیاء کہتے تھے کہ خدا ہم سب انسانوں کا خالق اور باپ ہے (ملاکی ۲: ۱۰ وغیرہ) لیکن ابن اللہ کا خدا باپ کے ساتھ لاثانی بے نظیر اور بے عدیل رشتہ ہے۔

پدر نور وپسر نور بست مشہور

ازیں جا فہم کن نور علیٰ نور

آپ نے دیگر انسانوں کو اس رشتہ میں شامل کر کے یہ کبھی نہ فرمایا کہ "ہمارا باپ" بلکہ اس رشتہ میں تمیز کر کے ہمیشہ فرمایا "میرا باپ اور "تمہارا باپ" (متی ۷: ۲۱؛ ۸: ۱۴؛ یوحنا ۲۰: ۱۷ وغیرہ)۔

میرا باپ اب تک کام کرتا ہے اور میں بھی کام کرتا ہوں۔ اس سبب سے یہودی اس کے قتل کی کوشش کرنے لگے کیونکہ وہ خدا کو خاص اپنا باپ کہہ کر اپنے آپ کو خدا کے برابر بناتا تھا (یوحنا ۵: ۱۷) "میں اور باپ ایک ہیں" (یوحنا ۱۰: ۳۰) جو مجھے دیکھتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو دیکھتا ہے۔ میں نور ہو کر آیا ہوں تا کہ جو کوئی مجھ پر ایمان لائے اندھیرے میں نہ رہے" (یوحنا ۱۲: ۴۵) "پیشتر اس سے کہ ابراہیم پیدا ہوا میں ہوں" (یوحنا ۸: ۵۸)۔ اب اے باپ تو اس جلال سے جو میں دنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا مجھے اپنے ساتھ جلالی بنا۔۔۔ تو نے بنائے عالم سے پیشتر مجھ سے محبت رکھی (یوحنا ۱۷: ۵، ۲۴)۔ راہ حق اور زندگی میں ہوں کوئی میرے وسیلے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا (یوحنا ۱۴: ۶)۔ پس اس باہمی تعلق ورفاقت کی بنا پر آپ نے فرمایا زندگی کی روٹی میں ہوں اگر کوئی اس روٹی میں سے کھائے تو ابد تک زندہ رہے گا بلکہ جو روٹی میں جہاں کی زندگی کے لیے دوں گا وہ میرا گوشت ہے" (یوحنا ۶: ۵۱) اگر کوئی پیاسا ہو تو میرے پاس آکر پیئے جو مجھ پر ایمان لائے گا اس کے اندر سے زندگی کے پانی کی ندیاں جاری ہوں گی (یوحنا ۷: ۳۸) دروازہ میں ہوں اگر کوئی مجھ سے داخل ہو تو نجات پائے گا (یوحنا ۱۰: ۹)۔ جس طرح باپ مردوں کو اٹھاتا اور زندہ کرتا ہے اسی طرح بیٹا بھی جن کو چاہتا ہے زندہ کرتا ہے۔۔۔ وہ وقت اب ہے کہ مردے خدا کے بیٹے کی آواز سنیں گے جس طرح باپ اپنے آپ میں زندگی رکھتا ہے اسی طرح اس نے بیٹے کو بھی یہ بخشا کہ اپنے آپ میں زندگی رکھے بلکہ اسے عدالت کرنے کا اختیار بھی بخشا ہے" (یوحنا ۵ باب)۔ پس نوع انسانی کے مستقبل اور قوموں کی قسمت کی باگ دوڑ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ "دنیا کا نور میں ہوں جو میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا" (یوحنا ۸: ۱۲)۔ قیامت اور زندگی میں ہوں جو مجھ پر ایمان لاتا ہے گو وہ مر جائے تو بھی زندہ رہے گا اور جو کوئی زندہ ہے وہ ابد تک کبھی نہ مرے گا (یوحنا ۱۱: ۲۵)۔

خداوند کے کلمات طیبات میں سے مذکورہ بالا چند اقتباسات جو کسی ایک انجیل میں سے نہیں بلکہ ہر چہار اناجیل میں سے لیے گئے ہیں اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ آنخداوند کے خیال مبارک میں آپ کی ذات آپ کے دین کی اساس ہے اور آپ کی شخصیت بے نظیر اور آپ کا پیغام عالمگیر ہے (یوحنا ۱۳: ۲) کسی اور مذہب کے بانی کے وہم وگمان میں بھی نہ آیا کہ اس قسم کے الفاظ اپنی ذات اور پیغام کی نسبت اپنے منہ سے نکالے۔

جب ہم ان اہم ترین دعوؤں کو دیکھتے ہیں اور ان کے اندرونی معانی پر غور کرتے ہیں تو ورطہ (بھُلبلیاں، ایسی سرزمیں جس میں راستہ نہ ہو) حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی محض انسان ضعیف البنیان (کمزور بنیاد) اس قسم کے دعوے کر سکتا ہے اور اگر وہ محض انسان ہے تو کیا اس کے دماغ میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہے؟ اس قسم کے دعوے کوئی محض انسان نہیں کر سکتا اور اگر وہ کرتا ہے تو وہ صحیح الدماغ شخص نہیں ہے۔ پس اس قسم کے دعوے کرنے والا انسان یا صحیح العقل شخص نہیں یا وہ محض انسان نہیں ہے۔ کوئی شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں عقل ہے تو نہیں کہہ سکتا کہ کلمۃ اللہ نعوذ باللہ پاگل تھے۔ پس نتیجہ ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ محض انسان نہ تھے

بلکہ آپ کی ہستی انسانیت کی حدود میں رہ کر بھی انسانیت سے اعلیٰ ارفع اور بلند و بالا تھی اور ذات خداوندی کا مظہر اور الٰہی ذات کا نقش تھی (عبرانیوں ۱:۳؛۲۔ کرنتھیوں ۴:۴ وغیرہ)۔

جنابِ مسیح کے دعوے اور حوارئین کی تحریرات

(۱)

جنابِ مسیح کے دعووں کی بناپر حضرت یوحنا فرماتے ہیں کہ ''ابتدا میں کلمۃ اللہ تھا اور یہی کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا۔ یہی کلمہ ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ اس میں زندگی تھی اور وہ زندگی آدمیوں کا نور تھا۔ جنہوں نے اس کو قبول کیا اس نے ان کو خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا۔۔۔ کلمہ مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جو صرف باپ کے اکلوتے کو ہی شایاں ہو سکتا ہے۔۔۔ اس معموری میں سے ہم سب نے فضل پر فضل پایا۔ شریعت تو موسیٰ کی معرفت دی گئی لیکن فضل اور سچائی مسیح کی معرفت پہنچی۔ خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا'' (یوحنا ۱:۱۔۱۸)۔ اس زندگی کے کلمہ کی بابت جو ابتدا سے تھا اور جس کو ہم نے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا اور اپنے ہاتھوں سے چھوا۔ اسی ہمیشہ کی زندگی کی نسبت تم کو خبر دیتے ہیں جو باپ کے ساتھ تھی تاکہ تم بھی ہمارے شریک ہو اور ہماری شراکت باپ کے ساتھ اور اس کے بیٹے مسیح کے ساتھ ہے (۱۔یوحنا ۱:۱) ''خداوند خدا جو ہے اور جو تھا اور جو آنے والا ہے یعنی قادر مطلق فرماتا ہے کہ میں ہی ہوں'' (مکاشفہ ۱:۸) ''ذبح کیا ہوا برہ ہی قدرت اور دولت اور حکمت اور طاقت اور عزت اور تمجید کے لائق ہے۔ جو تخت پر بیٹھا ہے اس کی اور برے کی حمد اور عزت اور تمجید اور سلطنت ابدالآباد رہے'' (مکاشفہ ۵:۱۳) ''برہ خداوندوں کا خداوند اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے'' (مکاشفہ ۱۷:۱۴) ''خدا کے روح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو روح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وہ روح خدا کی طرف سے ہے اور جو کوئی روح یسوع کا اقرار نہ کرے وہ خدا کی طرف سے نہیں اور یہی دجال (مخالفِ مسیح) کی روح ہے (۱۔یوحنا ۴:۲) اگر کوئی گناہ کرے تو باپ کے پاس ہمارا ایک شفیع موجود ہے یعنی یسوع مسیح جو نہ صرف ہمارے ہی گناہوں کا کفارہ ہے بلکہ تمام دنیا کے گناہوں کا بھی کفارہ ہے (۱۔یوحنا ۲:۲) مسیح اس لئے ظاہر ہوا کہ گناہوں کو اٹھالے جائے اور اس کی ذات میں کوئی گناہ نہیں۔ جو کوئی اس میں قائم رہتا ہے وہ کوئی گناہ نہیں کرتا'' (۱۔یوحنا ۳:۵) ''خدا نے ہم کو ہمیشہ کی زندگی بخشی ہے اور یہ زندگی اس کے بیٹے میں ہے۔ جس کے پاس بیٹا ہے اس کے پاس زندگی ہے اور جس کے پاس بیٹا نہیں اس کے پاس زندگی بھی نہیں (۱۔یوحنا ۵:۱۲)۔

(۲)

یہی خیالات ہم کو باقی دوازدہ رسل (رسول کی جمع) کی تقریرات اور تحریرات میں ملتے ہیں۔ مثلاً ''خدا کے اور جنابِ مسیح کے عبد یعقوب کی طرف سے ۔۔۔ ہمارے خداوند ذوالجلال یسوع مسیح کا دین'' (یعقوب ۱:۱؛۲: ۱) ''ہمارے خدا اور منجی یسوع مسیح کی ابدی بادشاہت'' روح القدس میں دعا مانگ کے ۔۔۔ خدا کی محبت میں قائم اور ہمیشہ کی زندگی کے لئے جنابِ مسیح کی رحمت کے منتظر رہو'' (خط یہوداہ)۔ اسی طرح جنابِ مسیح کو خدا نے مالک اور منجی ٹھہرا کر اپنے دہنے ہاتھ سے سربلند کیا تاکہ اسرائیل کو توبہ کی توفیق اور گناہوں کی معافی بخشے'' (اعمال ۵:۳۱) اس نے خدا کا جلال اور مسیح کو خدا کی دہنی طرف کھڑا دیکھا'' (اعمال ۷:۵۵)۔ ''ہمارے خدا اور منجی خداوند مسیح کی راستبازی'' (۲۔پطرس ۱:۱) ''بیٹا خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش ہو کر سب چیزوں کو اپنی قدرت کے کلام سے سنبھالتا ہے وہ گناہوں کو دھو کر عالم بالا پر کبریا کی دہنی طرف جا بیٹھا۔۔۔ بیٹے کی بابت کہتا ہے کہ اے خدا تیرا تخت ابدالآباد رہے گا اور تیری بادشاہت کا عصا راستی کا عصا

ہے۔اے خداوند تو نے ابتدا میں زمین کی نیو ڈالی اور آسمان تیرے ہاتھ کی کاریگری ہیں۔ وہ نیست ہو جائیں گے پر تو باقی رہے گا"(عبرانیوں پہلا باب)۔ "بیٹے نے موت کے وسیلے سے اس کو جسے موت پر قدرت حاصل تھی یعنی ابلیس کو تباہ کر دیا اور جو عمر بھر موت کے ڈر سے غلامی میں گرفتار رہے ان کو چھڑا لیا۔۔۔اس نے آزمائش کی حالت میں دکھ اٹھایا۔ پس وہ ان کی بھی مدد کر سکتا ہے جن کی آزمائش ہوتی ہے"(عبرانیوں ۲:۱۴۔۱۵)۔ "ہر ایک اپنے گناہوں کی معافی کے لئے خداوند مسیح کے نام پر بپتسمہ لے"(عبرانیوں ۲:۲۸)اس "زندگی کے مالک" کے نام سے معجزات وقوع میں آتے تھے "مسیح کے سوا کسی دوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں کیونکہ آسمان کے نیچے آدمیوں کو کوئی دوسرا نام نہیں بخشا گیا جس کے وسیلے سے ہم نجات پا سکیں"(اعمال ۴:۱۲)۔ "یسوع کامل بن کر اپنے سب فرمانبرداروں کے لئے ابدی نجات کا باعث ہوا"(عبرانیوں ۵:۹)۔ جو اس (یسوع) کے وسیلے سے نجات پاتے ہیں وہ ان کو پوری اور کامل نجات دے سکتا ہے کیونکہ وہ ان کی شفاعت کے لئے ہمیشہ زندہ ہے"(عبرانیوں ۷:۲۵)۔

(۳)

حضرت پولوس کی تقریریں اور تحریریں انہی خیالات کا عکس ہیں جو ہم کو منجی عالمین کے کلمات طیبات اور آپ کے دوازدہ (۱۲) رسولوں کے کلام میں ملتے ہیں جن کا ذکر مشتے نمونہ از خروارے (ڈھیر میں سے مُٹھی بھر، تھوڑے سے نمونے سے کل چیز کی اصلیت معلوم ہو جاتی ہے۔) سطورِ بالا میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ رسول مقبول فرماتا ہے "ہمارے نزدیک تو ایک ہی خدا ہے یعنی باپ اور ایک ہی خداوند ہے یعنی یسوع مسیح جس کے وسیلے سے ساری چیزیں موجود ہوئیں اور ہم بھی اسی کے وسیلے سے ہیں"(۱۔کرنتھیوں ۸:۶)۔ "مسیح یسوع وہ ہے جو مر گیا بلکہ مردوں میں سے جی اٹھا اور خدا کی دہنی طرف ہے اور ہماری شفاعت بھی کرتا ہے"(رومیوں ۸:۳۴)۔ "مسیح یسوع اگرچہ خدا کی صورت پر تھا تاہم اس نے خدا کے برابر ہونے کو غنیمت نہ سمجھا بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی اور انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ خدا نے بھی اسے بہت سربلند کیا اور اسے وہ نام بخشا جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے تاکہ یسوع کے نام پر ہر ایک گھٹنا جھکے خواہ آسمانیوں کا ہو خواہ زمینیوں کا خواہ ان کا جو زمین کے نیچے ہیں اور خدا باپ کے جلال کے لئے ہر ایک زبان اقرار کرے کہ یسوع مسیح خداوند ہے"(فلپیوں ۲:۶۔۱۱)۔ "بیٹے میں ہم کو گناہوں کی معافی حاصل ہے۔ وہ اندیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے موجود ہے کیونکہ اسی میں ساری چیزیں پیدا کی گئیں آسمان کی ہوں یا زمین کی، دیکھی ہوں یا اندیکھی، تخت ہوں یا ریاستیں، حکومتیں یا اختیارات ساری چیزیں اسی کے وسیلے اور اسی کے واسطے پیدا ہوئی ہیں۔ وہ سب چیزوں سے پہلے ہے اور اسی میں سب چیزیں قائم رہتی ہیں۔ وہی مبدا ہے۔ اور باپ کو پسند آیا کہ ساری معموری اسی میں سکونت کرے"(کلسیوں ۱:۱۴) "خداوند مسیح کے وسیلے سے ایمان کے سبب اس فضل تک ہماری رسائی بھی ہوئی جس پر قائم ہیں اور خدا کے جلال کی امید پر فخر کریں"(رومیوں ۲:۵)۔ گناہ کی مزدوری موت ہے مگر خدا کی نعمت اور بخشش ہمارے خداوند مسیح میں ہمیشہ کی زندگی ہے"(رومیوں ۶:۲۳)۔ "تم خداوند مسیح کے نام سے ہمارے خدا کی روح سے دھل گئے اور پاک ہوئے اور راستبازی بھی ٹھہرے"(۱۔کرنتھیوں ۶:۱۱)۔ "خدا کا شکر ہے جو ہمارے خداوند مسیح کے وسیلے سے ہم کو گناہ اور موت پر فتح بخشتا ہے"(۱۔کرنتھیوں ۱۵:۵۷)۔ "مسیح میں سب چیزوں کا مجموعہ ہو جائے خواہ وہ آسمان کی ہوں۔ خواہ زمین کی، تمہارے دل کی آنکھیں روشن ہو جائیں تاکہ تم کو معلوم ہو کہ ایمان لانے والوں کے لئے اس کی قدرت کیا ہی بے حد ہے۔ اس کی بڑی قوت کی تاثیر کے موافق جو اس نے مسیح میں کی"۔ "خدا نے اپنے رحم کی دولت سے اس بڑی محبت کے سبب جو اس نے ہم سے کی جب ہم قصوروں کے سبب مردہ ہی تھے تو ہم مسیح کے ساتھ زندہ کیا۔ تم کو فضل ہی سے نجات ملی ہے مسیح نے تم کو جو دور تھے اور ان کو جو نزدیک تھے دونوں کو صلح کی خوشخبری دی کیونکہ اس ہی کے وسیلے سے ہم دونوں کی ایک ہی روح میں باپ کے پاس رسائی ہوتی ہے۔ پس اب تم پردیسی اور

مسافر نہیں رہے بلکہ مقدسوں کے ہم وطن اور خدا کے گھرانے کے ہو گئے"(افسیوں ۲:۱۹)"یہ بات حق اور قبول کرنے کے لائق ہے کہ مسیح گناہ گاروں کے بچانے کے لئے اس دنیا میں آیا"(۱۔ تیمتھیس ۱:۱۵)۔"اس نیو کے سوا جو پڑی ہوئی ہے اور وہ خداوند مسیح ہے کوئی شخص دوسری نیو نہیں رکھ سکتا"(۱۔کرنتھیوں ۳:۱۱)"اگر کوئی مسیح میں ہے تو وہ نیا مخلوق ہے پرانی چیزیں جاتی رہیں دیکھو وہ نئی ہو گئیں اور خدا نے مسیح کے وسیلے اپنے ساتھ دنیا کا میل میلاپ کر لیا اور ان کی تقصیروں کو ان کے ذمہ نہ لگایا"(۲۔کرنتھیوں ۵:۱۸)۔"میں مسیح کے ساتھ مصلوب ہوا ہوں اور اب میں زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے اور میں جو اب جسم کی زندگی گزارتا ہوں تو خدا کے بیٹے پر ایمان لانے سے گذارتا ہوں"(گلتیوں ۲:۲۰)"مسیح جو جلال کی امید ہے تم میں رہتا ہے"(کلسیوں ۱:۲۷)"الوہیت کی ساری معموری مسیح میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے اور تم اسی میں معمور ہو گئے ہو جو ساری حکومت اور اختیار کا سر ہے"(کلسیوں ۲:۹)۔"تمہاری زندگی مسیح کے ساتھ چھپی ہوئی ہے جب مسیح جو ہماری زندگی ہے ظاہر کیا جائے گا تو تم بھی اس کے ساتھ جلال میں ظاہر کئے جاؤ گے۔۔۔ مسیح سب کچھ اور سب میں ہے"(کلسیوں ۳:۳)۔"جس پر میں نے بھروسہ رکھا ہے میں اس کو جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری امانت کی اس دن تک حفاظت کر سکتا ہے"(۲۔ تیمتھیس ۱:۱۲)۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے علاوہ بیسیوں آیات ایسی ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ پولوس رسول کے خیال میں جنابِ مسیح کی شخصیت لاثانی ،بے عدیل، عالم گیر اور جامع شخصیت ہے۔ جنابِ مسیح کائنات کا مرکز، ابن اللہ اور خدا ہے جو ہماری خاطر انسان بنا تاکہ ہمارا ملاپ خدا کے ساتھ ہو جائے۔ آپ کی ذات پاک آپ کی پیدائش دنیا جہاں سے نرالی، آپ کا پیغام سب سے اعلیٰ ہے۔ روحانیت کے مدارج و منازل میں آپ کو وہ درجہ حاصل ہے جو کسی دوسرے انسان ضعیف البیان (کمزور بنیاد) کو حاصل نہ ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے۔ آپ آدم ثانی اور نئی انسانیت کے بانی ہیں۔ آپ کی موت اور ظفریاب قیامت نے بنی نوع انسان کو زندہ کر دیا۔ آپ کا جلال الوہیت کا عکس اور انسانیت کا کمال اور آپ کی معموری ہر طرح سے سب کو معمور کر دینے والی ہے اور الٰہی ارادہ کے مطابق اس کائنات کا"انتظام ایسا ہوا کہ" مسیح میں سب چیزوں کا مجموعہ ہو جائے۔ خواہ وہ آسمان کی ہوں خواہ زمین کی"اور آپ کو"وہ نام بخشا گیا جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے تاکہ آپ کے نام پر ہر گھٹنا ٹکے اور ہر ایک زبان اقرار کرے کہ یسوع مسیح خداوند ہے"(اعمال ۴:۱۲)۔

(۴)

سطور بالا سے ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ انجیل جلیل کی تمام کتب کی یہ متفقہ شہادت ہے (جس کے خلاف تمام انجیل میں کوئی صدا نہیں اٹھتی) کہ جنابِ مسیح کی شخصیت ایک جامع، بے نظیر اور عالم گیر ہستی ہے۔ آپ کے دوازدہ رسولوں کی شہادت نہایت اہم ہے کیونکہ وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے مولا کی بابت لکھتے ہیں"زندگی کا کلام تھا۔ جس کو ہم نے سنا اور اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا اور اپنے ہاتھوں سے چھوا۔ جو کچھ ہم نے دیکھا اور سنا ہے تم کو بھی اس کی خبر دیتے ہیں تاکہ تم بھی ہمارے شریک ہو"(۱۔یوحنا ۱:۱)۔ یہ ان لوگوں کی گواہی ہے جنہوں نے"شروع ہی سے"(لوقا ۱:۲)"آپ اقوال و افعال، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، مذاق طبعیت، طرز زندگی، انداز گفتگو، طریق معاشرت ، کھانا پینا، سونا جاگنا، ہنسنا بولنا وغیرہ دیکھا تھا جو آپ کی آزمائش میں برابر آپ کے ساتھ رہے"(لوقا ۲۲:۲۸)"جب ایسے لوگ آپ کی نسبت ہم آواز ہو کر کہیں کہ"جس نے آپ کو دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔ کہ آپ کی شخصیت کو انسانوں کے درمیان وہ درجہ حاصل ہے جو لاثانی ہے اور ایسا اعلیٰ اور ارفع ہے کہ کوئی خاکی انسان وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تو ہم کو سرِ تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔

جنابِ عیسیٰ مسیح نوع انسانی کے درمیانی ہیں

مسیحیت کا یہ عقیدہ ہے کہ ابن اللہ خدا اور نوع انسانی کے بیچ میں ایک درمیانی ہے۔ چنانچہ مقدس پولوس فرماتے ہیں کہ "خدا ایک ہے اور خدا اور بنی نوع انسان کے بیچ میں درمیانی بھی ایک ہی ہے یعنی خداوند مسیح جو انسان ہے"(۱۔ تیمتھیس ۲: ۵؛ رومیوں ۱: ۸؛ ۶: ۲۳؛ ۸: ۳۴؛ ۱۔ کرنتھیوں ۶: ۱۱؛ ۱۵: ۵۷؛ افسیوں ۲: ۱۳۔ ۱۸؛ ۳: ۱۲؛ ۵: ۲۰؛ کلسیوں ۳: ۱۷ وغیرہ)۔

(۱)

لفظ "درمیانی" ایک ذو معنی (دو معنوں والا، وہ بات جس میں کئی معنی نکلتے ہیں) لفظ ہے اور مختلف مذاہب اور خیالات کے اشخاص اس کا مطلب مختلف طور پر سمجھتے ہیں۔

اگر اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ایک ایسی بلند و بالا اور برتر ہستی ہے جس تک انسان کی رسائی ناممکن ہے پس خدا اور انسان کے درمیان ایک "درمیانی" کے وجود کا ہونا لازم ہے تو مسیحیت اس معنی میں "درمیانی" کی ہرگز قائل نہیں۔ کیونکہ اس مفہوم کے مطابق خدا اور انسان کے درمیان ایک ایسی وسیع خلیج حائل ہے جس کو عبور کرنا ایک ناممکن امر ہے۔ مسیحیت نے ابتدا ہی سے اس قسم کے خیالات کو بدعت قرار دے کر مردود ٹھہرایا۔

جو لوگ مثلاً مسلمان اس قسم کے خیالات کے پابند ہیں وہ اپنے اپنے خیال کے مطابق خدا کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خدا ایک مطلق العنان بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے اور جس طرح ایک دنیاوی شہنشاہ کے دربار میں کسی غریب کی رسائی بجز کسی درمیانی کے نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح خدائے بلند و برتر کا مقام ایسا رفیع اور عالی ہے کہ اس کے حضور تک کسی محض انسان کی رسائی بغیر کسی درمیانی کے نہیں ہو سکتی لیکن مسیحیت خدا کے ایسے تصور کے کلتیۂ خلاف ہے۔ اس کا مقولہ بالفاظِ حافظ شیرازی یہ ہے۔

ہر کہ خواہد گو بیا وہر کہ خواہد گو برو

گیر دوار وحاجب ودرباں دریں درگا ونیست

مسیحیت کا بنیادی اصول جس پر اس کے تمام معتقدات کا انحصار ہے یہ ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے (متی ۵: ۴۵)۔ جس کی ذات محبت ہے (۱۔ یوحنا ۴: ۸) پس خدا کی ذات میں اور انسان کی ذات میں کوئی خلیج حائل نہیں ہو سکتی اور نہ ان میں کسی قسم کی مغائرت (اجنبیت) ہے۔ کتاب مقدس کا ابتدائی سبق یہ ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا(پیدائش ۱: ۲۷) اور اس کا انتہائی سبق یہ ہے کہ "خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی"(یوحنا ۳: ۱۶) کہ قوت متخیلہ اس الٰہی محبت کی لمبائی اور چوڑائی، اونچائی اور گہرائی کا تصور باندھنے سے عاجز ہے (افسیوں ۳: ۱۸)۔ ایسی تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان اجنبیت اور مغائرت کی بجائے محبت کا رشتہ تعلق اور رفاقت ہو سکتا ہے (۱۔ یوحنا ۴ باب) اس اصول کی روشنی میں یہ ظاہر ہے کہ مسیحیت کسی ایسے درمیانی کی قائل نہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ دو کلیتہً مختلف اور متضاد ہستیوں کو یکجا کرنے کا وسیلہ بنے (گلتیوں ۳: ۱۹؛ رومیوں ۳: ۲۴؛ ۵: ۸)۔

(۲)

لیکن اگر لفظ ''درمیانی'' کا مطلب ''وسیلہ'' ہو تو مسیحیت صرف مکاشفہ کے مطلب میں قائل ہے۔ میں اپنے مطلب کو ایک عام فہم مثال سے سمجھاتا ہوں۔ ناظرین کتاب کو میرے خیالات کا جو میرے ذہن میں ہیں کس طرح پتہ چل سکتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ میں خاموش رہوں تو وہ میرے خیالات سے واقف نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ شیخ سعدی شیرازی کہہ گئے ہیں۔

چو مرد سخن نگفتہ باشد

عیب وہنر ش نہفتہ باشد

پس الفاظ ہی ایک واحد وسیلہ ہے جن کے ذریعہ میرے خیالات کا اظہار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمارے پوشیدہ جذبات کا اظہار صرف ہمارے افعال کے وسیلے سے ہو سکتا ہے۔ اگر ہم حرکات پر کامل طور پر ضبط رکھ سکیں اور اپنے چہرے کی جنبش، لبوں کی حرکت اور اپنے جسم کو اپنے قابو میں رکھ سکیں۔ تو کوئی شخص ہمارے دل کے اندرونی جذبات سے واقف نہیں ہو سکتا۔ پس ہماری نشست و برخاست حرکات و سکنات ہماری رفتار و گفتار ہمارے الفاظ و کلمات ہمارے اعمال و کردار ہی ایک اکیلا وسیلہ ہیں جن کے ذریعہ ہمارے خیالات واحساسات اور جذبات کا غرضیکہ ہمارے اندرونی دنیا کا اظہار بیرونی دنیا کے چلنے پھرنے والوں پر ہو سکتا ہے۔ ہمارے الفاظ اور افعال ایک ''درمیانی'' کا فرض انجام دیتے ہیں۔ جو ہمارے اندرونی خیالات جذبات کی دنیا کو بیرونی دنیا پر ظاہر کر دیتے ہیں۔

بعینہ ان معنوں میں مسیحیت یہ مانتی ہے کہ جنابِ مسیح ایک واحد وسیلہ ہیں جن کے ذریعہ ہم خدا کے خیالات جذبات اور اس کی ذات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ جس طرح کلام کے ذریعہ ہم کسی شخص کے دل کے خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں اسی طرح ہم جنابِ مسیح کے وسیلے خدا کے دل کے خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے (یوحنا ۱: ۱؛ مکاشفہ ۱۹: ۱۳)۔ جس طرح ہمارے افعال ہماری ذات کو ظاہر کرتے ہیں اسی طرح خداوند مسیح کے افعال خدا کی ذات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو خدا کا مظہر کہا گیا ہے (عبرانیوں ۱: ۳)۔ جس طرح الفاظ اور کلام کے بغیر ہم کسی انسان کے خیالات سے واقف نہیں ہو سکتے اسی طرح مسیح کلمۃ اللہ کے بغیر ہم خدا کے خیالات سے بھی واقف نہیں ہو سکتے۔ جس طرح انسان کے افعال کے بغیر ہم اس کی مرضی کو نہیں جان سکتے اسی طرح مسیح مظہر اللہ کے بغیر ہم خدا کی مرضی کو بھی نہیں جان سکتے۔ مسیحیت کہتی ہے کہ اے لوگو کیا تم خدا کی ذات وصفات اور اس کی محبت سے واقف ہونا چاہتے ہو؟ جنابِ مسیح کے اقوال وافعال آپ کے احساسات وجذبات آپ کی نشست و برخاست آپ کی رفتار و گفتار غرض یہ کہ آپ کی ایک ایک ادا کو دیکھ لو تو تم نے خدا کی ذات وصفات کو دیکھ لیا۔ خداوند مسیح کی ذات ایک آئینہ ہے جس میں ہم کو خدا کی ذات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ ''خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش ہے'' (عبرانیوں ۱: ۳) خدا کو کسی نہ نہیں دیکھا''۔ کیونکہ ظاہری آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں لیکن اگر کوئی انسان خدا کو دیکھنے کا خواہش مند ہے تو وہ مسیح کلمۃ اللہ کو دیکھ سکتا ہے (یوحنا ۱: ۱۸؛ ۱۴: ۹)۔ کیونکہ خداوند مسیح میں انسانیت کا کمال ظہور پذیر ہوا اور الوہیت کی ساری معموری اس انسانِ کامل میں ہم کو نظر آتی ہے (کلسیوں ۲: ۹)۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردہ سے باہر میں

ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

(میر)

الوہیت کی صفات کو ہم کامل انسانیت اور صرف کامل انسانیت کے ذریعہ ہی جان سکتے ہیں(۱۔ تیمتھیس ۲:۵)سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کامل انسان نہ ہوتا تو ہم خدا کو بھی نہ جان سکتے۔ پس مسیحیت ایک اور صرف ایک واحد وسیلہ یعنی خداوند مسیح کی قائل ہے۔ جس کے وسیلہ بنی نوع انسان خدا کو جان سکتے ہیں(اعمال ۴:۱۲)۔

(۳)

پس اگر کوئی یہ سوال کرے کہ خداوند مسیح نے خدا کو کس طرح ظاہر کیا ہے ؟تو مسیحیت اس کا یہ جواب دیتی ہے کہ جنابِ مسیح نے اپنی تعلیم، زندگی اور موت اور قیامت کے ذریعہ خدا کی ذات اور ابوت کو اس کی محبت اور اس محبت کے ایثار کو بنی نوع انسان پر ظاہر کیا ہے۔

اول۔ جنابِ مسیح کی تعلیم نے لاثانی طور پر ہم کو خدا کا عرفان اور علم بخشا ہے۔ یہ تعلیم صرف چند ہزار الفاظ پر مشتمل ہے جو معمولی پڑھا لکھا شخص دو تین گھنٹوں کے اندر بخوبی پڑھ سکتا ہے۔ لیکن ان چند ہزار الفاظ نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے اور دو ہزار سال سے مشرق و مغرب کے صدہا ممالک کی ہزارہا اقوام کے لاکھوں کروڑوں انسان خدا کی محبت کو جان گئے ہیں۔

دوم۔ خداوند مسیح نے نہ صرف اپنی تعلیم سے خدا کو ہم پر ظاہر کیا ہے بلکہ آپ نے اپنی تعلیم پر عمل کر کے بے عدیل زندگی اور ایثار سے خدا کی محبت کو بنی نوع انسان پر ظاہر کیا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بات کے لئے وقف کر دیا تھا کہ گناہ گاروں کو نہ صرف پند و نصیحت کی جائے بلکہ ان کی تلاش کی جائے (لوقا ۱۹:۱۰)۔ جس طرح خدا گناہ گاروں کی تلاش کرتا ہے (لوقا ۱۵:۴)۔ ان کے مذہبی پیشوا ان کو ان کے پیشہ اور افعال کے وجہ سے اچھوت گردانتے تھے(لوقا ۱۵:۲) اور خداوند مسیح کو ازروئے طعنہ کہتے تھے کہ وہ "گناہ گاروں کا یار" ہے(متی ۱۱:۱۹) لیکن دشمنوں کا یہ طعنہ در حقیقت جنابِ مسیح کا بہترین خطاب ہے کیونکہ خدا گناہ گاروں سے محبت رکھتا ہے(یوحنا ۳:۱۶)اور آپ کی زندگی خدا کے دل کے جذبات کی بہترین ترجمان تھی۔ پس آپ نے اپنی زندگی کو گناہ گاروں پر خدا کی ازلی محبت کے ظاہر کرنے کی خاطر وقف کر دیا۔

ہے خدا نورِ محبت مظہر اس کا ہے مسیح
ہم کو حق نے اپنی صورت اور دکھلائی نہیں

(واعظ)

جنابِ مسیح کی زندگی کے واقعات پر غور کرو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی زندگی کے تمام کے تمام واقعات خدا کی محبت اور اس کے رحم اور ترس کا اظہار ہیں۔ اگر جنابِ مسیح کو راہ میں کوڑھی مل گئے تو اہل یہود کے مذہبی پیشواؤں کی طرح ان اچھوت قرار دے کر آپ نے ان سے کنارہ کشی نہ کی بلکہ ان کو چھو کر شفا بخشی (مرقس ۱:۴۰)۔ اگر کوئی مفلوج، اندھے، گونگے، بہرے، اپاہج، دیوانے بیمار لاچار گناہ گار مل گئے تو آپ نے خدا کی محبت کو ان پر ظاہر کیا اور ان کو شفا بخشی (مرقس ۱:۳۴؛ متی ۱۲:۱۵؛۱۱:۵۴) آپ کمزوروں کے حامی، بیکسوں کے ہمدرد لاچاروں کے مددگار گناہ گاروں کے یار غمزدوں کے غمخوار۔ مصیبت زدوں کے غم گسار (ہمدرد) تھے۔ غرض یہ کہ آپ الٰہی محبت کا مجسمہ تھے اور ہر درجے اور ہر حالت کے انسانوں پر ہر وقت خدا کی لازوال محبت کو ظاہر کرنے کا وسیلہ تھے (مرقس ۱:۲۸)۔

سوم۔ جنابِ مسیح نے نہ صرف اپنی لاثانی تعلیم اور بے عدیل زندگی کے ذریعہ خدا کی محبت کو ظاہر کرنے کا وسیلہ بنے بلکہ آپ نے اپنی بے نظیر موت سے خدا کی محبت کو بنی نوع انسان پر ظاہر کر دیا۔ آپ کی زندگی خدمت، ایثار اور قربانی کی زندگی تھی۔ آپ نے اس حقیقت کو (جو آپ کی تعلیم کا لب لباب ہے) اپنی زندگی سے ظاہر کر دیا کہ دوسروں کی خاطر دکھ اٹھانا در حقیقت محبت کا بہترین اظہار ہے (متی ۲۰:۲۸) آپ نے دنیا کو

اس حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ قربانی اور محبت ایک ہی شئے کہ دو مختلف پہلو ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے وہ اس کی خاطر ہر طرح کی اذیت اور دکھ جھیلنے کو تیار ہوتا ہے (یوحنا ۱۵: ۱۳) جس طرح ماں اپنے بچے کی خاطر یا ایک صادق محبِ وطن اپنے وطن کی خاطر محبت کی وجہ سے دکھ اٹھاتا ہے اور اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ ابن اللہ کی صلیبی موت خدا کی محبت کا بہترین مکاشفہ ہے کیونکہ اس موت نے دنیا پر اس حقیقت کو اعلیٰ ترین طریقہ پر ظاہر کر دیا ہے کہ محبت کا تاج اپنی جان کی قربانی اور ایثارِ نفس ہے (افسیوں ۵: ۲؛ ۵: ۲۵)۔ پس کوہِ کلوری پر خداوند مسیح کی صلیبی موت کے وسیلے ہم انسانی محبت کے کمال اور الٰہی محبت کی تڑپ اور ایثار کی جھلک کا نظارہ دیکھ سکتے ہیں۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ قربانی اور ایثار کا ایک مقصد ضرور ہوتا ہے۔ قربانی اور ایثار کے ذریعہ ہم اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو محبت کی علت غائی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک صادق محب وطن بے عزتی، اذیت، تشدد، قید وغیرہ کی برداشت کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی قربانی کے وسیلے اس کا وطن غیروں کی غلامی سے نجات اور مخلصی پائے اور آزادی حاصل کر کے ایک نئی زندگی کا دور شروع کرے۔ اسی طرح خداوند مسیح کی قربانی اور ایثار اور صلیبی موت کی اذیت کا مقصد یہ ہے کہ اس قربانی کے وسیلے نوع انسانی شیطان اور گناہ کی غلامی سے نجات اور مخلصی پائے اور آزادی حاصل کر کے ایک نئی زندگی کا دور شروع کرے۔ میں اس نکتہ کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں (لوقا ۱۵ باب) کی تمثیل سے ظاہر ہے۔ کہ اگر کسی نیک ماں یا صالح باپ کا بیٹا بُری صحبتوں میں پڑ جائے اور اپنی زندگی اور دولت شراب خواری، بدچلنی اور عیاشی میں ضائع کر دے تو جتنی زیادہ محبت ماں باپ اپنے بیٹے سے کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ دکھ اور صدمہ ان کے دلوں کو ہوگا۔ اسی طرح خدا باپ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اس کو بے حد دکھ اور صدمہ ان کے دلوں کو ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا باپ ہم سے لامحدود محبت رکھتا ہے اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اس کو بے حد دکھ اور رنج و صدمہ ہوتا ہے۔ جس طرح ماں کی مامتا چاہتی ہے اس کا بدچلن بیٹا تائب ہو کر نئی زندگی بسر کرے۔ اسی طرح خدا کی محبت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ گناہ گار انسان تائب ہو کر نئی زندگی بسر کرے۔ جس طرح بیٹا یہ محسوس کر کے کہ اس کی بدچلنی کی وجہ سے باپ کے محبت بھرے دل کو صدمہ پہنچا ہے۔ اپنی بدی سے پشیمان ہو کر باپ کے پاس واپس آتا ہے اسی طرح گناہ گار یہ محسوس کرتا ہے کہ انسان کے تکبر، خود غرضی، دشمنی، عناد اور گناہ نے مسیح کو مصلوب کیا تھا اور وہ خود اپنے اندر بعینہ وہی گناہ دیکھتا ہے جن کی وجہ سے مسیح مصلوب کیا گیا۔ پس وہ جنابِ مسیح کی قربانی اور اذیت کو دیکھ کر اپنی بدی سے پشیمان ہو کر کہتا ہے کہ ''میں اٹھ کر اپنے باپ کے پاس جاؤں گا اور اس کو کہوں گا کہ اے باپ میں نے تیری نظر میں گناہ کیا ہے اور اب اس لائق نہیں رہا کہ تیرا بیٹا کہلاؤں'' (لوقا ۱۵: ۱۸)۔ جس طرح باپ اپنی محبت کی وجہ سے اپنے تائب بیٹے کو قبول کر کے شادمان ہوتا ہے اسی طرح ''ایک توبہ کرنے والے گناہ گار کی بابت آسمان پر خوشی ہوتی'' (لوقا ۱۵: ۷)۔ جس طرح باپ کے تعلقات اپنے تائب بیٹے سے از سر نو ایسے ہو جاتے ہیں کہ وہ اس کی گزشتہ بدچلنی کو دل سے مٹا دیتا ہے اور اپنے سرمایہ کی دولت سے اس کو پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتا ہے اسی طرح خدا باپ کے تعلقات تائب انسان سے از سر نو ایسے ہو جاتے ہیں کہ خدا اس کی گناہ گاری کو مٹا دیتا ہے (رومیوں ۳: ۲۵) اور اپنے بے قیاس فضل کی دولت سے اس کو قابل کر دیتا ہے کہ وہ روحانی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور نئی زندگی بسر کر سکے (رومیوں ۵: ۲۰۔۲۱) غرض یہ کہ جس طرح ماں یا باپ کے دل کا دکھ بیٹے کی بحالی کا وسیلہ ہوتا ہے اسی طرح خداوند مسیح کی ایثار بھری زندگی اور صلیبی موت گناہ گار انسان کی بحالی کا وسیلہ ہو جاتی ہے (۲۔کرنتھیوں ۵: ۱۸؛ عبرانیوں ۹: ۱۴)۔

چہارم۔ نہ صرف خداوند مسیح کی بے نظیر تعلیم، لاثانی زندگی اور صلیبی موت خدا کی محبت کے اظہار کا وسیلہ ہیں بلکہ آپ کی ظفریاب قیامت بھی خدا کی ذات کو ہم پر ظاہر کرتی ہے۔ انسانی تکبر، خود غرضی، دشمنی اور گناہ نے جنابِ مسیح کو مصلوب کروایا تھا۔ لیکن آپ کی ظفر مند قیامت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بدی کی طاقتیں نیکی کو کبھی مغلوب نہیں کر سکتیں۔ کہ نیکی بالآخر تمام رکاوٹوں اور شیطانی قوتوں پر غالب ہو کر

رہے گی۔ گناہ کا غلبہ اور بدی کا تسلط عارضی اور چند روزہ ہے۔ خواہ یہ تسلط ہمارے دل پر ہو، خواہ بیرونی دنیا پر ہو اور کہ خدا کی محبت اس بات قادر ہے کہ وہ بدی اور گناہ کو زائل کر دے (یسعیاہ ۴۶: ۱۱؛ رومیوں ۶ باب)۔

(۴)

پس مسیحیت کے مطابق جنابِ مسیح صرف اس معنی میں درمیانی ہیں۔ آپ کے ذریعے نوع انسان کو خدا کا حقیقی عرفان اور اس کی ذات کا صحیح علم حاصل ہوا ہے۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم آپ کی لاثانی زندگی، آپ کی بے نظیر قربانی اور موت اور آپ کی ظفریاب قیامت آپ کی لازوال محبت اور اس کے ازلی مقصد کو بعینہ اسی طرح ظاہر کر دیتی ہیں جس طرح اقوال وافعال ہمارے دلوں کے خیالات وجذبات کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ خداوند مسیح کی تعلیم، زندگی موت اور قیامت کے بغیر خدا کی ذات اور اس کی محبت کو جس طور پر ہم اب جانتے ہیں ہر گز نہ جان سکتے کہ تائب ہو کر اپنے گناہوں سے اس طور پر پشیمان ہو سکتے کیونکہ خداوند مسیح کی ایثار محبت اور صلیبی موت توبہ کی بہترین محرک ہیں۔ آپ کی موت کے بغیر نہ تو ہم کو اپنے گناہوں کا یقین ہوتا۔ نہ ہم کو اس طور پر پشیمان ہو سکتے۔ کیونکہ خداوند مسیح کی ایثار بھری زندگی اور قربانی اور صلیبی موت توبہ کی بہترین محرک ہیں۔ آپ کی موت کے بغیر نہ تو ہم کو خدا کی اتھاہ محبت کا علم ہوتا۔ نہ ہم کو اس محبت کی غایت اور مقصد کا پتہ چلتا اور نہ ہم کو اپنے گناہوں کی مغفرت کا یقین آتا اور نہ آپ کی ظفریاب قیامت کے بغیر اس بات کا یقینی علم ہوتا کہ نیکی بدی کی طاقتوں پر ضرور بالضرور غالب ہو کر رہتی ہے اور کہ انسان اس ابدی زندگی کو حاصل کر سکتا ہے جو زماں ومکاں کی قیود سے بالا ہے اور خدا کی رفاقت کا دوسرا نام ہے۔

مسیح خدا کا مظہر

خدا کل کائنات کا خالق ہے۔ مخلوقات پر نظر کر کے ہم کو کسی حد تک خالق کی ذات وصفات کا پتہ چلتا ہے پس خدا نے فطرت اور مادی دنیا کے ذریعہ نوع انسانی کو ایک حد تک اپنا علم اور مکاشفہ کا ظہور عطا کیا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے کہا کہ "عالم ہمہ مرات جمال ازلی است" یعنی دنیا ازلی جمالی کا نظارہ ہے شیخ سعدی علیہ الرحمتہ بھی کہہ گئے ہیں۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

ہر ورق دفتر یست ازمعرفت کردگار

کتب سماوی سے بھی ہم کو یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ بعض اوقات خدا خاص طور پر مادی اشیا کو اپنے ظہور کا وسیلہ بناتا ہے۔ چنانچہ خروج کی کتاب میں لکھا ہے کہ خدا ایک جھاڑی میں آگ کے شعلہ کی صورت میں حضرت موسیٰ پر ظاہر ہوا اور خدا نے اس کو جھاڑی میں سے پکارا اور کہا اپنے پاؤں سے جوتا اتار کیونکہ جس جگہ تو کھڑا ہے وہ (ظہور خاص کے سبب سے) پاک اور مقدس زمیں ہے۔ میں تیرے باپ ابراہام کا خدا ہوں (خروج ۳: ۱۔۶)۔ قرآن میں بھی تورات کے الفاظ وارد ہوئے ہیں "جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچا تو میدان کے دائیں کنارے مقدس جگہ میں جھاڑی سے یہ آواز آئی کہ اے موسیٰ میں رب العالمین ہوں (قصص آیت ۳۰) پر لکھا ہے "یہ آواز دی گئی کہ مبارک ہے وہ جو آگ میں ہے اور اس کے آس پاس ہے" (سورہ نحل آیت ۳)۔

خدا نے نہ صرف جھاڑی کے شعلہ میں اپنا ظہور اور جلوہ دکھایا بلکہ اس نے اپنا جلال موسیٰ اور بنی اسرائیل پر "دن کے وقت بادل کے ستون میں" اور رات کے وقت آگ کے ستون میں" ظاہر کیا (خروج ۱۳: ۲۱۔۲۲؛ ۱۹: ۹) خدا نے موسیٰ کو اور بنی اسرائیل کو کوہ سینا پر اپنا جلال

دکھایا"جب صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے ۔کوہ سیناا ور سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اترااور سارا پہاڑ ہل گیا"(خروج۱۹:۱۶۔۲۰)جب حضرت موسیٰ نے خیمہ کھڑا کیا تو "ابر کا ستون اتر کر خیمہ کے دروازہ پر ٹھہرا رہتا اور خداوند موسیٰ سے باتیں کرنے لگتا اور سب لوگ اپنے ڈیروں کے دروازے پر خدا کو سجدہ کرتے جیسے کوئی شخص اپنے دوست سے باتیں کرتا ہے ویسے ہی خداوند روبرو ہو کر موسیٰ سے باتیں کرتا تھا(خروج ۳۳:۱۰۔۱۱)جب موسیٰ نے کہا تو مجھے اپنا جلال دکھا تو خدا نے کہا تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا کیونکہ انسان میرا چہرہ دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔تب خداوند اس کے آگے سے یہ پکارتا ہوا گذرا"خداوند خدائے رحیم اور مہربان ہے۔قہر کرنے میں دھیما اور شفقت اور وفا میں غنی ہے۔ہزاروں پر فضل کرنے والا گناہ اور تقصیر وخطا کا بخشنے والا ہے(خروج ۳۳:۷ تا ۳۴:۹)۔

خدا نے نہ صرف مادی اشیا کے ذریعہ اپنے جلال کا جلوہ دکھایا بلکہ اس نے اپنے انبیا کے ذریعہ اور انبیا کی روشن شرائع کے ذریعہ بھی اپنی ذات پاک کا اظہار کیا چنانچہ عبرانیوں کے خط کا مصنف لکھتا ہے کہ "اگلے زمانہ میں خدا نے باپ دادا سے حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح نبیوں کی معرفت کلام کر کے اس زمانہ کے آخر میں ہم سے اپنے بیٹے کی معرفت کلام کیا۔اس نے اپنے ابن کو سب چیزوں کا وارث ٹھہرایا اور اس کے وسیلے اس نے عالم بھی خلق کئے"(عبرانیوں ۱:۱۔۲)۔پس خدا کا نہ صرف اشیائے فطرت میں اور صحائف انبیا میں ظہور ہوا بلکہ اس کے ظہور کا جلال کا آخری معراج ابن اللہ میں ہوا جو "خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش ہو کر اپنی قدرت کے کلام سے سب چیزوں کو سنبھالتا ہے "(عبرانیوں ۱:۳)۔

کلام مجسم ہوا

(۱)

ہم نے سطور بالا میں بتلایا ہے کہ اشیا نے فطرت میں خدا کا ظہور ہے اور ہر قدرتی شے خدا کا جلال ظاہر کرتی ہے۔چنانچہ زبور شریف میں ہے آسمان خدا کا جلال ظاہر کرتا ہے اور فضا اس کی دستکاری دکھاتی ہے۔دن دن سے باتیں کرتا ہے اور رات رات کو حکمت سکھاتی ہے گو ان کی آواز سنائی دیتی ہے تاہم ان کا سر ساری زمین پر اور ان کا کلام دنیا کی انتہا تک پہنچتا ہے۔خدا جلوہ گر ہوا ہے۔آسمان اس کی صداقت بیان کرتا ہے خدا نور کو پوشاک کی طرح پہنتا ہے اور آسمان کو سائبان کی طرح تانتا ہے۔وہ بادلوں کو رتھ بناتا ہے اور ہواؤں اور آگ کے شعلوں کو اپنا خادم بناتا ہے۔اس نے زمین کو قائم کیا اور اس کو سمندر سے چھپایا پہاڑ بھر آئے۔وادیاں بیٹھ گئیں۔وہ وادیوں میں چشمے جاری کرتا ہے۔اس کی صنعتوں کے پھل سے زمین آسودہ ہے وہ زمین سے خوراک پیدا کرتا ہے۔اس نے چاند اور سورج کو وقت اور زمانوں کے امتیاز کے لئے مقرر کیا۔موسم بہار میں وہ روئے زمین کو نیا بنا دیتا ہے۔اے خداوند تیری صنعتیں کیسی بے شمار ہیں۔تو نے سب کچھ حکمت سے بنایا۔خداوند کا جلال ابد تک رہے(زبور ۱۹:۱۰۴)۔مقدس پولوس بھی لکھتا ہے "خدا کی اندیکھی صفات اس کی ازلی قدرت اور الوہیت دنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعہ سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہے"(رومیوں ۱:۲۰)۔پس خدا کی قدرت اور الوہیت کا اشیائے فطرت اور اجرام فلکی وغیرہ کے ذریعہ علم اور معرفت حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ ان میں الوہیت کا ظہور ہے۔

لیکن خدا کی معرفت کا اور اس کی الوہیت کا ظہور اشیائے فطرت اور اجرام فلکی سے بھی بڑھ کر خدا کے نبیوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہم پر ہوتا ہے کیونکہ انبیا اور صحائف انبیا ہم کو نہ صرف کائنات کے خالق کا پتہ دیتے ہیں بلکہ خدا کی بادشاہی اور حکمرانی کا اور رضائے الٰہی کا بھی پتہ

دیتے ہیں اور ہم کو بتلاتے ہیں کہ رضائے الٰہی اٹل ہے اور اس کے قوانین نہ صرف فطرت میں جاری ہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی ساری ہیں اور کوئی شخص یا قوم یا ملک ان اٹل فطری اخلاقی اور روحانی قوانین کو بغیر نتائج بھگتے نہیں توڑ سکتا جس قوم نے اپنی راہوں کو ان قوانین کے مطابق درست کیا وہ عروج کو پہنچ گئی لیکن جس قوم کی راستبازی کے قوانین کو توڑا اور خود سری کر کے اپنی راہ پر چلی وہ قعر مذلت (انتہائی ذلت) وضلالت میں کھو گئی۔ صحف انبیا کا پیغام ہی یہ ہے کہ جس طرح فطرت میں خدا کی حکمت و دانش کا ظہور موجود ہے اسی طرح انسان کی زندگی میں اور ہر قوم کی زندگی میں اس کا ظہور موجود ہے اور اہل دانش اقوام و ملل (ملت کی جمع، مذاہب، ادیان) کی تاریخ میں رضائے الٰہی کا ظہور کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور یہ جان سکتے ہیں کہ دنیا اور دنیا کی تاریخ میں خلاق کائنات کا ظہور ہے۔ خدا کے ظہور کا جلال اوراق تاریخ میں روشن ہو کر چمکتا ہے اور خالق کی رضا اور خالق کی ذات وصفات کا صاف پتہ دیتا ہے۔

(۲)

پس خدا کا ظہور اوراق فطرت اوراق صحائف انبیا اور اوراق تاریخ میں ہر بالغ نظر کو نظر آجاتا ہے۔ لیکن خدا کے ان مختلف ظہوروں میں فرق ہے اور یہ فرق صرف ظرف یا وسیلہ یا واسطہ کا ہی فرق نہیں یہ فرق صرف حد کا یا کم و بیش درجہ کا بھی فرق نہیں بلکہ یہ فرق ظہوروں کی نوعیت کا فرق ہے۔ درختوں کے برگ سبز میں جو خدا کا ظہور نظر آتا ہے وہ اس ظہور سے نوعیت میں فرق رکھتا ہے جو اجرام فلکی میں ہے بلکہ اجرام فلکی کے ظہوروں میں بھی فرق ہے "آفتاب کا جلال اور ہے مہتاب کا جلال اور ستاروں کا جلال اور ہے بلکہ ستارے ستارے کے جلال میں فرق ہے۔ زمینوں کا جلال اور ہے"۔ اجرام فلکی میں جو الٰہی ظہور سے نوعیت میں فرق رکھتا ہے جو ابن اللہ کے ذریعہ ہوا اس نوعی فرق کی بنیاد وہ صفات ہیں جو صرف مسیح کلمۃ اللہ روح اللہ وجیہا فی الدنیا والآخرت کی قدوس ذات میں پائی جاتی ہیں اور کسی دوسرے فرزند آدم میں نہیں پائی جاتیں جس نسبت سے ابن اللہ کی کامل انسانیت اور اس کی ذات پاک کی شخصیت دیگر فانی انسانوں سے بالا اور برتر ہے۔ اسی نسبت سے خدا کا یہ مظہر دیگر ظہوروں سے مختلف اور اسی نسبت سے خدا کے ظہور کا نور اور نور کے جلال صاف اور واضح نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ سے خدا کے چہرے کا نور نہ دیکھا جا سکا لیکن ابن اللہ خود "خدا کے جلال کا پرتو اور اس کی ذات کا نقش ہے اور اپنی قدرت سے کائنات کی سب چیزوں کو سنبھالتا ہے" پس ابن اللہ خدا کا کامل اور اکمل مظہر ہے حضرت روح اللہ کی ذات وصفات الٰہی ذات وصفات ہیں جن کے ذریعہ نوع انسانی کو پورا پورا علم ہو جاتا ہے کہ رب العالمین خدا کس قسم کا خدا ہے اور اس کی ذات وصفات کس قسم کی ہیں۔ کلمۃ اللہ ایک پہلو سے کامل انسانیت کا کامل مظہر ہے اور دوسرے پہلو سے ذات الٰہی کا اکمل مظہر ہے۔ آپ کی ذات پاک میں الوہیت اور کامل انسانیت یکجا آپ کے جسم اطہر میں نوع انسانی کو نظر آئیں۔ "خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے ابن وحید نے جو محبوب الٰہی ہے (لوقا ۴: ۲۲) خدا کو احسن اور اکمل طور پر ظاہر کر دیا۔ آپ کی انسانی ذات پاک میں الٰہی ظہور کا معراج اور الٰہی جلال کا پرتو اور الٰہی ذات کا نقش ایسا مکمل اور جامع ہے کہ حضرت روح اللہ اپنی زبان مبارک سے فرماتے ہیں "جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا" (یوحنا ۱۴: ۹) آیہ شریفہ "کلام مجسم ہوا (یوحنا ۱: ۱۴) سے مراد صرف الوہیت کا کامل ظہور ہی نہیں بلکہ انسانیت کمال کا ظہور بھی مراد ہے۔ یعنی وہ انسانیت جو "خدا کی صورت پر پیدا" کی گئی تھی (پیدائش ۱: ۲۷) اس ابن وحید کی واحد اور غیر منقسم ذات میں الوہیت کا ظہور اور اصلی خلقی ابتدائی انسانیت کے کمال کا ظہور دونوں صاف نظر آتے ہیں۔ کیونکہ آپ کی کامل انسانیت میں "الوہیت کی ساری معموری سکونت کرتی ہے" (کلسیوں ۱: ۱۹؛ ۲: ۹؛ یوحنا ۱: ۱۴؛ ۱: ۱۶؛ ۲۔ کرنتھیوں ۵: ۱۹ وغیرہ)۔

(۳)

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ واجب الوجود الوہیت کا ظہور محدود اور حادث مسیح کی انسانیت میں کسی طرح ہو سکتا ہے ؟ تو ہم اس کو حکیم قآنی کے اشعار یاد دلاتے ہیں:-

یکے گفتا قدیم ازاصل باحادث نہ پیوند و
سپش پیوند ماباذات بے ہمتا چنانستی
بگفتم راست می گوئی دراہ راست می پوئی
ولیکن آنچہ می جوئی عیاں ازیں بانستی

لیکن ہم حکیم قآنی کی مثال کی بجائے معترض کی توجہ الٰہی اور قرآنی سورہ قصص کی مذکورہ بالاآیت (۳۰) کی جانب منعطف (متوجہ ہونے والا) کرتے ہیں۔ جس طرح جھاڑی میں محدود اور حادث شعلہ الفاظ اور آواز میں واجب الوجود ''رب العالمین'' موجود تھا اور حضرت باری تعالیٰ کی حضوری کی وجہ سے ''آگ اور آس پاس'' کی اشیاء مبارک ہو گئیں اسی طرح کلمۃ اللہ کے کلام، روح اللہ کی زندگی اور ابن اللہ کی موت اور ظفریاب قیامت میں بدرجہ احسن ''الوہیت کی ساری معموری سکونت کرتی ہے۔ حضرت روح اللہ کی روح خدا کا مظہر ہے اور آپ کا ''نورانی'' جسم (متی ۱۷:۲۳) ''مبارک'' تھا۔ کیونکہ وہ ہر لحظہ خدا کا مظہر تھا پس آپ کی ذات پاک کے واسطے میں وجوب (لازم ہونا) وامکان دونوں موجود ہیں اور واجب اور ممکن میں ربط کا وجود ہے۔

بحمد اللہ کہ ربطے ہست بامطلق مقیدرا

چنانچہ ہم باب سوم کی فصل اول زیر عنوان ''کلمۃ اللہ انسان ہے'' مولانا جامی علیہ الرحمتہ کی کتاب فصوص الحکم سے اقتباس کر آئے ہیں کہ

> ''حقیقی کامل انسان وہ ہے جو دجوب وامکان میں برزخ ہو اور صفات قدیمہ اور حادثہ دونوں کا آئینہ ہو۔ یہی حق اور خلق کے درمیان واسطہ ہے اسی کے ذریعہ خدا کا فیض تمام مخلوقات کو پہنچتا ہے اور وہی بجز ذات حق کے تمام مخلوقات کی بقا کا سبب ہے یہ برزخ وجود وامکان کا مغائر نہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا کو خدا کی مدد حاصل نہ ہوتی کیونکہ خدا اور دنیا میں کوئی مناسبت اور ارتباط نہ ہوتا''۔

(ص ۲۲ مطبوعہ فیض بخش پریس)

بمعنی ہست پاینده بصورت ہست زائنده
بوجھے ازمکان بیروں بوجھے درمکانستی
(قآنی)

پس کلمۃ اللہ اور ابن اللہ کی اس ''مناسبت اور ارتباط (ملاپ، دوستی)'' سے اس جدائی کی خلیج کو (جو انسان کے گناہ کی وجہ سے خدا اور نوع انسان میں حائل ہو گئی تھی) دور کر کے از سر نو ایسا تعلق پیدا کر دیا کہ انسان فیضان الٰہی (روح القدس) سے ہمیشہ مستفیض ہو کر خدا کی قربت میں رہ سکتا ہے۔

ابن اللہ کی قدوس ذات خدا کا مظہر ہے ''خدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اسی نے ظاہر کیا''(یوحنا۱:۱۸) ۔جنابِ مسیح نے خدا کو ایسے اور اکمل طور پر ظاہر کیا کہ آپ نے سامعین کو فرمایا''اگر تم مجھے جانتے تو میرے باپ کو بھی جان سکتے''(یوحنا۸:۱۹) جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا''(یوحنا۱۲:۴۵) کیونکہ ''میں اور باپ ایک ہیں''(یوحنا۱۰:۳۰)۔اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ خدا کس قسم کا خدا ہے تو ہم جنابِ مسیح کو دیکھ کر یہ جان سکتے ہیں کہ خدا کس قسم کا خدا ہے۔الٰہی زندگی اسی طرح کی زمان و مکان کی قیود میں بسر ہوئی جن میں دیگر انسانوں کی زندگیاں بسر ہوتی ہیں اور ایسے حالات کے بسر ہوئی جن سے نوع انسانی مانوس ہے(۱۔ تیمتھیس ۳:۱۶)۔ کلمۃ اللہ کے خیالات کو دیکھ کر جان سکتے ہیں کہ خدا کے کیا خیالات ہیں(متی ۱۶:۲۳) آپ کے جذبات کو ہم دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے جذبات کس قسم کے ہیں(یوحنا۵:۲۲)۔آپ کا نقطہ نگاہ خدا کا نقطہ نگاہ ہے۔جو نجات کی تدبیر آپ نے پیش کی وہ الٰہی تدبیر ہے(متی ۱۶ باب) اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ کلمۃ اللہ نوع انسانی سے کس قسم کی محبت کرتا ہے(یوحنا۳:۱۶) اگر اس دنیا میں کلمۃ اللہ کی سیرت خدا کا عکس نہیں اور وہ خدا کی ذات کی نسبت ہم کو کچھ نہیں بتلا سکتی تو دنیا کی کوئی اور شئے یا ہستی اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتی۔ لیکن کلمۃ اللہ کے ذریعہ خدا کی اصلی صورت ہم پر ظاہر ہو سکتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا ایک ایسی ہستی ہے جس کو ہم جان سکتے ہیں اور جس سے ہم محبت کر سکتے ہیں۔

(۴)

ہم یہ کہہ سکتے ہیں خدا مسیح کی مانند ہے لیکن ہمارے وہ وہم و گمان میں بھی نہیں آتا کہ ہم کہیں کہ خدا کسی اور نبی یا رسول یا بدھ یا کرشن کی مانند ہے۔ یہ کیوں ؟اس واسطے کہ ہم کو خدا اور مسیح کے درمیان کوئی خلیج نظر نہیں آتی لیکن خدا اور دیگر مذہبی راہ نماؤں اور نبیوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے جو ناقابلِ عبور ہے۔ جن مذہبی پیشواؤں کو دیوتا بنایا گیا مثلاً گوتم بدھ یا کرشن وغیرہ ان کی دیوتاؤں کا درجہ دینے والے وہ لوگ تھے جو شرک اور دیوتا پرستی میں مبتلا تھے۔ لیکن ابن اللہ کی الوہیت کو ماننے والے مشرک نہیں تھے بلکہ ایسے موحد (خدا کو ایک ماننے والا) یہودی تھے۔ جنہوں نے کل دنیا کو وحدت الٰہی کا سبق پڑھایا تھا وہ خود شرک اور بت پرستی سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور ان باتوں کے خلاف اپنی تقریروں اور تحریروں میں لوگوں کو ہوشیار اور خبردار کرتے تھے(اعمال۱۷:۲۲؛ رومیوں ۱:۲۳۔۲۵؛ ۱۔کرنتھیوں۶:۹۔۱۰؛ ایوب۵:۲۱؛ مکاشفہ۸:۲۱ وغیرہ)۔یہود کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ قوم یہود نہایت متعصب موحد تھی۔ یہود اپنے دین اور عقائد کی خاطر ہر وقت لڑنے مرنے کو تیار رہتے تھے۔کتاب اعمال رسل سے ظاہر ہے کہ ابتدائی کلیسیا صرف ان موحد یہودیوں پر ہی مشتمل تھی۔ کیا یہ بات کسی صحیح العقل شخص کے خیال میں آسکتی ہے کہ کلیسیا کے چند غیر معروف اشخاص کلمۃ اللہ کے موحد یہودی حواریئن اور تابعین کے ہوتے ہوئے ایک شخص کو جو محض نبی اور انسان تھا الوہیت کا درجہ دیتے اور یہ کٹر موحد یہودی مسیحی کلیسیا صم ''بکم'' خاموش بیٹھی دیکھا کرتی اور بقول شخصے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی مصداق بنتی ؟اعمال الرسل سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔انہوں نے ختنہ جیسی معمولی رسم کے ادا نہ ہونے پر ہنگامہ مچا دیا تھا(اعمال ۱۵ باب)۔ کیا اس قماش (انداز) کے اشخاص سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر مسیح کی الوہیت جیسا بنیادی اصول متنازعہ امر ہوتا تو وہ حرفِ شکایت تک زبان پر نہ لاتے اور صدائے احتجاج تک بلند نہ کرتے بلکہ الٹا اس کا پرچار کرتے۔ابتدائی کلیسیا اپنے روحانی تجربہ سے جانتی تھی کہ گو ابن اللہ جسم میں مومنین کے ساتھ نہ تھے تاہم آپ کی روح ان کے اندر بستی ہے(اعمال ۲:۲ تا آخر؛ ۴:۸، ۳۱؛ ۵:۳۲؛ رومیوں ۹:۱؛ ۱۔کرنتھیوں ۲:۱۰؛ ۳:۱۶؛ ۲۔کرنتھیوں ۱:۲۲؛ افسیوں ۱:۱۳؛ عبرانیوں ۱۰:۱۵ وغیرہ) اور ان سب یہودی اور غیر یہودی مسیحیوں کا معیار ایک ہی تھا''خدا کے روح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی روح اقرار کرے کہ جنابِ مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے''(۱۔یوحنا۴:۲؛

ا۔کرنتھیوں ۱۲:۳)۔ مسیح کی زندہ روح مسیحی کلیسیا کے شرکا کے ساتھ زندہ رفاقت رکھتی تھی اور ابن اللہ میں اور ایمانداروں میں باہمی تعلقات اس قسم کا تھا کہ ایماندار کی روح کا اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے (یوحنا۱۵:۴)۔

معشوق وعشق وعاشق ہر سہ یکے ست ایں جا

دیگر مذاہبِ عالم کے ہادی اپنے پیروؤں کے ساتھ اس قسم کا تعلق نہیں رکھتے اور نہ رکھ سکتے ہیں۔ مثلاً کیا گوتم بدھ یا محمد عربی یا کرشن انسانی روح کے ساتھ ایسا تعلق رکھ سکتے ہے کہ ایماندار کہے "گوتم بدھ یا محمد یا کرشن مجھ میں زندہ ہے اور میں جو زندگی اب جسم میں گزارتا ہوں گوتم یا محمد یا کرشن پر ایمان لانے سے گذارتا ہوں جس نے مجھ سے محبت رکھی اور اپنے آپ کو میرے لئے موت کے حوالے کر دیا پس اب میں زندہ نہ رہا بلکہ گوتم یا محمد یا کرشن مجھ میں زندہ ہے" یا "میں گوتم بدھ یا محمد یا کرشن کے ذریعہ جو مجھ کو طاقت بخشتا ہے سب کر سکتا ہوں"۔ لیکن یہ الفاظ اور اس قسم کے ہزاروں فقرات انجیل جلیل کی کتب میں ایمانداروں کے دردِ زبان ہیں (فلپیوں ۴:۱۳) دورہ حاضرہ میں بھی غیر مسیحی مذاہب کے پیروؤں میں سے کوئی شخص اس قسم کے الفاظ اپنے دینی پیشوا یا ہادی کے منہ سے نہیں نکالتا مثلاً اے شینکر اچاریہ، اے رامانج یا اے افلاطوں تو میری جان کو پیار کرتا ہے"۔ لیکن ابن اللہ اور ایماندار کا باہمی تعلق ایسا ہے کہ دورِ حاضرہ میں تمام جہان کے کلیسیائے جامع اس دنیا کے گوشہ گوشہ میں اس قسم کے گیت اور الفاظ روزانہ حرزِ جان بنائے رکھتی ہے۔

اتصالِ بے تخیل بے قیاس

ہست رب الناس رابا جانِ ناس

(۵)

یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ ابتدا سے لے کر دورِ حاضرہ تک دو ہزار سال سے ہر زمانہ اور ملک اور قوم کے سامنے کلیسیائے جامع نے منجی عالمین کی یہی تصویر پیش کی ہے۔ اس انجیلی تصویر کے علاوہ خداوند یسوع مسیح کی اور کوئی تصویر موجود نہیں اور اگر ہے تو ایسی تصویر کا انجیلِ جلیل کی تصویر کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں اور چونکہ ایسی تصویر ابن اللہ کی تواریخی تصویر کے عین نقیض (مخالف، عداوت) ہوگی اور لہٰذا وہ مستند اور قابلِ اعتبار نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی بنا تواریخی حقیقت نہیں بلکہ محض انسانی تخیل ہے۔ اجتماع الضدین عقلی طور پر محال ہے۔ ضدین میں سے اگر ایک غلط ہو تو دوسرا ضرور صحیح ہوتا ہے اور چونکہ جنابِ مسیح کی وہ تصویر جو انجیل جلیل کی کتب میں ہے صحیح ہے لہٰذا ہر دوسری تصویر جو اس کی ضد ہے غلط اور ناقابل قبول ہے۔ پس جنابِ مسیح دیگر انبیاء کی طرح ایک نبی نہیں تھے اور نہ وہ خدا کا ایک مکاشفہ اور مظہر تھے بلکہ آپ کا مکاشفہ آخری اور قطعی ہے اور آپ خدا کے کامل اور اکمل مظہر ہیں۔ دیگر تمام مکاشفے غیر مکمل ناقص اور زمان و مکان کی قیود میں جکڑے ہوئے ہیں۔

بعض مذاہب اور مذہبی لیڈروں نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ جنابِ مسیح کی عظمت کو برقرار رکھیں لیکن آپ کی الوہیت، بادشاہت، واحد حکمرانی، جامعیت، قطعیت اور عالم گیریت کا انکار کریں۔ اسلام نے آپ کو "روح اللہ" "کلمۃ اللہ، وجیہاً فی الدنیا والآخر" "مسِ شیطان سے منزہ" اور مریم بتول کی جائز اولاد مانا ہے۔ آپ کی آمدثانی اور دجال مردود پر فتحیابی کو برقرار رکھا ہے۔ آپ کی تعلیم کو "ہدایت"، "امام"، "نور" وغیرہ قرار دیا ہے۔ غرض یہ کہ اسلام نے اور دیگر مذاہب کے مصلحین نے اسلام کے ہم نوا ہو کر آپ کو عظمت دی ہے۔ لیکن آپ کو وہ درجہ نہیں دیا جو انجیل شریف کی تواریخی تصویر میں دیا گیا ہے۔ انہوں نے آپ کی شخصیت اور نبوت کو دیگر انبیاء کی شخصیت اور نبوت کی مانند قرار دے کر آپ کو نبیوں میں سے ایک گردانا ہے۔ لیکن آپ کے مکاشفہ کو قطعی اور آخری نہیں مانا۔ آپ کی تعلیم، زندگی، موت اور ظفریاب قیامت کو بنی نوع انسان کی نجات کا باعث نہیں جانا۔ لیکن یہ تصویر وہ نہیں جو ہم کو انجیل جلیل کی کتب میں نظر آتی ہے وہ تصویر واقعات پر

مبنی ہے لیکن یہ تصویر محض انسانی نظریوں اور خیالوں پر مبنی ہے۔ لہٰذا یہ تصویر غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمۃ اللہ کی اور انجیل کی وہ قدر اور وقعت نہیں کی جاتی جو قرآن کی رو سے بھی ان کا حق ہے۔ گو اسلام انجیل کو منِ جانب اللہ مانتا ہے لیکن چونکہ اس کو بے عدیل پیغام قرار نہیں دیتا لہٰذا اس کا اقرار محض زبانی جمع خرچ ہے۔ مسلمان انجیل جلیل کے جانفزا پیغام کو پس پشت پھینک دیتے ہیں اور مسیحی کتب مقدسہ کا مطالعہ تک روا نہیں رکھتے۔ جس مذہبی مصلح نے خداوند مسیح اور آپ کے پیغام کی اسی حد تک عظمت نہ کی جس تو چونکہ یہ عظمت تواریخی حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی اس مصلح کے مقلدین (مقلد کی جمع، پیروکار) نے کلمۃ اللہ کو اپنے دل میں وہ جگہ نہ دی جو انہوں نے حضرت محمد کو یا مہاتما بدھ کو یا کرشن مہاراج کو دی۔ چونکہ ایسا غلط نظریہ اور خیال اپنے اندر زندگی نہیں رکھتا لہٰذا زبانی جمع خرچ کے اقرار کے علاوہ انہوں نے عملی پیرایہ میں یہ نہ دکھایا کہ خداوند مسیح ان کے دلوں پر حکمران ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصلاح چند روز ہی رہی اور پھر حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ مثلاً ہندوستان میں راجہ رام موہن رائے اور ان کے چیلوں نے اسی بنیاد پر ہندومت کی اصلاح کی لیکن آج ہندوستان میں برہمو سماج کے پیرو لعدودے چند ہیں۔ جن کی آواز کا کوئی شنوا نہیں۔ اس اصلاح میں زندگی نہ تھی انہوں نے ''زندگی کے مالک'' (اعمال ۳:۱۵)۔ کو اپنے دلوں پر حکمران نہ کیا اور صرف آپ کے اصول کی روشنی میں اپنے فرسودہ مذہب کی اصلاح کرنی چاہی۔ انہوں نے ''نئی مے ''کو پرانی مشکوں میں بھرا'' (متی ۹:۱۷)۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشکیں پھٹ گئیں اور ان کے مذہب کی اصلاح کی تمام کاوشیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ہندو مذہب کے مصلحین کا یہ خیال تھا کہ مسیحی اصول دیگر مذاہب کے اصول ساتھ ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں لیکن یہ امر محال[1] ہے۔ خداوند مسیح کے اصول دیگر مذاہب کے اصول کے ساتھ ایک قطار میں کھڑے نہیں ہو سکتے اور نہ منجی عالمین دیگر مذاہب کے بانیوں کا ہم پلہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ آپ کی تعلیم آپ کی لاثانی شخصیت سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا آپ کی لاثانی تعلیم دیگر مذاہب کی تعلیم کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ کسی ملک یا جماعت میں دخل پائے گی تو واحد حکمران ہو کر رہے گی۔

اہلِ اسلام نے دیکھا کہ منجی عالمین کی انجیلی تصویر میں اور حضرت عیسیٰ کی قرآنی تصویر میں فرق عظیم ہے اور تصویر کے یہ دونوں رخ مساوی طور پر درست اور صحیح نہیں ہو سکتے تو ان کو بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ سوجھا کہ آنخداوند کی انجیلی تصویر کی صحت کا انکار کر دیں۔ چونکہ مسلمان برادران کلمۃ اللہ کو صرف افضل نبیوں میں سے محض ایک نبی گردانتے ہیں۔ لیکن انجیل جلیل آپ کی شخصیت کو جامع، بے نظیر، بے عدیل، اور عالم گیر ہستی قرار دیتی ہے جس میں الوہیت کی ساری معموری سکونت کرتی ہے اور چونکہ یہ دونوں دعوے ایک ہی ہستی کی طرف مساوی طور پر منسوب نہیں کئے جا سکتے لہٰذا اہلِ اسلام نے بمصداق

من نیز حاضرم شوم تفسیر قرآں در بغل۔

انجیل جلیل کی کتب محرف (ٹیڑھا، مذہب کو اپنے مفاد کا ذریعہ بنانے والا) قرار دے دیا اور ابن اللہ کی انجیلی تصویر کو مصنوعی اور غلط قرار دے دیا چنانچہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری فرماتے ہیں کہ

> ''انجیل میں لکھا ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے اور مسیح کو کارخانہ قدرت میں مالک و مختار بنایا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مسیح انسانوں کے لئے کفارہ ہوا ہے ۔۔۔۔ عیسائی مذہب کی بنیادی باتیں یہی ہیں (یوحنا ۱۰:۲۸؛ ۸:۵۸؛ ۵:۱۷؛ ۶:۳۵۔۵۱؛ ۱۴:۱۳) پس انجیل الہامی نوشتہ اور مذہبی کتاب پڑھنے کے قابل نہیں''۔

(اہلحدیث ۱۴ ستمبر ۱۹۳۶، صفحہ ۳تا۴)۔

---

1 ۔اس موضوع پر ''اپنی کتاب'' کیا تمام مذاہب یکساں ہیں'' میں مفصل بحث کی ہے (برکت اللہ)

مولانا مرحوم کی تفسیر ان قرآنی آیات کی جن میں انجیل کو نور اور ہدایت قرار دیا گیا ہے اور جس کی صحت کی تصدیق قرآن بار بار کرتا ہے اور مومنین پر اس کی تلاوت فرض کر دیتا ہے!

مولانا مرحوم موصوف کا مطلب یہ ہے کہ از بسکہ کلمۃ اللہ کے وہ دعوے جو ہم نے اس فصل میں لکھے ہیں انجیل میں پائے جاتے ہیں ۔لہٰذا انجیل محرف (تحریف کیا گیا ہے) ہے اور الہامی نوشتہ نہیں ہے۔ ہم نے اپنے رسالہ ''قدامت واصلیت اناجیل اربعہ ''اور رسالہ ''صحتِ کتبِ مقدسہ ''میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ اہل اسلام کا یہ دعویٰ باطل بے بنیاد اور قرآن کی تاریخ کے سراسر خلاف ہے اور کتبِ مقدسہ میں تحریف نہیں ہوئی جو مدعی کے ذہن میں ہے بلکہ اس کے برعکس روئے زمین کی تمام کتبِ مقدسہ میں صرف انجیل جلیل ہی ایک ایسی کتاب ہے جس کی صحت کا پایہ لاجواب ہے۔

پس ثابت ہو گیا کہ ابن اللہ کی وہ تصویر جو انجیل جلیل پیش کرتی ہے صحیح ہے۔ چونکہ از روئے اصول منطق اجتماع الضدین محال ہے۔ لہٰذا وہ تمام بیانات اور خیالات جو اس تصویر کے نقیض ہیں سراسر غلط اور بے بنیاد ظن ہیں۔ ابن اللہ کے کام اور پیغام زندگی اور شخصیت کے لاثانی بے نظیر ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔

(۶)

دنیائے مذاہب میں جنابِ مسیح اکیلا فاتح ہیں۔ جب سے منجی عالمین اس دنیا میں آئے دنیا کی قسمت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ''قبل از مسیح'' اور ''بعد از مسیح''۔ آپ کی ہستی نے دنیا کی کایا ایسی پلٹ دی کہ تاریخ عالم کے مورخ کے لئے دونوں حصص (حصہ کی جمع) میں امتیاز کرنا امرِ ناگزیر ہو گیا۔ ذرا ایک لمحہ کے لئے توسن خیال کو دوڑاؤ اور عالمِ خیال میں یہ تصور کرو کہ آنخداوند اس دنیا میں کبھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ ذرا اندازہ کرو کہ دنیا کے خیالات اور جذبات کیا ہوتے ؟ ممالکِ عالم کی تاریخ کے صفحات کس سیاہی سے لکھے جاتے ؟ انسانی زندگی کے اخلاقی معیار کیا ہوتے ؟ اقوامِ عالم کا کیا حال ہوتا؟ معاشرت اور تمدن پر اس کا کیا اثر پڑتا؟ بنی نوع انسان کا کیا حشر ہوتا؟ اس کے خیال سے ہی ہر صحیح العقل شخص کے بدن میں کپکپی اور رعشہ پڑ جاتا ہے۔ اگر ہندو مذہب دنیا سے مٹ جاتا۔ اگر اسلام کے خصوصی عقائد (جو یہودیت اور مسیحیت سے اخذ نہیں کئے گئے) دنیا سے رخصت ہو جاتے یا اگر بدھ مت کے اصول ناپید ہو جائیں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دنیا کی حالت ابتر ہو جائے گی۔ لیکن اگر منجی عالمین کی شخصیت اور کلمۃ اللہ کے اصول دنیا سے رخصت ہو جائیں تو دنیا دوزخ کا نمونہ جائے گی اور جہان ایک ایسا ظلمت کدہ بن جائے گا جس میں بد نظمی، تاریکی اور گھپ اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔

اگر لطف تو اے داور نگر دو خلق رارہبر

زآہ خلق در محشر صامت ہا شود برپا

اس حقیقت کو موالف و مخالف سب مانتے ہیں۔ چنانچہ فرانس کا مشہور عقل پرست عالم رینان (Renan) کہتا ہے

''اگر مسیح کی ہستی کو نظر انداز کر دیا جائے تو تاریخ جہان لایعنی اور مہمل ہو جاتی ہے''۔

برنارڈ شا (G.B.Shaw) کہتا ہے

''دنیا کے اونچ نیچ اور فطرت انسانی کو دیکھ کر میں بے تامل کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے دکھ، درد اور رنج و تکلیف کا اعلیٰ ترین علاج صرف مسیح ہے''۔

جنابِ مسیح کی پاک ذات اور مقدس اصولوں کی طفیل دنیا شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔آپ کی شخصیت نے دنیا کی رذیل ترین اقوام کو چاہ ِضلالت (گمراہی کے کنواں) سے نکال کر اَوجِ بریں (آسمانی عروج) پر کھڑا کر دیا۔آپ کی ذات نے اس دنیا کی اندھیر نگری میں اجالا کر دیا اور اس کو بقعہ (زمین کا وہ حصہ جو دوسری جگہ سے ممتاز ہو) نور بنا دیا۔آپ کی ذات دنیا کا نور ہے (یوحنا۸: ۱۲)۔ جس طرح سیارے ستارے آفتاب کی روشنی سے درخشاں ہیں اسی طرح دنیا جہان کا نظام اسی ایک نیر کے کا شرمندہ احسان ہیں اور یہ بات کسی ایک قوم یا ملک یا زمانہ سے مختص نہیں بلکہ ہر ملک قوم زمانہ اور جماعت کا یہی تجربہ رہا ہے۔ منجی عالمین روحانیت کی بلندیوں کے واحد تاجدار رہے ہیں۔اگر کسی قوم نے خدا کی حقیقی پہچان حاصل کی تو صرف آپ کی طفیل حاصل کی "خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا ۔"اکلوتا بیٹا جو باپ (پروردگار) کی گود میں ہے اسی نے اس کو ظاہر کیا" (یوحنا۱: ۱۸)۔

پس جب خداوند مسیح اس دنیا میں تشریف لائے تو آپ ایک قائد اعظم کی حیثیت سے نہ آئے اور نہ آپ محض نبی کی حیثیت میں اس دنیا پر ظاہر ہوئے بلکہ آپ کے وجود میں الوہیت کی صفات نے ظہور پکڑا۔ زمان و مکان کی قیود کے اندر بنی نوع انسان پر یہ عقدہ (بھید) کھل گیا کہ خدا کی ذات در حقیقت کیا ہے۔"الوہیت کی ساری معموری اسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے" (کلسیوں ۲: ۹)۔ مشہور فلاسفر اور علم اخلاق کا استاد ٹی۔ایچ۔ گرین (T.H.Green) کہتا ہے

> "یسوع مسیح نے محدود دائرہ کے اندر زمان و مکان کی قیود میں ایک ایسی زندگی بسر کی جس کے اصول ان قیود کے پابند نہ تھے اور خاص حالات کے اندر ایسے اصول کا اعلان کیا جو تمام حالات پر عائد ہو سکتے ہیں لہٰذا ہم اس کو ایک حقیقت قرار دے سکتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کے اصول آخری، قطعی، اور عالم گیر ہیں"۔

دنیا یہ محسوس کرتی ہے کہ گزشتہ زمانہ اور صدیوں کے تمام تواریخی اشخاص میں سے صرف ابن اللہ ہی ایک ایسی شخصیت ہے جو در حقیقت زندہ ہے۔ دیگر مذاہب کے بانی اور مصلحین پیدا ہوئے اور مٹ گئے۔ ان کے خیالات اور جذبات اور اعتقادات حرفِ غلط کی طرح محو ہو گئے یا اوراق پارینہ (پُرانا) کی طرح کسی کام کے نہ رہے۔ صرف مسیح اور اس کی تعلیم زندہ جاوید اور عالمگیر ہے۔

لیکن ان گزشتہ زمانہ کی یادگاروں میں صرف خداوند مسیح کی شخصیت ایسی ہے جن کی نسبت دنیا یہ محسوس کرتی ہے کہ آپ کا ایجاب (قبول کرنا، منظور کرنا) وانکار زندگی اور موت کا سوال ہے۔آپ کی شخصیت محض ایک تواریخی حقیقت ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق بنی نوع انسان کی ضمیر کا اور کانشنس (وہ انسانی قوت جو انسان کو بھلائی کی طرف متوجہ کرے۔) اور قسمت کے ساتھ ہے جو ہماری اخلاقی زندگی کی نسبت ہم کو چیلنج کرتی ہے۔ کیونکہ آپ کی شخصیت جامع ہے۔ مشرق و مغرب آپ کے آگے خم ہے۔ صرف جنابِ مسیح ہی اکیلے واحد مشرقی شخص ہیں جن کے نام کا پرچار مغربی ممالک کے باشندوں نے مشرق کے کونہ کونہ میں کر دیا ہے۔ مغرب اس کو سجدہ کرتا ہے۔ مشرق اس کو ہر پہلو سے قابلِ تحسین وستائش و تمجید قرار دیتا ہے۔ منجی عالمین کی شخصیت ہی ایک واحد شخصیت ہے جو ایسی کامل اور جامع ہے کہ ہر زمانہ ملک قوم اور ملت کا انسان بلا تفریق و امتیاز اس کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے۔اس شخصیت کے بغیر کائنات ایسا دھڑ ہے جس کا سر نہ ہو۔ کیونکہ صرف وہی کائنات کا مرکز اور اس کی زندگی اور اس کا نور ہے (یوحنا۱: ۳)۔ ابن اللہ زمان و مکان کی قیود میں ظاہر ہوئے لیکن ان قیود سے بالا رہے۔آپ نے زمان و مکان کی قیود میں ظاہر ہو کر دنیا اور مافیہا کو خاک سے اٹھا کر عرش بریں پر پہنچا دیا تاکہ انسانیت خدا کے "بیٹے کی ہم شکل" ہو جائے (رومیوں ۸: ۲۹)۔ ابن اللہ کائنات کی زندگی کا اصول ہیں کیونکہ "اس میں ساری چیزیں پیدا کی گئیں۔آسمان کی ہوں یا زمین کی۔ مرئی ہوں یا غیر مرئی۔ تخت ہوں یا ریاستیں یا حکومتیں یا اختیارات۔ ساری چیزیں اسی کے وسیلے سے اور اسی کے واسطے پیدا ہوئیں اور وہ سب چیزوں سے پہلے ہے اور اسی میں ساری چیزیں قیام رکھتی ہیں۔ وہی مبدا ہے۔ وہی انتہا ہے۔ سب باتوں کا وہی اول ہے اور وہی آخر ہے۔ وہ ابدالآباد زندہ ہے۔ خدا باپ کو یہ پسند آیا کہ ساری معموری اس میں

سکونت کرے اور سب چیزوں کا اس کے وسیلے سے اپنے ساتھ میل کرے خواہ وہ زمین کی ہوں خواہ آسمان کی ہوں (کلسیوں ۱:۱۵؛۱۔ کرنتھیوں ۹:۸)۔

بابِ چہارم

مسیح منجی جہان

اس رسالہ کے بابِ اول میں عالم گیر مذہب کی خصوصیات پر بحث کرتے وقت ہم نے یہ ذکر کیا تھا کہ عالم گیر مذہب کے لئے یہ لازم ہے کہ نہ صرف اس کے اصول اعلیٰ اور ارفع ہوں۔ مزید براں اس کا بانی ایک کامل نمونہ بنی نوع انسان کے سامنے پیش کر سکے بلکہ یہ ضروری امر ہے کہ عالم گیر مذہب نوع انسانی کو یہ توفیق عطا کرے کہ وہ اس کے اصول نمونہ پر گامزن ہو سکے۔ اگر کوئی مذہب صرف اعلیٰ ترین اصولوں کا مجموعہ ہی ہے اور نوع انسانی کے لئے نمونہ بھی پیش کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ توفیق دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ بنی نوع انسان کو اپنے اصولوں پر اور کامل نمونہ پر چلا سکے تو وہ مذہب عالم گیر کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ گناہ ایک عالم گیر مرض ہے جو کسی خاص قوم یا ملک زمانہ سے مخصوص نہیں بلکہ ہر زمانہ ملک قوم وملت کے افراد "سب کے سب گناہ کے ماتحت ہیں (رومیوں ۳:۱۰)۔ پس عالم گیر مذہب کا یہ کام ہے کہ وہ نہ صرف ارفع اصول اور اعلیٰ نمونہ پیش کرے بلکہ اس عالم گیر مرض کا ایک ایسا عالم گیر علاج پیش کرے جس سے کل دنیا کے فرد بشر اپنے گناہوں پر غالب آ سکیں۔

اصول اور احکام نجات نہیں دے سکتے

روئے زمین کے تمام مذاہب اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ لوگوں کو شرعی احکام بتلادیں اور ساتھ ہی نصیحت کر دیں کہ اگر ان پر تم عمل کروگے تو نجات حاصل کروگے۔ مثلاً یہودیت اور اسلام شریعت پر اور شرعی احکام پر زور دیتے ہیں اور یہ تلقین کرتے ہیں کہ بنی نوع انسان ان الٰہی احکام کو اپنا نصب العین بنا کر ان پر عمل کریں (استثنا ۲۵:۱۳؛ حزقی ایل ۱۴:۴ سورۃ توبہ آیت ۱۰۶؛ سورۃ کہف ۱۱۰ وغیرہ)۔ اگر کوئی انسان صالح اعمال کرے گا تو اس کا اجر پائے گا (حزقی ایل ۵:۱۸؛ سورۃ بقر ۲۳، ۱۷۲)۔ اگر وہ اعمال بد کا مرتکب ہوگا تو اس کو سزا ملے گی (ایوب ۱۱:۲۰؛ سورۃ طہ ۷۶؛ قمر ۱۷۲ وغیرہ)۔ لیکن یہ مذاہب اور دیگر مذاہب عالم گناہ گار شخص کو کوئی موثر طریقہ نہیں بتلاتے جس سے وہ اپنے گناہوں پر فتح حاصل کر سکے۔ یہ مذاہب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس دنیا میں اور روحانیت کی دنیا میں مغائرت (اجنبیت) ہے، لیکن کوئی ایسی راہ نہیں بتلاتے جس سے یہ مغائرت دور ہو سکے۔ وہ روحانی دنیا کے قوانین اور احکام کی تلقین کرتے ہیں لیکن کوئی وسیلہ نہیں بتلاتے جس سے انسان گناہ اور بدی کو ترک کر کے نیکی کی راہ کو اختیار کرنے کے قابل ہو جائے۔ وہ صرف یہ تاکید کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ایک کو ترک کرو اور دوسرے کو اختیار کرو۔ لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ گناہ گار انسان کو قوت عطا کریں اور انسان ضعیف البنیان (کمزور بنیاد) کو طاقت عطا کر کے اس قابل بنادیں کہ وہ اپنی اعلیٰ ترین آرزوؤں اور امنگوں پر عمل کر سکے۔ وہ نجات کے راستہ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہیں لیکن تھکے ماندے کمزور نڈھال راہ رو (رہگیر) کو یہ طاقت اور توفیق عطا نہیں کرتے کہ وہ اس شاہراہ پر چل سکے۔

باہیچ کس نشانے زاں دلستاں ندیدم

یا من خبر ندارم یا اونشاں ندارد

سطور بالا سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مجرد اصول اس قابل نہیں ہوتے کہ کسی گناہ گار انسان کی قوتِ ارادی کو از سر نو بحال کر سکیں۔ ہر فرد بشر کا یہ ذاتی تجربہ ہے کہ

ہے بے صدا وہ چینی جس میں کہ بال آیا

اصول بظاہر خوبصورت نظر آتے ہیں لیکن وہ اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتے کہ جس شخص کی قوتِ ارادی سلب ہو چکی ہے میں نئی جان ڈال دیں۔ مثلاً سگریٹ کے شیدائیوں کی مثال لیں۔ ڈاکٹر اور محکمہ حفظان صحت ان کو لاکھ سمجھاتے ہیں کہ یہ بد عادت اس کی صحت کے لئے مضر ہے۔ ان کو خود اس بات کا علم اور احساس ہوتا ہے کہ ان کی صحت کے لئے سگریٹ زہر قاتل کا اثر رکھتے ہیں وہ بار بار مصمم ارادے بھی کرتے ہیں کہ وہ سگریٹ پینا قطعی ترک کریں گے لیکن شراب کی طرح

چھٹتی نہیں کمبخت یہ منہ سے لگی ہوئی

ترک کرنے کی بجائے وہ ''چین سموکر (Chain Smoker) ہو جاتے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ کی سرکار کے حکم مطابق سگریٹ کی ڈبیا پر پینے والوں کو خطرہ سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ لیکن سب بے سود ! نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ صرف ایک ملک امریکہ میں گذشتہ سال ۵،۳۲۰۰۰۰۰۰۰۰ سگریٹ فروخت ہوئے۔ یعنی ۱۹۶۳ء کی فروختگی سے بھی آٹھ ارب زیادہ سگریٹ پیے گئے۔ یہ نامراد مرض ہر سال ہر ملک و قوم کے اربوں افراد کی صحت کو بگاڑتا چلا جا رہا ہے اور ان کی قوت ارادی سلب ہو گئی ہے۔

اگر کسی شخص کی حادثہ کی وجہ سے ٹانگ ٹوٹ گئی ہو اور وہ نیم جان ہو کر سڑک کے درمیان مجبوری اور لاچاری کی حالت میں پڑا یا کسی پر راہ چلتے فالج گرا ہو اور سڑک پر ایک موٹر بے تحاشہ اس کی جانب چلی آتی ہو تو اگر تماشائی برلب سڑک کھڑی ہو کر اس کو چلا چلا کر آنے والے خطرہ سے آگاہ کرنے پر ہی اکتفا کریں تو اس غریب کا کیا فائدہ ہو گا؟ اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے وہ چل پھر تو در کنار ہل نہیں سکتا۔ اس بیکس شخص کی آنکھیں تیز رفتار موٹر کو دیکھ رہی ہے، لیکن وہ لاچار پڑا ہے۔ اپنی جگہ سے کھسک بھی نہیں سکتا موت اس کو سامنے نظر آ رہی ہے اس کو تماشائیوں کی آگاہی کی ضرورت نہیں۔ وہ آنے والے خطرہ سے خود آگاہ ہے اس کو کسی نذیر کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو بات کی ضرورت ہے کہ تماشائیوں میں کوئی شخص اس سے ایسی محبت رکھے کہ وہ اس کی خاطر اپنی جان کر پر وانہ کرے اور موٹر کے پہنچنے سے پہلے اس کو سڑک پر سے اٹھا کر سلامتی کی جگہ پر لے جائے۔ اسی طرح ہر گناہ گار جو گناہ کی غلامی میں لاچار اور گرفتار ہے (یوحنا ۸: ۳۴۔۳۶) جانتا ہے کہ اس کا حشر کیا ہو گا۔ بقول غالب۔

مفت کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے کہ ہاں

رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اس کو آگاہی کی ضرورت نہیں کیونکہ گناہ کے مرض نے اس کے قلب و دماغ پر ایسا غلبہ حاصل کر لیا اس کو یہ علم ہوتا ہے کہ جو افعال میں کر رہا ہوں جن بد عادات میں گرفتار ہوں ان کا انجام کیا ہو گا۔ وہ زبان حال سے پکار کر کہتا ہے۔

شب تاریک وبیم موج و گرداب چنیں حائل

کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

اس گناہ کے غلام کو کسی ناصح یا نذیر کی ضرورت نہیں وہ کہتا ہے

کوئی ناصح ہے کوئی دوست ہے کو ئی غمخوار

سب نے مل کر مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے !

بلکہ اس کو اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی اس کی مدد کرے اور اس کی قوتِ ارادی کو جو سلب ہو گئی ہے از سر نو تقویت دے دیگر ادیان عالم اسی بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ گناہ گاروں کو تنبیہ کی جائے اور ان کو ان کے انجام سے واقف کروایا جائے۔ چنانچہ قرآن خود کہتا ہے کہ وہ ایک نصیحت کی کتاب ہے جس میں پند و نصائح واضح طور پر موجود ہیں (سورہ حجر آیت ۱، سورہ نمل آیت ۱، سورہ یٰس آیت ۶۹، سورہ ص آیت ۱، سورہ زمر آیت ۲۸ وغیرہ)۔ جو لوگوں کو ڈرانے کے لئے نازل ہوا ہے (سورہ انعام آیت ۱۹، سورہ شوریٰ آیت ۵ وغیرہ)۔ حضرت محمد عرب کے لوگوں کو ڈرانے کی خاطر بھیجے گئے۔ (سورہ احزاب آیت ۴۴ وغیرہ) لیکن ہمارا تجربہ ہم کو بتلا سکتا ہے کہ جزا اور سزا کے وعدے کسی انسان کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتے کہ وہ نیک عمل کرے۔ دیگر مذاہب میں یہ اہلیت ہی نہیں ہوتی کہ گناہ گار انسان کو پند و نصیحت کے علاوہ اعمالِ صالح کی تحریک و ترغیب دے سکیں۔ اس سے پیشتر کہ وہ اعلیٰ اصول پر عمل کر سکے یہ لازم ہے کہ اس کے اندر اس قسم کی تحریک پیدا ہو جائے جو ان اصول پر چلنے کی خواہش مند ہو۔ عالم گیر مذہب کے لئے ضروری امر ہے کہ وہ گنگار انسان کی مردہ قوت ارادی میں از سر نو زندگی کی روح پھونک دے اور اپنی قدرت سے اس کو قوت عطا کرے۔ گناہ گار انسان اپنی عادت سے مجبور ہوتا ہے اور عادت کا غلام ہو کر مقابلہ کر کے چور اور لاچار ہو جاتا ہے اور ایسا تھک جاتا ہے کہ اس کی کمر ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح

کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ایسے اشخاص کے سامنے جنابِ مسیح نہ صرف اعلیٰ اور ارفع اصول اور اپنا کامل اور اکمل نمونہ پیش کرتا ہے بلکہ علی الاعلان (باآواز بلند علانیہ طور پر، بے روک ٹوک) دعوت دیتا ہے۔ ''اے زحمت کشو اور ہزیمت خوردہ (شکست خوردہ، پسپا ہونا) لوگو گناہ کے بوجھ سے دبے ہوئے ہو تم سب میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دونگا'' (متی ۱۱: ۲۸؛ یوحنا ۷: ۳۷)۔ کل مذاہبِ عالم کے ہادیوں اور پیشواؤں میں صرف خداوند مسیح اکیلے واحد ہادی ہیں جو تھکے ماندے، کمزور، نڈھال گناہ گاروں کی روحوں کو ''آرام'' دیتا ہے اور نئی زندگی بخشتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیغام کا نام ہی ''انجیل'' یعنی خوشی کی خبر ہے (متی ۱: ۲۱؛ لوقا ۲: ۱۰؛ ۴: ۱۸) کیونکہ وہ تمام گناہ گاروں کے لئے جو گناہ کا مقابلہ کر کے بار بار ہزیمت اور شکست کھا کھا کر اپنی بد عادتوں سے لاچار ہو کر اپنی زندگی سے تنگ آ گئے ہیں یہ خوشی کی خبر دیتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی مغلوب کر کے از سرِ نو ایسی زندگی بسر کر سکتے ہیں جو منشائے الٰہی کے مطابق ہو۔ یہی وہ ایمان ہے جس کے غلبہ نے دنیا کو مغلوب کر دیا ہے (۱۔ یوحنا ۵: ۴)۔

گناہ کے عمل اور عامل گنہگار میں امتیاز

خداوند مسیح کے زمانہ میں اہل یہود فریسیوں کی جماعت بڑی مقتدر اور بارسوخ جماعت تھی اس جماعت کے لیڈر یہ چاہتے تھے کہ موسوی شریعت کے احکام اور زمانہ جلاوطنی کے بعد کے زمانہ کی ''بزرگوں کی روایات'' دونوں اہل یہود کی زندگی کے ہر شعبہ میں سرائت کریں تاکہ قوم کی شیرازہ بندی ہو جائے اس جماعت کو عوام میں بڑا اثر اور اقتدار حاصل تھا۔ پس مذہبی غرور اور جماعت کی قوت کا تکبران کے سروں میں سما گیا تھا اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ خدا کی برگزیدہ قوم اسرائیل کی خاص الخاص جماعت کے افراد ہیں۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق حاجت کے

وقت ''بزرگوں کی روایات'' کی پابندیوں کا اطلاق قیاس اور اجتہاد (جد وجہد) سے کام لے کر نئے حالات پر کرتے۔ تمام فریسی ''گنہگاروں اور محصول لینے والوں'' کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں اور ان سے کنارہ کش رہتے تھے۔ وہ گناہ اور گناہگار دونوں سے نفرت کرتے تھے اور عمل بد میں گناہ کرنے والے بدکار انسان میں کسی قسم کا فرق یا تمیز روا نہیں رکھتے تھے۔

اس جماعت کے برعکس کلمۃ اللہ گناہ اور گنہگار یعنی عمل اور عامل میں تمیز کر کے اپنی تعلیم میں یہ سکھلاتے تھے کہ خدا ہر گنہگار سے محبت کرتا ہے لیکن گناہ سے نفرت کرتا ہے اور خدا کی محبت ہر گنہگار کو تلاش کرتی ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ ''شریر اپنی شرارت سے توبہ کرے اور باز آئے''۔ اور وہ از سر نو خدا کا فرزند اور آسمان کی بادشاہی کا وارث بن جائے۔ کلمۃ اللہ گناہ سے نفرت لیکن گنہگار سے محبت رکھتے تھے اور بدترین گنہگاروں کو تلاش کر کے ان سے میل جول رکھ ان کو خدا کی لازوال محبت کا پیغام دیتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ ''تندرستوں کو طبیب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ بیماروں کو ضرورت ہوتی ہے۔ میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو خدا کی طرف بلانے کے لئے دنیا میں آیا ہوں'' (مرقس ۲:۱۷)۔ طبیب کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو امراض سے آگاہ کرے لیکن وہ مریضوں سے نفرت نہیں کرتا بلکہ ان سے نہایت شفقت، محبت سے پیش آکر اپنی تمام توجہ اس کی مرض پر مرکوز کر دیتا ہے جو انسان جتنا زیادہ بیمار یا خطرناک بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ اپنے طبیب کی توجہ اور محبت کا مستحق ہوتا ہے (لوقا ۵:۳۱)۔ ابن اللہ بدترین گنہگاروں کے لیے سرتاپا رحمت تھے اور ان کو تلاش کر کے خدا کی محبت کی خوشخبری کا پیغام دیتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ خدائے قدوس محبت کا خدا ہے جو گناہوں سے نفرت کرتا ہے لیکن ''ایک توبہ کرنے والے گنہگار کے لئے آسمان پر زیادہ خوشی ہوتی ہے'' اور اس حقیقت کو ان کے ذہن نشین کرنے کے لئے آپ تمثیلوں سے کام لیتے تھے تاکہ گنہگار کو خدا کو خدا کی محبت کا یقین آجائے اور وہ خلوص دل سے توبہ کرے (لوقا ۱۵ باب)۔

اس سلسلہ میں مرحوم حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ مرحوم لکھتے ہیں

> ''حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سراسر اس حقیقت کی دعوت تھی کہ گناہوں سے نفرت کرو مگر ان انسانوں سے جو گناہوں میں مبتلا ہیں نفرت نہ کرو۔ اگر ایک انسان گنہگار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی روح اور دل کی تندرستی باقی نہیں رہی۔ لیکن اگر اس نے بدبختانہ اپنی تندرستی ضائع کر دی ہے تو تم اس سے نفرت کیوں کرو؟ وہ تو اپنی تندرستی کھو کر تمہارے رحم و شفقت کا اور زیادہ مستحق ہو گیا ہے۔ وہ موقعہ یاد کرو جس کی تفصیل ہمیں مقدس لوقا کی زبانی معلوم ہوئی ہے جب ایک گنہگار عورت حضرت مسیح کی خدمت میں آئی اور اس نے اپنے بالوں کی لٹوں سے اس کے پاؤں پونچھے تو اس موقعہ پر ریاکار فریسیوں کو سخت تعجب ہوا۔ لیکن مسیح علیہ السلام نے کہا کہ طبیب بیماروں کے لیے ہوتا ہے نہ کہ تندرستوں کے لیے۔ پھر خدا اور اس کے گنہگار بندوں کا رشتہ رحمت واضح کرنے کے لیے ایک نہایت ہی موثر اور دل نشین مثال بیان کی اور فرمایا کہ فرض کرو ایک ساہوکار کے دو قرض دار تھے ایک پچاس کا اور ایک ہزار روپیہ کا۔ ساہوکار نے دونوں کا قرض معاف کر دیا۔ بتاؤ کس قرض دار پر اس کا زیادہ احسان ہوا اور کون اس سے زیادہ محبت کرے گا؟ وہ جسے پچاس معاف کر دیے یا جسے ہزار
>
> نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برد
> کہ مستحق کرامت گناہ گار انند

(ترجمان القرآن ص ۱۰۶۔۱۰۸)

(۲)

مسیحی کلیسیا کے جن مبشروں نے اپنے منجی اور مولا کے نقش قدم پر چل کر بدکار شرابیوں زانی مردوں اور فاحشہ عورتوں کو گناہوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا پیغام دینے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے تاکہ ہر قسم کا گنہگار خدا کی فرزندیت کی عزت پاکر الٰہی زندگی کے راستہ پر چلیں۔ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو مبارک سمجھ کر خدا کا شکر کرتے ہیں جس نے ان کو یہ عزت بخشی کہ وہ اپنے آقا کے نقش قدم پر چل کر ان بدنصیب گرے ہوئے لوگوں کی روحوں کو بچانے کا وسیلہ ہونے کے لائق سمجھے گئے۔ وہ اپنے آقا کا نمونہ لے کر ان کے درمیان محسن، مربی اور واعظ بن کر نہیں رہتے بلکہ ''گنہگاروں کے یار'' اور ان کی روحوں کے حقیقی خیر خواہ بن کر ''خادم کی طرح'' ان کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ گناہ کی گہرائیوں میں اترتے ہیں تاکہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو غلاظت سے نکالنے اور روحانیت کا معراج حاصل کرنے کا وسیلہ بنیں۔

بدکار مرد اور عورتیں زندگی کی شاہراہ پر ٹھوکریں کھا کھا کر گر جاتی ہیں اور اپنی شرم کو چھپانے کی خاطر دیدہ دلیری سے کام لیتی ہیں لیکن وہ اپنے منجی خدا کی نظروں سے اپنی چوٹوں کو نہیں چھپا سکتیں۔ جب خدا کی محبت ان کے دلوں کے دروازوں کو کھٹکھٹاتی ہے تو وہ یہ خیال کرتی ہیں کہ اب وہ سماج اور دنیا میں باعزت وقار کی زندگی بسر نہیں کر سکتیں اور بدی کے دلدل میں زیادہ پھنس کر اس شخص کی مانند ہو جاتی ہیں جس کے اندر درجنوں بدروحیں تھیں اور خدا کو کہتی ہیں ''مجھے عذاب میں نہ ڈال'' (مرقس ۵:۷؛ لوقا ۸:۲۸؛ متی ۸:۲۹) عبادت نما پارساؤں کی مفروضہ دکھاوے کی پاکبازی ان کو ''گنہگار'' ٹھہراتی ہے۔ لیکن خدا کے ترس و محبت کلمۂ مغفرت ان کو سنا کر کہتی ہے ''جس نے زیادہ محبت کی۔ اس کے بہت گناہ معاف ہوئے۔ سلامت چلی جا'' جب یہ بدکار مرد اور عورتیں دیکھتی ہیں کہ انجیل کے مبشر ان کو بچانے کی خاطر گہرائیوں میں اترنے سے دریغ نہیں کرتے لیکن خود نیک اور پاک دامن رہتے ہیں تو ان کے دل بیقرار ہو جاتے ہیں کہ اگر یہ ہماری زندگی کی اصلاح کی خاطر ان کٹھن منزلوں میں سے خدا کی محبت سے معمور ہو کر گزرتے ہیں تو ایسے خدا کی محبت کی قدرت کیسی عجیب ہو گی وہ منجی کی محبت سے مجبور ہو کر اور تائب ہو کر اس کے قدموں میں آجاتے ہیں لیکن وہ آسمانی باپ کی محبت بھری دعوت قبول کر کے ہمیشہ کی زندگی حاصل کرتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ خدا کی نظر میں معزز زندگی بسر کرنے والا گنہگار اور فاحشہ عورت دونوں برابر ہیں۔ یہ عبادت نما پارسا اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب اور دھوکا دیتے ہیں پس خداوند مسیح نے اپنے ہم عصر پارسا فریسیوں کو فرمایا ''میں تم سے ایک حق بات کہتا ہوں کہ محصول لینے والے گنہگار اور کسبیاں تم سے پہلے خدا کی بادشاہی میں داخل ہوتی ہیں'' (متی ۲۱:۳۱)۔

شخصے بزن فاحشہ گفتا مستی
ہر لحظہ بدام دیگرے پابستی
گفتا۔ ہر آنچہ گوئی ہستم
اماتو چنا نچہ نمائی ہستی

(عمر خیام)

یہ عبادت نما پارسا فریسی جو ابن اللہ کے خون کے پیاسے تھے۔ آپ کو از روئے طعنہ ''اچھوت محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار'' کہتے تھے (متی ۱۱:۱۹) اور بیچارے نہیں جانتے تھے کہ بالفاظ یہودی عالم ڈاکٹر مونٹی فیوری

''یہ خطاب درحقیقت یسوع کا تاج ہے''۔

منجی جہاں کی صلیب کے نیچے کی زمین ہموار ہے جہاں دنیا کے بڑے اور چھوٹے گنہگار ایک ہی سطح پر کھڑے ہوتے ہیں۔اس جگہ کوئی گنا ہ ''معمولی'' گناہ نہیں ہے، بلکہ ہر گناہ گھنونا ہے۔جو خدا کو انسان سے جدا کر دیتا ہے اور خدا کی محبت کو ٹھکراتا ہے۔وہاں غرور، تکبر، حسد وغیرہ ویسے ہی گھنونے گناہ ہیں جیسے جنسی گناہ اور سب گنہگار صلیب مسیح پر سے مغفرت کا کلمہ سن کر داخل فردوس ہوتے ہیں (لوقا ۲۳: ۴۳)۔ہر گنہگار ایماندار فرزند ہو جاتا ہے۔وہاں ناامیدوں کو سچی امید اور ناقابل معافی گنہگاروں کو خدا کی محبت کا ازلی اور ابدی پیغام ملتا ہے جن کو دنیا اور دیگر مذاہب کسی طرح بھی محبت کرنے کے قابل نہیں سمجھتے۔

خدا کی محبت اور گناہوں کی مغفرت

منجی عالمین کی تعلیم کے مطابق گناہ اس رفاقت کے قطع (ڈھنگ، کاٹ) ہونے کا نام ہے جو انسان خدا کے ساتھ رکھتا ہے۔خدا انسان سے اپنی محبت کی وجہ سے رفاقت رکھتا ہے (یرمیاہ ۳۱: ۳؛ ملاکی ۱: ۲؛ یوحنا ۳: ۱۶ وغیرہ)۔وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے دلوں میں سکونت کرتا ہے (یوحنا ۱۴: ۲۳؛ ۱۔یوحنا ۲: ۲۴؛ ۲۔کرنتھیوں ۶: ۱۹ وغیرہ) لیکن انسان فاعل خود مختار ہونے کی وجہ سے گناہ کر کے اس رفاقت کے تعلق کو آپ توڑ دیتا ہے ۔چنانچہ کتابِ مقدس میں پروردگار فرماتے ہیں کہ ''دیکھو خدا کا ہاتھ چھوٹا نہیں کہ وہ بچا نہ سکے اور اس کا کان بھاری نہیں کہ وہ سن نہ سکے۔بلکہ تمہاری بدکاریاں تمہارے اور تمہارے خدا کے درمیان جدائی پیدا کرتی ہیں اور تمہارے گناہوں نے اس کو تم سے روپوش کیا ہے (یسعیاہ ۵۹: ۱)۔ پس گناہ کا وجود انسان کی محبت کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہے۔چنانچہ انجیل میں ارشاد ہوا ہے ''اگر کوئی کہے کہ میں خدا سے محبت رکھتا ہوں اور اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو وہ جھوٹا ہے جو کوئی خدا میں قائم رہتا ہے وہ گناہ نہیں کرتا۔۔۔جب ہم خدا سے محبت رکھتے ہیں تو اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں'' (۱۔یوحنا ۴: ۲۰)۔پس گناہ کا وجود یہ ظاہر کرتا ہے کہ گناہ گار خدا کی ابدی محبت کو ٹھکرا دیتا ہے اور خود رائی کر کے اسکی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے۔

کتاب مقدس نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ اگرچہ گناہ گار انسان خدا کی محبت سے اپنی بغاوت کی وجہ سے منہ موڑ لیتا ہے تاہم خدا کی محبت اٹل ہے (یسعیاہ ۵۴: ۱۰؛ ۵۱: ۶)۔خدا کی محبت یہ نہیں چاہتی کہ اس کا گناہ گار فرزند ہلاک ہو (متی ۱۸: ۱۴؛ یوحنا ۶: ۳۹؛ ۱۰: ۲۸؛ رومیوں ۲: ۱۲؛ ۱۔کرنتھیوں ۱: ۱۸؛ ۲۔پطرس ۳: ۹ وغیرہ)۔بلکہ اس بات کی متمنی اور خواہاں ہے کہ بدترین گناہ گار ہمیشہ کی زندگی پائے (یوحنا ۳: ۱۶)۔خدا کی محبت ہمیشہ اس انتظار میں رہتی ہے کہ گناہ گار اس کی طرف رجوع کرے (لوقا ۱۵ باب) اور اگر وہ رجوع نہیں کرتا تو وہ گناہ گار کی تلاش میں نکلتی ہے (لوقا ۱۹: ۱۰؛ ۱۵: ۴، ۸؛ متی ۱۰: ۶؛ ۱۸: ۱۲ وغیرہ)۔جس طرح ایک باپ اپنے گم گشتہ فرزند کو تلاش کرتا ہے۔خدا کی محبت گناہ گار کو تلاش کرتی ہے (حزقی ایل ۳۴: ۱۰؛ لوقا ۱۵: ۲۰؛ متی ۹: ۳؛ یوحنا ۱۰: ۲۸؛ ۱۔پطرس ۲: ۲۵ وغیرہ)۔

اے واقف اسرار ضمیر ہمہ کس در حالت عجز دستگیر ہمہ

یارب تو مرا توبہ وہ عذر پذیر اے توبہ وہ دعذر پزیر ہمہ

(خیام)

جس طرح ماں کی مامتا اپنے ناخلف (بدکار لڑکا) بیٹے کے لئے بے چین رہتی ہے اور اس کا دل اپنے بچے کے لئے تڑپتا رہتا ہے جب تک وہ بچہ اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اس کی طرف رجوع نہیں کرتا۔اسی طرح خدا کی محبت بے قرار اور بے چین رہتی ہے (یسعیاہ ۴۹: ۱۵) جب تک اس کا گمنگار بیٹا اس کی لازوال محبت کو دیکھ کر توبہ کر کے (زبور ۸۹: ۲۶) یہ نہیں کہتا ''اے باپ میں تیری نظر میں گناہ گار ہوا اب اس لائق نہیں رہا کہ پھر

تیرا بیٹا کہلاؤں (لوقا ۱۵: ۲۲)۔ جب گناہ گار تائب ہو کر رجوع کرتا ہے تو منجی عالمین فرماتے ہیں کہ ''ایک توبہ کرنے والے گناہ گار کی بابت آسمان کے فرشتوں کے سامنے خوشی ہوتی ہے (لوقا ۱۵: ۱۰)۔

(۲)

پس خدا کی محبت گناہوں کی مغفرت کا باعث ہے ''خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے (یوحنا ۳: ۱۶)۔ چونکہ خدا محبت ہے اس کی محبت اس پر قادر ہے کہ دنیا کے بدترین شیطان خصلت انسان کو بھی فرشتہ خصلت اور خدا کی صورت پر بنادے۔ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں ابن اللہ اکیلا شخص ہے جس نے گناہ گار دنیا پر خدا کی لازوال اور ابدی محبت کی حقیقت کو منکشف کیا۔ انجیل جلیل کا سطحی مطالعہ بھی اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے کہ آنخداوند نے نہ صرف اپنی تعلیم اور اصول کی تلقین سے خدا کی اٹل محبت کو ظاہر کیا (یوحنا ۱: ۱۸)۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ موثر طریقہ پر آپ نے اپنی زندگی سے خدا کی محبت کو ظاہر کیا۔ آپ محبت مجسم تھے۔ الٰہی محبت آپ کے ایک ایک کام ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادا سے ٹپکتی تھی۔ بالخصوص گناہ گاروں کو تلاش کرنے کی تڑپ آپ کے دل میں ہر وقت موجود تھی۔ آپ نے فرمایا ''ابن آدم اس مقصد کے لئے دنیا میں آیا ہے کہ کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈے اور نجات دے'' (لوقا ۱۹: ۱۰؛ متی ۹: ۱۳؛ ۱۰: ۶؛ ۱۵: ۲۴؛ ۱۸: ۱۲؛ مرقس ۲: ۱۷؛ یوحنا ۵: ۱۴ وغیرہ) ''خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اس کے وسیلے سے نجات پائے'' (یوحنا ۳: ۱۷)۔ چونکہ صرف منجی عالمین ہی الٰہی محبت کا کامل اور اکمل مظہر ہیں۔ لہٰذا الٰہی محبت آپ کے وسیلے سے گناہ گاروں کو از سر نو صراط مستقیم پر لا کر ان کو نجات بخشتی ہے (یوحنا ۱۴: ۶؛ عبرانیوں ۹: ۸؛ ۱۰: ۲۰ وغیرہ)۔ بالفاظِ دیگر آپ کے سوا ''کسی دوسرے کے وسیلے نجات نہیں کیونکہ آسمان کے تلے بنی آدم کو کوئی دوسرا نام نہیں بخشا گیا جس کے وسیلے سے نجات پا سکیں'' (اعمال ۴: ۱۲)۔

اس الٰہی محبت کا عظیم الشان مظاہرہ منجی جہان کی صلیب پر ہوا۔ جس طرح کسی کھوئے ہوئے بیٹے کی ماں کی محبت کا مظاہرہ ماں کے دکھ رنج و غم میں ہوتا ہے۔ جس طرح یہ دکھ الم اور رنج کھوئے ہوئے بیٹے کے گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح منجی کونین کی صلیب دنیا کے گناہ گاروں کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ جس طرح گناہ گار بیٹا اپنی ماں کا غم اور الم دیکھ کر اپنے گناہوں سے تائب ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہ گار انسان منجی عالمین کی صلیب پر دھیان کر کے اپنے گناہوں سے تائب ہوتا ہے۔ کامل محبت ہر طرح کا دکھ اٹھانے کو تیار ہوتی ہے۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہے۔

کسے بہ زمرہ ارباب دل ندارد رہ کہ تحفہ ز نسیم بلا نمی آرد

محبت کرنا اور محبوب کی خاطر دکھ اٹھانا دونوں باتیں درحقیقت ایک ہی شئے کے دو رخ اور تصویریں ہیں۔ پس الٰہی محبت جو کامل ہے محبوب گناہ گار انسان کے لئے ہر طرح کا دکھ اٹھانے کو تیار ہے۔ لہٰذا منجی عالمین گناہ گار انسان کی خاطر اپنی جان دریغ نہ کی (یوحنا ۱۵: ۱۳) اور ''موت بلکہ صلیبی موت بھی گوارا کی'' (فلپیوں ۲: ۹) ''جب ہم کمزور ہی تھے تو عین وقت پر مسیح بے دینوں کی خاطر موا کسی راستباز کی خاطر بھی کوئی مشکل سے اپنی جان دے گا۔ مگر شاید کسی نیک آدمی کے لئے اپنی جان تک دینے کی جرات کرے۔ لیکن خدا نے اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کی کہ جب ہم گناہ گار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا۔ جب باوجود دشمن ہونے کے خدا سے اس کے بیٹے کی موت کے وسیلے سے ہمارا میل ہو گیا تو میل ہونے کے بعد تو ہم اس کی زندگی کے سبب ضرور ہی بچیں گے۔ جہاں گناہ زیادہ ہوا وہاں الٰہی فضل اس سے بھی نہایت زیادہ ہوا تاکہ جس طرح گناہ نے ہمارے اوپر بادشاہی کی اسی طرح فضل بھی ہمارے خداوند مسیح کے وسیلے ہمیشہ کی زندگی کے لئے راستبازی کے ذریعہ بادشاہی کرے۔ تم بھی اپنے آپ کو گناہ کے اعتبار سے مردہ مگر خدا کے اعتبار سے مسیح میں زندہ سمجھو (رومیوں ۵ باب)۔ پس الٰہی محبت نے ''مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا

میل ملاپ کر لیا۔اس نے میل ملاپ کا پیغام ہمارے سپرد کیا ہے۔ پس ہم مسیح کے ایلچی ہیں گویا ہمارے وسیلے سے خدا التماس کرتا ہے۔ ہم مسیح کی طرف سے منت کرتے ہیں کہ خدا سے میل ملاپ کر لو(۲۔کرنتھیوں ۵:۱۶)" پس محبت میں چلو جیسے مسیح نے تم سے محبت کی اور اپنے آپ کو قربان کر دیا"(افسیوں ۵:۲)" خدا نے ہم کو غضب کے لئے مقرر نہیں کیا بلکہ اس لئے کیا کہ ہم اپنے خداوند یسوع مسیح کے وسیلے سے نجات حاصل کریں"(تھسلنیکیوں ۵:۹)۔ پس" یہ بات حق اور ہر طرح سے قبول کرنے کے لائق ہے کہ مسیح گناہ گاروں کو نجات دینے کے لئے دنیا میں آیا جن میں سے سب سے بڑا گناہ گار میں ہوں ۔ مجھ پر رحم اس لئے ہوا کہ مسیح نے مجھ بڑے گناہ گار میں اپنی نجات کا کمال تحمل ظاہر کرے"(۱۔ تیمتھیس ۱:۱۵)" خدا محبت ہے۔ جو محبت خدا کو ہم سے ہے وہ اس لئے ظاہر ہوئی کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا ہے تا کہ ہم اس کے سبب سے زندہ رہیں"(۱۔یوحنا۴:۹)۔ گنہگار کی آنسو بھری توبہ اور اس کے گناہوں کی مغفرت، سب خدا کی اس محبت کا نتیجہ ہیں جس کا کامل ظہور ابن اللہ کی صلیب پر ہوا(مرقس ۱۴:۲۷؛متی ۲۶:۷۵؛لوقا ۲۲:۶۲)۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ہم صلیب پر خدا کا مظاہرہ دیکھ کر اس کی محبت پر ایمان لا کر راستباز ٹھہرتے ہیں خدا کی محبت ہمارے دلوں میں موجزن ہو کر ہماری مردہ قوت ارادی میں از سر نو جان ڈال دیتی ہے ہم کو نہ صرف نصوح(پکی توبہ) توبہ حاصل ہوتی ہے بلکہ ہمارا خدا کے ساتھ میل ملاپ ہو جاتا ہے (رومیوں ۵ باب)۔

(۳)

منجی عالمین کے ذریعہ دنیا کے ہر ملک قوم اور زمانہ کے ہر فرد بشر کو نجات ملتی ہے کیونکہ

ہر چند کہ نیست رنگ وبویم
آخر نہ گیا ہ باغ اویم !

یہ نجات ہمارے اعمال پر منحصر نہیں۔ ہم گناہ گاروں کے "گناہ کی مزدوری موت مگر خدا کی بخشش ہمارے خداوند مسیح میں ہمیشہ کی زندگی"(رومیوں ۶:۲۳) جس طرح ماں کا گم گشتہ بیٹا اپنے اعمال کے باعث ماں کی معافی حاصل نہیں کر سکتا بلکہ ماں کی محبت اس معافی کی محرک ہوتی ہے۔اسی طرح خدا کی محبت ہمارے گناہوں کی معافی کی محرک ہے۔"محبت اس میں نہیں کہ ہم نے خدا سے محبت کی بلکہ اس میں ہے کہ اس نے ہم سے محبت کی اور ہمارے گناہوں کے کفارے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا"(۱۔یوحنا۴:۱۰)"تم کو ایمان کے وسیلے فضل ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں بلکہ خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب"(افسیوں ۲:۸)۔ جس طرح قرآن کی سورتوں کے شروع میں خدا کے رحم پر نمایاں زور دیا گیا ہے اسی طرح انجیل کے ہر ورق میں خدا کے فضل پر زور دیا گیا ہے جو اس کی محبت کا فعل ہے "اس کے فضل کے سبب اس مخلصی کے وسیلے سے جو یسوع مسیح میں ہے مفت راستباز ٹھہرائے جاتے ہیں(رومیوں ۳:۱۶)۔

ماراتو بہشت اگر بطاعت بخشی
ایں مزد بودو لطف وعطائے تو کجاست

(۴)

ہم نے دنیاوی ماں کی محبت کی مثال سے منجی کونین کی عالم گیر نجات کو واضح کیا ہے۔ کیونکہ ہم کو انسانی تعلقات میں الٰہی محبت کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور ہم اس طور پر خدا کی محبت کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ہم ان تعلقات کے ذریعہ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ خدا کس طرح گناہ گار انسان کی انتظار اور تلاش میں رہتا ہے اور اس کے ساتھ از سر نو میل ملاپ کرنے کے لئے ہر طرح کا رنج اور دکھ درد اور تڑپ محسوس کرتا ہے (لوقا ۱۵ باب)۔ اس بے بہا اور لازوال محبت کے کمال کو دیکھ کر گناہ گار کے دل میں توبہ کا خیال پیدا ہوتا ہے (رومیوں ۲:۴) اور وہ مصمم ارادہ کر لیتا ہے کہ خدا سے فضل اور توفیق حاصل کر کے وہ آئندہ ''نئی زندگی کی راہ'' پر چلے گا (رومیوں ۶:۴)۔ نجات کے کام میں پیش قدمی خدا کی محبت کرتی ہے۔

بوے گل خود بہ چمن راہ نماشد زنخست

ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزار ے ہست

چونکہ خداوند مسیح خدا کی محبت کا کامل اور اکمل مظہر ہے۔ لہٰذا آپ کی زندگی اور موت خدا کی محبت کے اعلیٰ ترین مظہر ہیں۔ اگر کوئی شخص ہم سے اس قدر محبت رکھے کہ وہ اپنی جان ہماری خاطر دے دے تو اس کی زندگی اور موت کی شکر گزاری کا جذبہ (یوحنا ۱۵:۳؛ ۱۔ کرنتھیوں ۲۶:۱۱)۔ ہمارے دلوں میں ایک ایسی قوت پیدا کر دیتا ہے اور ہماری قوتِ ارادی کو ایسی تقویت عطا کر دیتا ہے جس کا مقابلہ دنیا اور شیطان کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی (رومیوں ۸:۳۵۔۳۷؛ ۶:۵) یہ جذبہ از سر نو خدا کے ساتھ ہماری رفاقت قائم کر دیتا ہے اور یوں گناہ کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ گناہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں اس رفاقت کے ٹوٹنے کا نام ہے جو شیطانی خیالات و جذبات اور افعال کرنے کا نتیجہ تھا۔ لیکن ''خدا کا بیٹا اسی لئے ظاہر ہوا تھا کہ ابلیس کے کاموں کو مٹا دے'' (یوحنا ۳:۸)۔ اس نئی قوت کی طاقت اتنی ہی زیادہ زبردست ہوگی جتنا زیادہ محبت کا مظاہرہ ہوگا (لوقا ۷:۲۶۔۵۰)۔ پس جب منجی کونین کی زندگی اور موت الٰہی محبت کا کامل اور اکمل مظاہرہ ہے تو اس نئی قوت کی طاقت بھی جو ہماری قوت ارادی میں پھونکی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ کامل اور مکمل ہوگی۔ چونکہ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ روئے زمین پر منجی کونین کے سوا کسی اور شخص نے اپنی زندگی اور موت سے الٰہی محبت کو اس کامل پایہ تک ظاہر نہیں کیا (یوحنا ۱:۱۸؛ متی ۱۱:۲۷؛ یوحنا ۱۷:۲۶؛ ۱۴:۹؛ ۱۲:۴۵؛ کلسیوں ۱:۱۵؛ عبرانیوں ۱:۳ وغیرہ)۔ لہٰذا یسوع مسیح کے نام کے سوا کوئی ''دوسرا نام نہیں دیا گیا جس کے وسیلے سے نجات ہو سکے'' (اعمال ۴:۱۲) جو نئی قوت کلمۃ اللہ کے وسیلے ہر زمانہ ملک اور قوم غرض یہ کہ دنیا جہان کے افراد کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے وہ اس قدر طاقت اور قدرت رکھتی ہے کہ انکے تمام گناہوں سے ان کی مخلصی اور نجات دلا کر ان کی خدا کے ساتھ از سر نو دائمی رفاقت قائم کر دیتی ہے (متی ۱:۲۱؛ یوحنا ۱۲:۴۷؛ ۱۔ تیمتھیس ۱:۱۵؛ طیطس ۳:۵؛ عبرانیوں ۷:۲۵؛ یوحنا ۷:۳۷ وغیرہ) اور انسان کی قوتِ ارادی تقویت حاصل کر کے اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ از سر نو شیطان اور گناہ کا مقابلہ کر سکے اور خداوند مسیح سے توفیق حاصل کر کے اس پر غالب آسکے اور اگر وہ پھر بھی جاتا ہے تو وہ مغلوب نہیں ہوتا۔ کیونکہ خداوند اس کو اپنے ہاتھ سے پھر سنبھالتا ہے (زبور ۳۷:۲۴؛ یوحنا ۱:۱۶۔۱۷؛ متی ۱۱:۲۸؛ یوحنا ۷:۳۷؛ ۴:۱۴؛ رومیوں ۳:۲۴؛ ۵:۲۰؛ ۱۵:۱۰؛ ۲۔ کرنتھیوں ۹:۸؛ گلتیوں ۲:۲۱؛ افسیوں ۱:۷؛ ۲:۷۔۸؛ ۴:۷؛ ۱۔ تیمتھیس ۱:۱۴؛ ۲۔ تیمتھیس ۱:۹؛ ۲:۱؛ طیطس ۲:۱۱؛ ۳:۷؛ عبرانیوں ۴:۱۶ وغیرہ)۔ ''پس اگر کوئی مسیح میں ہے تو وہ نیا مخلوق ہے۔ پرانی باتیں اور عادتیں جاتی رہیں دیکھو وہ نئی ہو گئیں'' (۲۔ کرنتھیوں ۵:۱۷)۔ چنانچہ خداوند فرماتا ہے ''دیکھو میں نئے آسمان اور نئی زمین کو پیدا کرتا ہوں۔ گذشتہ زمانہ کی باتیں بھولی بسری ہو گئیں۔ وہ خیال میں بھی نہ آئیں گی۔ بنی نوانسان میری اس نئی خلقت سے ابدی خوشی اور شادمانی کریں گے'' (یسعیاہ ۶۵:۱۷۔۱۸)۔

پس اس دنیا میں مسیحیت ہی اکیلا مذہب ہے جو صرف ارفع اصول کو بیان کرنے اور اعلیٰ نمونہ دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ان اصولوں پر عمل کرنے کی اور اس نمونہ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بھی بخشتا ہے۔ خداوند مسیح دنیا میں واحد شخص ہیں جن کی زندگی اور موت کے ذریعہ گناہ گار انسان اعلیٰ ترین اخلاقی معیار پر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مقدس یوحنا فرماتا ہے کہ ''شریعت تو موسیٰ کی معرفت دی گئی مگر توفیق اور فضل اور حقیقت مسیح کی معرفت ملی''(یوحنا ۱:۱۷) اسی لئے خداوند مسیح کی شخصیت کے ساتھ انجیل جلیل میں لفظ ''قدرت'' بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ مورخ لیکی (Lecky) اس پر صاد (اقرار) کر کے کہتا ہے کہ

> ''مسیحیت نے دنیا کو ایک اعلیٰ ترین معیار ایک شخص کی زندگی میں دکھادیا۔ مسیحیت میں نہ صرف نیکی کا اعلیٰ ترین نمونہ پایا جاتا ہے بلکہ اس میں تمام دیگر انسانوں کے لئے تحریک اور ترغیب بھی موجود ہے کہ وہ اس نمونہ کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ کیونکہ مسیحیت زندگی کا راستہ ہے''

(History of European Morals, vol 2)

فرانس کا عقل پرست رینان (Renan) کہتا ہے

> ''مسیحیت نے شرعی قوانین و قواعد وضع نہ کئے بلکہ عالم گیر اصول دنیا کے سامنے پیش کئے۔ اور ساتھ ہی اس نے دنیا میں نئی روح پھونک دی ہے۔ جس نے دنیا کی بدکاریوں اور سیہ کاریوں کی بیخ کنی کر کے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے''۔

زمین از کوکبِ تقدیر ما گردوں شود روزے
فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

مسیحی تجربہ کی حقیقت

چونکہ منجی عالمین کی زندگی اور موت کے وسیلے بنی نوع انسان کی سلب شدہ قوت ارادی از سر نو تقویت پاکر زندہ ہو جاتی ہے لہٰذا صلیب مسیحیت کا مرکز ہے۔ ابن اللہ کی صلیبی موت محض ایک تواریخی واقعہ ہی نہیں بلکہ خدا کی ازلی محبت کی حقیقت کی ایک نہایت اہم جھلک ہے۔ صلیب ایک مایوس دنیا کے لئے نجات کا فرحت افزا پیغام ہے کیونکہ وہ خدا کی ازلی اور ابدی محبت کا اعلیٰ ترین مکاشفہ ہے۔ جس طرح تائب بیٹا اپنے باپ کے دکھ اور الم کی روشنی میں اپنی سیاہ کاریوں کو دیکھ کر پچھتاتا ہے اسی طرح تائب گناہ گار مسیح کی صلیب کی روشنی میں اپنے گناہوں کی گھنونی حالت دیکھ کر پشیمان ہوتا ہے پس مسیح کی صلیب بنی آدم کی نجات کے ساتھ وابستہ ہے اور منجی عالمین کی موت اور دنیا بھر کے شہدا کی موت میں یہی عظیم فرق ہے ۔ صلیب کے بغیر گناہوں کی معافی کا عقیدہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس اخلاقی عنصر سے سراسر خالی ہو جاتا ہے جو الٰہی محبت کی وجہ سے مسیحی نجات کے تصور میں موجود ہے۔ صلیب کے ذریعہ ہر گناہ گار کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ خدا اس کو معاف کرتا ہے کیونکہ خدا اس سے محبت رکھتا ہے۔ الٰہی محبت کی وجہ سے ''جہاں گناہ زیادہ ہوا وہاں فضل اس سے بھی نہایت زیادہ ہوا تاکہ جس طرح گناہ نے بادشاہی کی اسی طرح فضل بھی ہمارے خداوند مسیح کے وسیلے ہمیشہ کی زندگی کے لئے راستبازی کے ذریعہ بادشاہی کرے''(رومیوں ۵:۲۰)۔

(۲)

لیکن کیا گناہ گار کو گناہ کرنے میں اسی طرح دلیری نہیں ہو جاتی ہے ؟ یہ سوال قابلِ غور ہے ہم انسانی مثال کے پر ذرا خیال کریں۔ کیا تائب بیٹے کو دلیری ہو جاتی ہے جب اس کا باپ اپنی محبت کی وجہ سے اس کا خطاکاریوں کو معاف کرتا ہے ؟ ہم تجربہ سے جانتے ہیں کہ تائب بیٹے کو یہ خیال نہیں آتا کہ چونکہ میرے باپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ چلو چھٹی ہوئی آؤ گناہ کر لیں۔ اگر اس قسم کا خیال اس کے دل میں آئے گا تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ اس نے اپنے باپ کے دکھ اور رنج کا احساس نہیں کیا اور اس کی محبت کی قدر نہیں کی بالفاظ دیگر وہ در حقیقت تائب ہی نہیں ہوا۔ اس کی توبہ نصوح نہیں بلکہ محض زبانی جمع خرچ ہے۔ اسی طرح جس تائب گناہ گار نے مسیح کی صلیب پر خدا کی محبت کا جلوہ دیکھا ہے اور اس کی قدر کی ہے اور اس کا احساس کیا ہے اس کا دل دوبارہ گناہ کر کے خدا کی محبت ٹھکرانے کے خیال سے ہی کانپ اٹھتا ہے۔ خدا کی محبت اس کو رضائے الٰہی کی پابند کر دیتی ہے۔

در پے بیٹھے ہیں تیرے بے زنجیر
ہائے کس طرح کی پابندی ہے

پس انجیل شریف میں اس سوال کے متعلق "کیا ہم گناہ کرتے رہیں تاکہ فضل زیادہ ہو"؟ ارشاد ہے "ہر گز نہیں۔ ہم جو گناہ کے اعتبار سے مر گئے کیوں کر اس میں آئندہ کو زندگی گزاریں۔ ہم جتنوں نے مسیح یسوع میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا تو اسکی موت میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا ،تاکہ ہم نئی زندگی کی راہ چلیں اور گناہ کا بدن بیکار ہو جائے اور ہم آئندہ گناہ کی غلامی میں نہ رہیں۔ پس تم اپنے آپ کو گناہ کے اعتبار سے مردہ مگر خدا کے اعتبار سے مسیح میں زندہ سمجھو"۔

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح ؟

"پس گناہ تمہارے فانی بدن میں بادشاہی نہ کرے اور اپنے اعضا ناراستی کے ہتھیار ہونے کے لئے گناہ کے حوالے نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو مردوں میں سے زندہ جان کر اپنے اعضا راستبازی کے ہتھیار ہونے کے لئے خدا کے حوالے کرو اس لئے کہ گناہ کا تم پر اختیار نہ ہوگا۔ کیونکہ تم پہلے گناہ کے غلام تھے لیکن ان باتوں سے اب شرمندہ ہو اور اب گناہ سے آزاد ہو کر راستبازی کے غلام ہو گئے ہو اور اس کا انجام ہمیشہ کی زندگی ہے" کیونکہ گناہ کا لازمی نتیجہ روحانی موت ہے مگر خدا کی بخشش ہمارے خداوند مسیح یسوع میں ہمیشہ کی زندگی ہے (رومیوں ٦ باب)۔

اس طرح طے کی ہم نے منزلیں
گر پڑے ۔گر کر اُٹھے ۔اُٹھ کر چلے

(۳)

صلیب کے ذریعہ ہر ایماندار از سر نو زندہ ہو کر مسیح میں پیوند ہو جاتا ہے کلمۃ اللہ نے فرمایا تھا کہ "انگور کی حقیقی درخت میں ہوں۔۔۔۔ تم مجھ میں قائم رہو اور میں تم میں۔ جس طرح ڈالی اگر انگور کی درخت میں قائم نہ رہے تو اپنے آپ سے پھل نہیں لا سکتی اسی طرح تم بھی اگر مجھ میں قائم نہ رہو تو پھل نہیں لا سکتے۔ میں انگور کی درخت ہوں۔ تم ڈالیاں ہو۔ جو مجھ میں قائم رہتا ہے اور میں اس میں وہی بہت پھل لاتا ہے کیونکہ مجھ سے جدا ہو کر تم کچھ نہیں کر سکتے" (یوحنا ۱۵ باب)۔ پس رسول اپنا تجربہ بیان کر کے کہتے ہیں "میں مسیح کے ساتھ مصلوب ہوا ہوں اور اب میں

زندہ نہ رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے اور میں جو زندگی اب جسم میں گزارتا ہوں وہ ابن اللہ پر ایمان لانے سے گذارتا ہوں جس نے مجھ سے محبت رکھی"(گلتیوں ۲:۲۰)۔ "زندہ رہنا میرے لئے مسیح ہے"(فلپیوں ۱:۲۱) "مسیح ہمارے لئے زندگی ہے"(کلسیوں ۳:۴) خدا کا جو روحانی تجربہ مسیحیوں کے دلوں میں ہے اس کا جزو لاینفک آنخداوند کی صلیب اور قیامت ہے۔ اگر ان کو الگ کر دیں تو مسیحی تجربہ صفر کے برابر رہ جاتا ہے۔ اس روحانی تجربہ کا سرچشمہ اور مرکز ابن اللہ کی شخصیت ہے۔ اس کا تجربہ اوّل مسیح ہے اور اس کا آخر بھی مسیح ہے۔ اس تجربہ سے ہم جانتے ہیں کہ ہمارا خداوند ہمارے "اندر" موجود ہے (یوحنا ۱۴:۱۳، ۲۷) اور "ہمیشہ دنیا کے آخر تک" ہمارے ساتھ ہے (متی ۲۸:۲۰) جس طرح رگ میں خون اور تن میں جان ہے اسی طرح مسیح کی روح ہم میں رواں ہے۔

دیگر مذاہب کے تجربات میں مسیحی تجربہ کی یہ خصوصیت مفقود (نامعلوم) ہے۔ تصوف میں وجد وغیرہ ہے۔ لیکن مسیحی تجربہ کے امتیازی نشان نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحی تصوف اور اسلامی تصوف اور ہندو فلسفہ میں آسمان زمین کا فرق ہے چنانچہ یہودی ربی عالم سلیمان فری ہوف (S.Frehof) کہتا ہے

> "یہ بات ہم کو طوعاً و کرہاً (جبراً، خواہ مخواہ) ماننی پڑتی ہے کہ کروڑہا مردوں اور عورتوں کے دلوں میں خدا کی حضوری کا احساس مسیح کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مسیحی علم ادب کا ہر طالب علم اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ مسیح کی قوت کار از اس کی شخصیت کے اندر مضمر (پوشیدہ) ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ زمانہ نے اس تصویر کو اب تک کیوں محو نہیں کر دیا۔ یسوع مسیح اب بھی بے شمار انسانوں کا زندہ ساتھی ہے۔ کسی مسلمان کے منہ سے ایسا گیت نہ نکلا۔ "محمد میری روح کے عاشق۔ تیرے پاس میں بھاگتا ہوں۔ میری آڑ ہو یا محمد" کسی یہودی نے ایسا گیت کبھی نہ گایا۔ اے موسیٰ مجھے ہر ساعت تیری ضرورت ہے۔ تو مجھے درکار ہے۔ دے برکت اے موسیٰ میں تیرے پاس آیا ہوں"۔ مسیح کی خصوصیت اس کی تعلیم یا اس کی کلیسیا کی تنظیم میں نہیں بلکہ اس اثر میں ہے جس سے وہ اپنے پیروؤں کے دلوں کو متاثر کر دیتا ہے"۔
>
> (Stormers of Heaven)

مسیحی روحانی تجربہ دیگر مذاہب کے روحانی تجربوں سے اس جہت سے مختلف ہے کیونکہ ہر دیگر مذہب کا بانی مر گیا اور اس کی دنیاوی زندگی کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن گو خداوند مسیح مصلوب ہوا اور مر گیا لیکن موت نے آپ کی زندگی کا خاتمہ نہ کیا۔ آپ مردوں میں سے جی اٹھے اور اپنی ظفریاب قیامت کے ذریعہ آپ نے موت اور قبر پر فتح پائی[1] اور اب آپ کی زندہ روح مومنین کے دلوں کے اندر بستی ہے۔ قرآن میں کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں کہ رسول عربی کی روح وفات کے بعد مسلمانوں کی روحوں کے ساتھ زندہ رفاقت رکھے گی۔ کیا قرآن یا کسی اور مذہب کی کتاب میں اس قسم کی بات اس کے بانی کی نسبت منسوب کی گئی ہے۔ "جس طرح اے باپ تو مجھ (مسیح) میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ (تمام دنیا کے مسیحی) بھی ہم میں ہوں۔ وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے ان کو دیا ہے تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں۔ اگر کوئی مجھ (مسیح) سے محبت رکھے تو میرا باپ اس سے محبت رکھے گا اور ہم اس کے پاس آئیں گے اور اس کے ساتھ سکونت کریں گے (یوحنا ۱۷:۲۱؛ ۱۴:۲۳)۔ یہ تجربہ مسیحی علماء فضلا اور صوفیا تک ہی محدود نہیں بلکہ ہر ایک نادان سے نادان مسیحی کا ہے۔ جو آپ پر زندہ ایمان رکھتا ہے خواہ وہ کسی

1۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب "توضیح العقائد" میں بحث کی ہے۔

قوم ملک یا نسل کا ہو۔ مسیحی تجربہ ایک عالم گیر تجربہ ہے۔ گذشتہ بیس (۲۰) صدیوں میں دنیا کا کوئی ملک قوم یا قبیلہ ایسا نہیں جس کے لاکھوں افراد اس عالم گیر تجربہ سے بہرہ ور نہ ہوئے ہوں۔ یہ تجربہ مسیح کی عالمگیر ہستی کا زندہ ثبوت ہے۔

(۴)

تاریخ عالم ہم کو بتلاتی ہے کہ بنی نوع انسان کے تمام روحانی تجربوں میں صرف ان لوگوں کا تجربہ ہی اعلیٰ ترین قسم کا ہے جو منجی عالمین کے حقیقی پیرو ہیں۔ دیگر مذاہب عالم کے پیرو روحانیت کی اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکے۔ ان مذاہب میں نیک انسان ہوئے ہیں، کیونکہ جیسا ہم بابِ دوم کی دوسری فصل میں کہہ چکے ہیں کوئی مذہب ایسا نہیں جو صداقت کے عنصر سے خالی ہو۔ لیکن جب مسیحیت کے روحانی تجربہ اور دیگر مذاہب کے مقلدین کے روحانی تجربہ کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ جس طور سے مسیحیت نے دنیا کے بد ترین خلائق کو مقدس ہستیوں میں تبدیل کر دیا ہے اس کی نظیر روئے زمین کے مذاہب میں نہیں ملتی۔ چنانچہ مشہور مورخ سیلی (J.R.Seeley) اس امر پر تاریخ نقطہ نگاہ سے نظر کر کے اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

> ”جو روحانی پاکیزگی مسیحی صدیوں میں ظہور پذیر ہوئی ہے اس کا مسیحیت سے قبل وجود بھی نہ تھا۔ مسیحیت میں یہ صلاحیت ہے کہ بنی نوع انسان کو از سر نو خلق کر دے اور اس نے ایسا کر کے دکھا بھی دیا ہے اور پاکیزگی کا ایسا اعلیٰ معیار قائم کر دیا ہے کہ دوسرے مذاہب اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے“۔

مسیح کی زندہ شخصیت ایسی لاثانی ہے کہ اس کے ذریعہ خدا کے بیٹے وجود میں آتے ہیں (رومیوں ۸: ۱۴۔۱۷) منجی عالم کا اثر ایسا ہے کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو خدا کے بیٹے بنانے کی قدرت رکھتا ہے (یوحنا ۱: ۱۲)۔ وہ ایک کامل ہستی ہے اور اس کا کمال اس بات کا متقاضی ہے کہ نوع انسان کامل ہو جائے۔ اس کے مقابل میں تمام دیگر ادیان عالم بے بس اور لاچار ہیں، لیکن مسیح فاتح ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان کا واحد حکمران ہے اور تاابد تاجدار رہے گا کیونکہ وہی الفا اور اومیگا، اول اور آخر، ابتدا اور انتہا ہے (مکاشفہ ۲۱: ۲۷)۔

بالفاظ قرآن (هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ) (سورۃ حدید آیت ۳)

برکت اللہ